”چہارسُو“

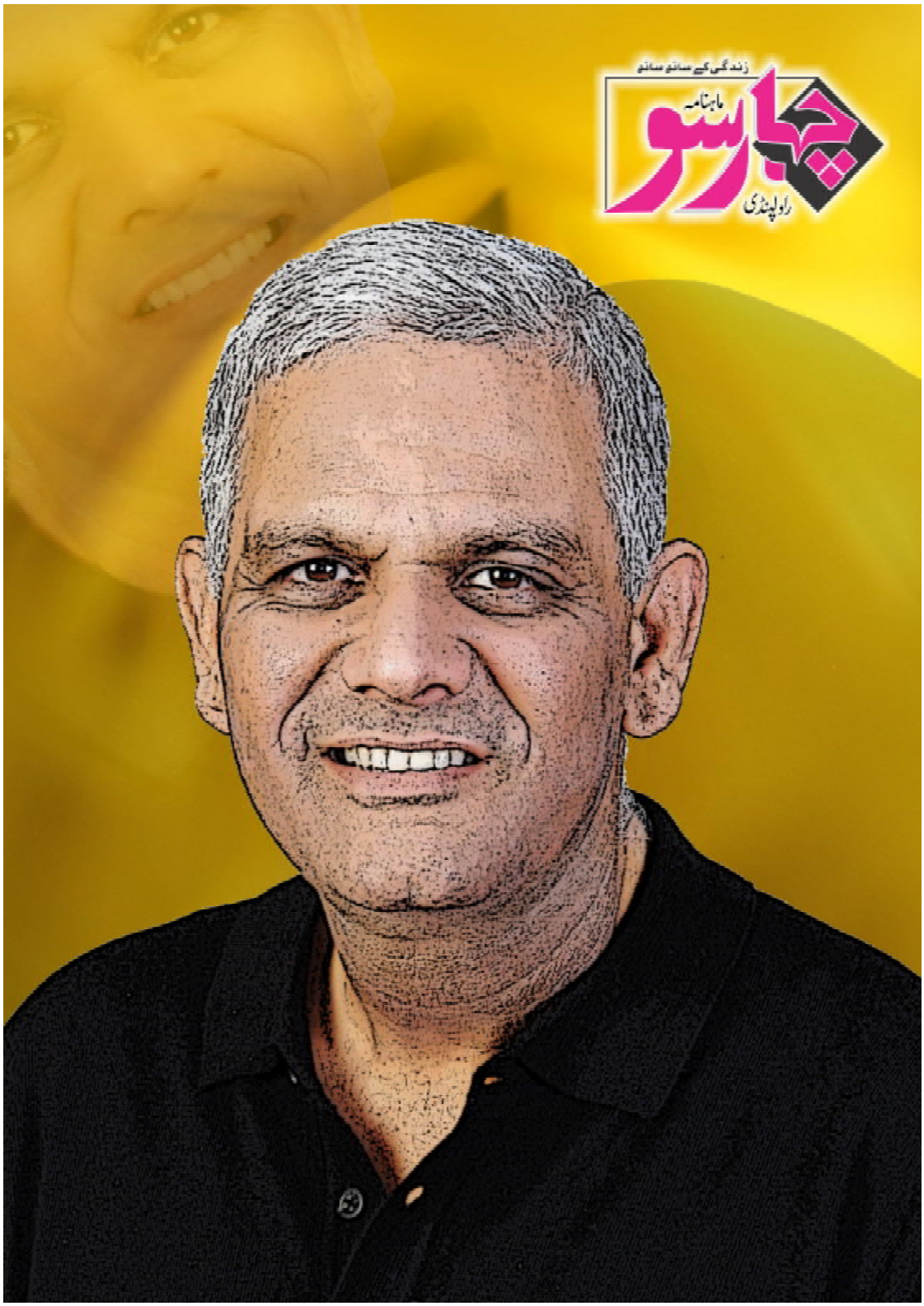

.....تکمیل.....

اختر شاہجہان پوری کی غزل پہلے ہی مرحلے میں قاری کو پابند سماعت کر دیتی ہے۔ یاد رہے کہ یہاں اشارہ پڑھنے کی طرف ہی نہیں، سننے کی طرف بھی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہیے کہ اختر کی غزل کا ناز خلوت میں بھی بکھرتا ہے اور جلوت میں بھی۔ خلوت اور جلوت میں موجود عناصر و مدارج افہام قاری سماع کی انفرادیت سے براہِ راست مربوط ہیں۔ مجوزہ انفرادیت کا تعلق حالات سے بھی ہے اور ماحول سے بھی۔ اس تعلق میں قرب کی منازل ہیں۔ اس سفر میں راستے اور پڑاؤ کی نوعیت بھی ایک دوسرے سے جدا ہے۔ یعنی وہی ذاتی پسند کی بات۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہر بات کی تان ایک ہی نقطہ پر ٹھہرتی ہے۔ (یہ تان ٹوٹتی نہیں)۔ اس نقطہ میں موجود قرار بے قراری کا آوازہ بلند کرتا ہے تو شعر الفاظ سے معانی میں اور پھر معانی سے مفاہیم میں ڈھلتا ہے۔ یوں شاعر اختر اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔۔

.....مامون ایمن

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی، بھارت۔

..... گوروں کے دیس میں .....

کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ استاد انگلستان میں موجود ہے۔ اور وہاں اس نے سماجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی منظر نامے کی خارجی اور داخلی سطح پر جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اپنے مخصوص تخلیقی طرز نگارش میں سپردِ قلم کر دیا ہے۔ تحریر میں ایک نوع کی لطافت اور بے تکلفانہ طرز بیان شمشاد احمد کا شناختی نشان ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو کسی بڑے موضوعاتی تناظر میں وہ اس طرح شامل کرتے ہیں کہ قاری، مطالعے کے ہمہ جہتی لطف سے سرشار رہتا ہے۔ برطانیہ میں رہتے ہوئے وہاں کے مقامی گوروں اور غیر مقامی کالوں سے تعلقات کی پینگیں بڑھاتے وقت ان کی قوت مشاہدہ اور حسِ مزاح مکمل بیدار رہتی ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں گورے مہمان کے مرچوں کی چٹنی کھانے کی کیفیت اور اسپتال کے انگریز کمپونڈر کے ناک میں انگلی پھیرنے کی منظر کشی جس وضاحت سے کرتے ہیں، اس پر داد کے الگ سے مستحق ہیں۔

..... سلمان صدیقی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی۔

..... شفیع ہمدم کا ادبی سفر .....

کہانی کاری کے میدان میں شفیع ہمدم کے قلم کی سانسیں جب قدرے اکھڑنے لگیں تو انہوں نے خاکہ نگاری شروع کر دی پہلے تو انہوں نے جھنگ کے اہل قلم کے چہروں کی نقاب کشائی کی اُن کے بطون کو کھنگال کر ان کے اندر کی ساری بلندی اور پستی کو کھرچ کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا۔ ان کا فن کتنے پانیوں میں ہے ان کے قلم کی روانی کتنی تند و تیز ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قاری کو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پسندیدگی نے ہمدم کو ایسا حوصلہ دیا کہ انہوں نے جھنگ کی حدود کو عبور کر کے ملک کے ان مشاہیر ادب پر خاکہ نگاری کا ہنر آزمایا جن کی شہرت بین الاقوامی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جن معروف اور اپنے فن میں یکتا اہل قلم کے خاکے تحریر کئے ہیں ان میں جناب ڈاکٹر انور سدید، جناب منشا یاد، صہبا لکھنوی اور جناب جعفر طاہر شامل ہیں۔

.....حنیف باوا

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۴،شمارہ:نومبر،دسمبر ۲۰۱۵ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

رابطہ:1-D/537'گلی نمبر18،ویسٹریج-III'راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-5462495,5490181

فیکس:(+92)-5550886

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ۔۔۔۔۔۔۔ شعیب حیدر زیدی
تزئین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

عشق مجھ کو نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید سعید نقوی ۶
فریبِ نظر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید سعید نقوی ۷
پُتلی تماشا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید سعید نقوی ۹
براہِ راست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گلزار جاوید ۱۱
عصری زندگی کی تصویر کشی ۔۔۔۔۔۔ عبداللہ جاوید ۱۹
جسم و زباں کی موت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آصف فرخی ۲۳
انفرادی عمل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سلمیٰ اعوان ۲۶
توانا فکر قلم کار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رفیع الدین راز ۲۷
محبت فاتح عالم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شہلا نقوی ۲۹
خودمختاری کی تہمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ن۔م۔دانش ۳۲
میرا فونی دوست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گوہر تاج ۳۶
زندگی شعر کے کوچے میں ۔۔۔۔۔۔ علی اکبر ناطق ۳۸
معرکۂ ذات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد انعام الحق ۴۰
گرداب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید سعید نقوی ۴۴
عیدِ قرباں سے پہلے ۔۔۔۔۔۔۔۔ سید سعید نقوی ۴۶

عظمت کی اذاں

نسیمِ سحر، غالب عرفان۔ ۵۰

افسانے

ناشکرے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حسن منظر ۵۱
فرار ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد سعید شیخ ۶۱
جلتی ہریالی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شمع خالد ۶۴
قیدی نمبر ۲۳۴ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر رینو بہل ۶۶

جسم جزیرہ

آصف ثاقب ، اعتبار ساجد، غالب عرفان، نقشبند نقوی بخاری، مہندر پرتاپ چاند، مامون ایمن، حسن عسکری کاظمی، پروفیسر صدیق شاہد، اختر شاہجہاں پوری، ڈاکٹر رؤف خیر، کرامت بخاری، زہیر کنجاہی، صبا اکرام، اجیت سنگھ حسرت۔

افسانے

رفتارِ وقت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہد جمیل ۷۷
اداس رنگوں کی بارش ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ منیرہ شمیم ۷۹
حاملہ آوازیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عثمان عالم ۸۱
تیسرا محلّہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گلزار جاوید ۸۳

خدا خیر کرے

شگفتہ نازلی، سیفی سرونجی، کرنل مقبول حسین، کرشن پرویز، تصور اقبال، نوید سروش، نعیم الدین نظر، منظور ثاقب، وشال کھلر، سلیم ناز، خورشید رضوی، شفیع ہمدم، سبھاش گپتا، سبیلہ انعام صدیقی، شریف شیوہ۔ ۸۶

پسِ اشک

ناول کا ایک باب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انل ٹھکّر ۹۱

سفرنامہ

چند سیپیاں سمندروں سے ۔۔۔۔۔۔ پروین شیر ۹۵

ترجمہ

بوسہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیروز عالم ۹۹

مٹی کا پیکر

عبداللہ جاوید، انور سدید، یوگیندر بہل تشنہ، کرشن گوتم، شگفتہ نازلی، ڈاکٹر ریاض احمد، ابراہیم عدیل، مجیب شہزر، حنیف باوا۔ ۱۰۳

نشانِ راہ

اردو ناول کا دیو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فخر زمان ۱۰۸

بساطِ بشاشت

جی آیاں نوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپا جمیلہ شبنم ۱۱۰

ایک صدی کا قصہ

لطیف شاہد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۲

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ۔۔۔۔۔۔۔۔ وقار جاوید ۱۱۵

قرطاسِ اعزاز

سید سعید نقوی

کے نام

''عشق مجھ کو نہیں''

سید سعید نقوی

میرا نام سید سعید اختر نقوی ہے۔ میری پیدائش ۱۹ جنوری ۱۹۵۹ کو کراچی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم پبلک اسکول حیدرآباد سے حاصل کی پھر میڈیکل کی ڈگری لیاقت میڈیکل کالج جامشورو سے لی۔ ڈبلن سے ایف آر سی پی کی سند حاصل کی پھر ۱۹۹۴ میں امریکہ منتقل ہوگیا۔ یہاں امریکن بورڈ کا امتحان پاس کر کے بطور ایک انٹرنسٹ پریکٹس شروع کردی، ہنوز یہی ذریعہ معاش ہے۔

باقاعدہ لکھائی کا آغاز دیر سے کیا۔ پہلا افسانہ قریب بیس برس پہلے جان کاشمیری کی ادارت میں نکلنے والے رسالے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے متواتر پاکستان سے نکلنے والے ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں آج، دنیازاد، فنون، چہارسو، ادبِ لطیف، الحمرا، روشنائی، اسالیب، تخلیق، ادبِ معلیٰ وغیرہ شامل ہیں۔

تصانیف:

افسانوں کے مجموعے:

۱۔ نامہ بر

۲۔ دوسرا رخ

۳۔ ٹک ٹک دیدم

ناول:

گرداب

شعری مجموعہ:

''دامِ خیال''

تحریر و تالیف:

''مغرب میں اردو افسانہ'' برِصغیر سے باہر بسنے والے پچاس افسانہ نگاروں کا تعارف اور ان کے نمائندہ افسانے

ادارت:

''نئی بستی'' سالانہ ادبی پرچہ

تراجم:

(۱) منگل والے لوگ، ایک ناول (Tuesdays with Morrie by Mitch Albom)

(۲) ننھا شہزادہ، ایک ناول (Le Petite Prince by Antoine de-saint Exupery)

(۳) چاکی اور دریا، نوبل انعام یافتہ لکھاری کا بچوں کے لئے ناول (Chike and the river by Chinua Achebe)

(۴) دہشت کی فضا، نوبل انعام یافتہ لکھاری The Climate of Fear by Wole Soyinke

(۵) سکوت:

متفرق افسانوں کے تراجم

(Mo Yan, Murakami, Marquez, Alice Munro, Tahir Bin Jaloun , Pamuk, Herta Muller, many other)

ایوارڈ:

خواجہ احمد عباس سوسائٹی کی جانب سے ۲۰۱۴ کی عالمی انعامی سند۔

☆

''ثقافتی ترجمان''

ڈاکٹر سید سعید نقوی صاحب غیر معمولی تخلیقی ذہن کے مالک ہیں، اُن کے یہاں محض دل کو بہلانے والی قصّہ خوانی نہیں ہے بلکہ زندگی کی جیتی جاگتی حقیقتوں کا انکشاف ہے۔ اُن کے افسانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کے ہر افسانے کی پشت پر کوئی نہ کوئی حقیقت موجود ہوتی ہے اور یہی قصہ نما حقیقت اُن کی تحریروں کو آخر آخر افسانہ بنا دیتی ہے ایسا افسانہ جو مروّجہ افسانے کی ڈگر سے الگ ہوتا ہے اور سخت سے سخت تنقیدی معیار پر بھی افسانہ بنائے رکھتا ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کی تحریروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مغرب میں مشرق کے ثقافتی ترجمان ہیں، اُن کا ذہن مطالعے کی وسعت بنیاد پر مغربی سہی لیکن قلب و روح کی سطح پر خالص مشرقی ہے ایک ایک لفظ سے سراغ لگتا ہے کہ ان کا دل و دماغ ایشیائی خالص تہذیبی اقدار کا نمائندہ ہے۔

فرمان فتح پوری

فریبِ نظر

(Ruskin Bond)
ترجمہ: سید سعید نقوی

روھانہ تک ریل کے ڈبے میں تنہا میں ہی مسافر تھا، یہیں وہ لڑکی بھی سوار ہوئی۔ غالباً اس کے والدین اسے سوار کرنے آئے تھے۔ وہ اس کے آرام کی طرف سے خاصے فکر مند تھے۔ عورت اس لڑکی کو تفصیل سے سمجھاتی رہی کہ سامان کہاں رکھا جائے۔ کھڑکی سے باہر لٹکنا ٹھیک نہیں ہے اور اجنبی مسافروں سے گفتگو سے بھی اجتناب برتے۔

ریل چلنے لگی تو انہوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ میں اس وقت تک مکمل نابینا ہو چکا تھا، صرف روشنی اور اندھیرے میں تمیز کے قابل رہ گیا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس لڑکی کی شکل وصورت کیسی تھی، لیکن اس کے قدموں کی آواز سے یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ اس نے چپل پہن رکھی تھی۔ شاید کچھ دیر میں معلوم ہو جائے کہ اس کی شکل وصورت کیسی ہے، یا ہو سکتا ہے میں کبھی نہ جان سکوں۔ لیکن مجھے تو اس کی آواز، یہاں تک کہ اس کی چپلوں سے اٹھنے والی چاپ بھی بہت دلکش محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا تم ڈیرا تک جا رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

میں یقیناً کسی تاریک گوشے میں بیٹھا تھا کہ میری بات نے اسے چونکا دیا؛

''مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے علاوہ اور بھی یہاں کوئی ہے؟''

خیر، یہ تو اکثر ہوتا ہے کہ بینائی ہونے کے باوجود لوگوں کو سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی، شاید اس لئے کہ ان کے سامنے بہت ساری قابلِ دید اشیا ہوتی ہیں۔ جب کہ وہ لوگ جو بالکل نہیں دیکھ سکتے یا بہت ہی کم دیکھ سکتے ہیں، بقیہ حسیات کی مدد سے ایک خاکہ سا بنا لیتے ہیں یا نامکمل سی اک تصویر۔

''میں نے بھی تمھیں نہیں دیکھا تھا'' میں بولا ''صرف تمھارے آنے کی آواز سنی تھی۔''

اب میں اس فکر میں تھا کہ کیا اس سے اپنا نابینا پن چھپا سکوں گا؟ اگر میں اپنی نشست سے نہ اٹھوں تو شاید یہ اتنا دشوار نہ ہو۔

''میں سہارن پور جا رہی ہوں، وہاں خالہ مجھے لینے آئیں گی'' وہ لڑکی بولی۔

''پھر تو بہتر یہی ہے کہ میں زیادہ بے تکلف نہ ہوں، یہ خالائیں خاصی سخت گیر ہوتی ہیں'' میں نے کہا

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ پوچھنے لگی

''میں ڈیرا تک جا رہا ہوں، اور پھر وہاں سے مسوری۔''

''اوہ، آپ کتنے خوش نصیب ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی مسوری جاؤں۔ وہاں کی پہاڑیاں مجھے بہت پسند ہیں، خاص طور پر اکتوبر میں۔''

''یقیناً وہ سال کا سب سے خوبصورت وقت ہے'' میں نے اپنی یاد داشت کے بھروسے پر کہا۔ ''پہاڑیاں خود رو ڈالیوں سے ڈھکی ہوتی ہیں، سورج کی تمازت بھلی لگتی ہے۔ رات میں لکڑیاں جلا کے، الاؤ کے گرد بیٹھے برانڈی پینے کا اپنا مزا ہے۔ بیشتر سیاح واپس جا چکے ہوتے ہیں، سڑکیں خاموش اور سنسان ہوتی ہیں، یقیناً اکتوبر ہی سب سے اچھا وقت ہے۔''

وہ خاموش تھی۔ میں نے سوچا یا تو میرے الفاظ اسے متاثر کر گئے ہیں یا وہ مجھے ایک احمق قسم کا رومان پسند سمجھ رہی ہے۔ پھر میں ایک غلط سوال کر بیٹھا:

''باہر کا منظر کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا

شکر ہے اسے اس جملے پر حیرت نہیں ہوئی۔ شاید وہ سمجھ گئی ہے کہ میں دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن اس کے اگلے جملے نے میرا اعتماد بحال کر دیا۔

''آپ خود کھڑکی سے باہر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟'' اس نے دریافت کیا۔

میں آرام سے اپنی نشست پر کھسکتا کھڑکی تک آ گیا اور غیر محسوس طریقے سے اس کی چٹخنی ٹٹولی۔ کھڑکی پہلے ہی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے باہر دیکھتے ہوئے یہ تاثر دیا گویا باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ میں انجن کے ہانپنے اور پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سنتا رہا۔ تصور کی آنکھ سے میں نے ٹیلیگراف کے کھمبے تیزی سے پیچھے کی سمت بھاگتے دیکھے۔

''تم نے غور کیا؟'' میں نے ذرا جرأت کی ''ایسا لگتا ہے جیسے درخت بھاگ رہے ہوں، اور ہم ساکت کھڑے ہیں۔''

''ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے'' وہ بولی ''کوئی جانور بھی دکھائی دیا؟''

''نہیں'' میں نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈیرا کے اطراف کے جنگلات میں بمشکل ہی کوئی جانور باقی بچا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر لڑکی کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''تمھارے چہرے کے نقوش بہت دلچسپ ہیں'' میری ہمت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن یہ ایک محتاط تبصرہ تھا۔ بہت کم لڑکیاں ایسی ہیں جو اپنی تعریف سے خوش نہ ہوں۔ وہ خوش دلی سے ہنس دی، اس کی ہنسی بہت شفاف، کھنک دار تھی۔

''یہ سن کر بہت لطف آیا کہ میرا چہرا دلچسپ ہے'' وہ بولی ''یہ سن سن کر کان پک گئے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں۔''

اوہ، تو تم خوبصورت ہو، میں نے دل میں سوچا۔ پھر بلند آواز سے بولا ''دلچسپ نقوش خوبصورت بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''چہارسُو''

''آپ یقیناً ایک خوش وضع نو جوان ہیں، لیکن اتنے خشک مزاج کیوں؟''

میں نے سوچا اسے خوش کرنے کے لیے ہی ایک قہقہہ لگاؤں۔لیکن قہقہہ کے خیال نے ہی مجھے تنہا اور اداس کر دیا۔

''تمھارا اسٹیشن آنے ہی والا ہے'' میں نے کہا

''شکر ہے کہ یہ سفر مختصر ہے۔میں دو تین گھنٹے سے زیادہ ریل میں نہیں بیٹھ سکتی''

جب کہ میں تو گھنٹوں بیٹھنے کے لیے تیار تھا۔صرف اس کی باتیں سننے کے لیے۔اس کی آواز میں پہاڑوں سے اترنے والے جھرنوں کی سی کھنک تھی۔جیسے ہی وہ ریل سے اترے گی، ہماری اس مختصر ملاقات کو فراموش کر دے گی۔لیکن میرے ساتھ تو اس کا سحر سارے راستے رہے گا، بلکہ اس کے بعد بھی!

انجن نے سیٹی دی، پہیوں کا سر و تال بدلنے لگا۔لڑکی کھڑی ہو کر اپنا سامان جمع کرنے لگی۔میں نے سوچا کہ اس نے جوڑا باندھ رکھا ہے یا چوٹی۔شاید اس کے بال شانوں تک پھیلے ہوں یا پھر مختصر تراش کے ہوں؟ گاڑی آہستگی سے اسٹیشن میں داخل ہوگئی۔باہر سے قلی اور خوانچہ فروشوں کی آوازیں آنے لگیں۔ان ہی میں ڈبے کے دروازے کے قریب سے ایک باریک سی زنانہ آواز ابھری، یقیناً یہ لڑکی کی خالہ کی آواز ہے۔

''خدا حافظ'' لڑکی نے کہا

وہ میرے بہت قریب کھڑی تھی۔اتنے قریب کہ اس کے بالوں سے اٹھنے والی خوشبو مجھے مسحور کرنے لگی۔میں چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو چھو لوں، مگر وہ خود تو آگے بڑھ گئی، جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اب صرف اس کی خوشبو باقی رہ گئی۔

دروازے پر کچھ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ایک صاحب جو ڈبے میں داخل ہو رہے تھے انہوں نے بڑبڑا کے معذرت کی۔پھر وہ دروازہ بہ آواز بند ہوگیا، اور دنیا باہر ہی رہ گئی۔میں اپنی نشست پر لوٹ آیا۔گارڈ نے سیٹی بجائی اور ہم پھر چل پڑے۔میرے لیے اب نئے ساتھی مسافر اور پھر سے نیا کھیل تھا۔

گاڑی نے رفتار پکڑی، پہیوں نے اپنا گیت الاپنا شروع کر دیا تو ڈبہ نے ہلنا اور کراہنا۔میں کھڑکی تلاش کر کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔باہر دن کی روشنی کو گھورتے ہوئے جو میرے لئے اندھیری تھی۔کھڑکی سے باہر بہت کچھ ہو رہا ہوگا۔کتنا دلچسپ کھیل ہے یہ بوجھنا کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ جو آدمی ڈبے میں داخل ہوا تھا اس نے میری محویت کو توڑا:

''تم یقیناً بہت مایوس ہوگے'' وہ بولا ''میں پچھلی ہمسفر جتنا خوبصورت بالکل نہیں!''

''بہت دلچسپ لڑکی تھی'' میں نے کہا ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کے بال لمبے تھے یا چھوٹے؟''

''مجھے یاد نہیں'' اس کی آواز میں الجھن تھی ''میں تو اس آنکھوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ بالوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔اتنی خوبصورت آنکھیں، لیکن اس کے کسی کام کی نہیں تھیں، وہ مکمل نابینا تھی، تم نے دیکھا نہیں تھا؟''

''خودکلامی''

بنیادی طور پر سعید نقوی کی غزل مناظر سے مربوط، متون اور مفاہیم کی غزل ہے۔وہ ''خودکلامی'' میں بھی خود کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔اپنی شخصیت کو ''لیے، دیئے'' کے طور سے ہم کنار رکھتا ہے اس لیے یہ بات ضروری ٹھہرتی ہے کہ قاری سعید کو اس کے اشعار میں ''جانچنے پرکھنے'' کی سعی مستقل مزاجی سے کرے۔سعید گاہے خودکلامی کا رُخ موڑ کر اپنے ماحول سے مخاطب ہوتا ہے۔بعض متون یہ باور کراتے ہیں کہ اس کا تخاطب ماحول کی آڑ میں خود سے ہے۔سعید کی غزل میں آپ کو جا بجا سوالات بھی نظر آئیں گے۔مثلاً:

دیکھیے کس کے دَر پہ رکتی ہے
پھر رہی ہے گلی میں رسوائی

زمانہ کی طرح، سعید کی ذات کے اندر ایک بچّہ رہتا ہے۔یہ بچّہ گاہے خود ایک منظر بن جاتا ہے اور گاہے سعید کو، ماحول کو وہ مناظر دِکھاتا ہے جن میں بچپن جھلکتا ہے، جن میں بچپن کی معصومیت ہے، سادگی ہے، بھولا پن ہے۔اِن مناظر میں، سعید کی زبان بھی اور بیان بھی اسی ''بچے'' کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ان میں شعری پابندیوں کی پذیرائی تو نظر آتی ہے لیکن ان میں متوقع معنوی ''گہرائی، گیرائی'' کا کوئی باقاعدہ، دانستہ اہتمام نہیں ہوتا، کہ بچپن کے ماہ و سال ایسے ''عوامل، تاثرات'' سے فطری طور پر ناواقف ہوتے ہیں۔

پروفیسر مامون ایمن

پتلی تماشہ

(منتخب کہانی)

سید سعید نقوی

مداری نے لکڑی کے فریم پر سے ملگجی سفید چادر اُتار کر تہ کرنا شروع کر دیا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ تھکا ہوا سورج بھی اپنی سفید اوڑھنی اُتار کر سیاہی کا لبادہ اوڑھ رہا تھا۔ زیادہ تر تماش بین جا چکے تھے۔ کچھ بچے اب بھی دل چسپی سے اسے سامان بٹورتا دیکھ رہے تھے، گویا یہ بھی تماشے کا ایک حصہ ہو۔ ساحل پر کچھ ٹوٹی ہوئی سیپیاں، خالی تھیلیوں اور جوس کے خالی ڈبوں کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ سڑک سے ساحل کو علیحدہ کرنے کے لیے تقریباً تین فٹ اونچی دیوار حدِ نظر تک چلتی گئی تھی۔ اسی منڈیر پر پچھلے بیس سال سے مداری اپنی کٹھ پتلیوں کا تماشا دکھا رہا تھا۔ ہر روز تین بجے سے سورج ڈھلنے تک اور چھٹی کے دن صبح نو بجے سے شام کے جھٹ پٹے تک۔ اس کا کھوکھا بھی ریت، پانی، سڑک اور دیوار کے ساتھ اسی منظر کا ایک حصہ بن چکا تھا۔

تماشا کرنے والے نے چادر اُتار کر تہ کی اور سائیکل کے پیچھے لگی صندوقچی میں رکھی۔ ڈوریاں ایک رِیل پر لپیٹیں۔ یہ رِیل پہلے کبھی مانجھا لپیٹنے کے کام آتی تھی۔ کوئی منچلا ساحلِ سمندر پر چھوڑ گیا تھا۔ مداری کے ہاتھ لگی تو اس کا روز روز کا ڈوری اُلجھنے کا مسئلہ حل ہوا۔ ڈوریاں لپیٹ کر اس نے کٹھ پتلیوں کو سنوارا۔ پیلی ملکہ اس کی خاص دُلاری تھی۔ اس پر کالے دھاگے سے بال بنائے گئے تھے، انھیں سنوار کے ٹھیک کیا۔

''چلو اب لیٹ جاؤ، تھک گئی ہوں گی، سارا دن ناچ ناچ کے۔''

مداری ساتھ ساتھ اپنی کٹھ پتلیوں سے باتیں کرتا رہتا۔ پیلی ملکہ کے بعد اس نے دلآرام، چاندنی، دلربا اور بوا کو بھی لٹایا، لیکن کسی کے حصے میں پیلی ملکہ جیسا پیار اور محبت نہیں آئی۔ پیلی ملکہ کے سبھاؤ اور رچاؤ کی بات بھی کچھ اور تھی۔ ستاروں سے ٹکا پیلا لہنگا، اس پر شوخ سرخ بلاؤز۔

لکڑی کے فریم کے پیچھے کھڑا مداری، کٹھ پتلیاں ایسی نچاتا کہ مانو خود سے ناچ رہی ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی کا اشارہ کٹھ پتلی کے جسم میں گویا حرارت بھر دیتا۔ انگوٹھے کی جنبش سے کٹھ پتلی کا سر مٹکنے لگتا۔ درمیانی انگلیوں سے کٹھ پتلیوں کے نچلے دھڑ ہلتے تھے۔ ساتھ ساتھ مداری کا نیم نثری نیم نظمیہ بیانیہ بھی چلتا رہتا۔

''دربار ہمارا خالی ہے، بادشاہ سب کا والی ہے۔'' ساتھ ساتھ مجمع کنٹرول بھی ہوتا رہتا۔

''شاباش بچو پیچھے ہو جاؤ۔ دو دو قدم پیچھے کی جانب، صاحبان دو قدم''

''پیلی ملکہ رانی ہے، دلآرام اس کی باندی ہے۔

بادشاہ جب بھی آتا ہے، دلآرام کو نچاتا ہے۔''

ہر ایک گھنٹے بعد مداری نیا تماشا شروع کرتا جو تقریباً چالیس منٹ جاری رہتا۔ دن ڈھلنے تک اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں۔ پوریں اس کے اشارے پر چلنے سے انکار کر دیتیں اور وہ زور لگاتا تو کبھی کوئی پتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی اور وہ اپنے بیان میں اس حادثے کو بھی شامل کر دیتا۔ جس دن سارے تماشے بغیر کسی غلطی کے ختم ہوتے، اس دن مداری پھولے نہ سماتا۔ کٹھ پتلیوں کو پیار سے سنوارتا، اُٹھانے میں احتیاط، رکھنے میں پیار، جیسے کپڑے کی نہیں کانچ کی بنی ہوں۔ آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ اس نے بہت فخر سے تماشائیوں کو کٹھ پتلیاں پیش کی تھیں۔ بنی بجی کٹھ پتلیوں کو لوگ داد دیتے تو اسے اپنی ملکیت پر غرور ہونے لگتا۔

سامان بٹور کے وہ سائیکل پر بیٹھا اور تیزی سے پیر مارتا جھگی کی طرف چل پڑا۔ ساحل سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر مچھیروں کی بستی تھی۔ اس میں منت سماجت کر کے اس نے بھی ایک کمرے کی جھگی حاصل کر لی تھی۔ سائیکل کو کونے میں کھڑا کر کے رومال میں بندھے پکوڑے آلتی پالتی مار کے باسی روٹی سے کھانے بیٹھ گیا۔ لقمہ منہ میں ڈال کر کچھ خیال آیا تو پہلی ملکہ کو صندوق سے نکال لایا اور ساتھ بٹھا لیا۔

''آج تو خوب ناچی ہے، واہ بھئی واہ۔ اسی خوشی میں اب تیرے گلے میں ایک سیپیوں کا ہار بھی ڈالوں گا۔ بہت سندر لگے گی۔'' مداری نوالوں کے درمیان اپنی کٹھ پتلی سے والہانہ گفت گو میں مشغول تھا۔

''نہ بھئی یہ دلآرام، چاندنی وغیرہ کو میں یہاں نہیں بٹھاتا۔ ان کی سفارش نہ کر۔ ان کا بھی وقت تھا۔ اب ان میں تجھ جیسی بات نہیں رہی۔'' مداری نے گویا پیلی ملکہ کا منہ بند کر دیا۔

کھانا کھا کے جھگی سے باہر نکل گیا۔ اکثر سونے سے پہلے ایک دو گھنٹے مچھیروں کے ساتھ مل کر بیڑی یا حقے کا دور چلتا۔ کبھی کوئی دیسی ٹھرّا بھی لے آتا تو سمجھو وہ رات اور لمبی ہو جاتی۔ اسی حقے اور ٹھرّے کے درمیان بستی کے معاملات طے ہوتے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا احوال پوچھا جاتا۔ پولیس اور بدمعاشوں کے بھتوں کا ذکر ہوتا۔ ان دو گروہوں کے تذکرے اکثر اتنے ملتے جلتے ہوتے تھے کہ دونوں میں تمیز مشکل ہو جاتی۔ ساحل پر سیر کے لیے آنے والوں کے لطیفے اور چٹکلے بیان ہوتے۔ غرض خوب محفل جمتی۔ آج بھی مداری اس ہو ہا میں شامل رہا۔ کوئی رات نو بجے کے بعد جھگی واپس آیا۔ پلنگ پر کھیس بچھا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی تو اُٹھ کر پیلی ملکہ کو بستر پر ساتھ لٹا لیا۔

دوسرا دن بھی ویسا ہی تھا... روزانہ جیسا۔ لیکن آج ہوا کل کے مقابلے میں زیادہ تیز چل رہی تھی۔ فریم پر کپڑا چڑھانے میں خاصی دشواری ہوئی۔ آج اس کی کہانی بھی اتنی روانی سے نہیں چل رہی تھی۔ کٹھ پتلیاں اس کے اشاروں

پر غلط سلط ناچ رہی تھیں۔ ایک دفعہ جب دلآ رام کو پیلی ملکہ کو سلام کرنا تھا تو غلطی سے دلآ رام کے ہاتھ کی جگہ پیر اُٹھ گیا۔ اس پر کچھ تماش بین ہنس پڑے۔ مداری کا منہ سرخ ہو گیا۔ وہ تو شکر ہے کہ پردے کے پیچھے کھڑے ہونے کی وجہ سے تماش بین اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ آج کا دن ہی کچھ ایسا تھا۔ ہر کھیل میں کچھ نہ کچھ غلطی ہوتی گئی۔ سہ پہر کو تو حد ہو گئی۔ ہوا کے زور سے پیلی ملکہ کا بلاؤز اُتر گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کچھ منچلوں نے سیٹیاں مارنی شروع کر دیں۔ کچھ نے خوب تالیاں بجا بجا کر آوازے کسے۔ مداری کو پردے کے سامنے آ کر اس کا بلاؤز ٹھیک کرنا پڑا۔ جیسے تیسے کر کے دن تمام ہوا۔ مداری نے چادر تہ کر کے صندوق میں رکھی۔ کٹھ پتلیوں کو غصے سے پھینک پھانک کے صندوق میں بھرا، اور سائیکل پر سوار یہ جا وہ جا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے لوگ ابھی تک اس کی ہنسی اُڑا رہے ہوں۔ سائیکل پر پیر اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ عام حالت میں کوشش بھی کرتا تو اتنی تیزی نہ آتی۔ جھگی میں گھستے گھستے سائیکل زمین پر گر پڑی۔ اسے اُٹھانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ کٹھ پتلیوں کو صندوق سے نکال کر اِدھر اُدھر پھینکا اور پیلی ملکہ کو دھنکنا شروع کر دیا۔ ''تو جان بوجھ کر میرا کھیل خراب کرتی ہے تاکہ میری ہنسی اُڑے۔ کم بخت کے گویا جسم میں جان نہیں ہے۔ جہاں ہاتھ اُٹھاتا ہوں، وہاں پاؤں اُٹھ رہے ہیں۔ کسی اور کا بلاؤز اُترتا تو وہ چلّو بھر پانی میں ڈوب مرتی۔ پر تیرے چہرے پر شرم یا ملال کا کوئی نام نہیں۔''

مداری نے پیلی ملکہ کا ہاتھ اس زور سے کھینچا کہ دھاگے ادھڑ گئے اور ہاتھ بقیہ جسم سے علیحدہ ہو گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ گویا سکتے میں آ گیا ہو۔ مگر پھر ایسی لات ماری کہ کٹھ پتلی حجرے کے دوسرے کونے میں جا گری۔ غصے سے بستر پر لیٹ گیا۔ آج کھانا بھی نہیں کھایا۔ باہر چوپال پر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ حالاں کہ باہر سے راموں نے آواز بھی دی مگر یہ سوتا بن گیا۔

صبح ہونے تک مداری کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو چلا تھا۔ آج اس نے چاندنی پر زیادہ توجہ دی اور بنا سنوار کے اسے تیار کیا۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے قریب اور دور سے دو چار دفعہ دیکھا۔ اہتمام سے مطمئن ہوا تو چوم کر صندوق میں رکھ لیا۔ پیلی ملکہ رات سے اسی کونے میں پڑی تھی۔ مداری نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی۔ صندوق سائیکل پر رکھ کر چل پڑا۔ آج کا دن خوب تھا۔ ایک تو یہ کہ روز نئے تماش بین ہوتے ہیں... جنھیں کل کے حادثوں کی خبر نہیں تھی۔ سب کھیل ایک ایک کر کے اطمینان سے تکمیل کو پہنچے۔ مداری پھر موج میں تھا۔ شام ہونے پر پیسے سمیٹے۔ سفید چادر تہ کر کے رکھی اور چاندنی کو بہت پیار سے صندوق میں اُتارا۔

''پیلی ملکہ کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ سمجھتی تھی اب اس کے بغیر کھیل چل نہیں سکے گا۔ پر تجھے بھول گئی تھی وہ۔ تو نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ واہ بھئی واہ۔''

مداری اب چاندنی سے خوش تھا اور خوب باتیں کرتا جاتا۔ حجرے میں پہنچ کے سائیکل قرینے سے کھڑی کی۔ راستے سے دال، پیاز اور روٹی لے لی تھی، انھیں ایک رکابی میں رکھا اور چاندنی کو ساتھ بٹھا کے کھانے میں مشغول ہو گیا۔ کھانا کھا کے اس کی نظر پیلی ملکہ پر پڑی۔ اسے اُٹھا کر جھاڑا۔ پیلی ملکہ کا بازو بھی تلاش کیا اور پٹاری سے سوئی دھاگا لے کر بازو شانے سے جوڑنے کے ارادے سے پیلی ملکہ کو اُٹھایا تو اس کی ٹانگ بھی زمین پر گر پڑی۔ اب مداری کو کچھ افسوس ہوا۔ اُلٹ پلٹ کے دیکھا، بہت کوشش کی کہ بازو اور ٹانگ دوبارہ لگ جائیں مگر وہ کچھ اس انداز سے ادھڑے تھے کہ اب دوبارہ لگنا ممکن نہیں تھا۔ اسی تگ و دو میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ اب مداری بے چین تھا کہ کسی طرح اپنی دلاری کو واپس صحیح حالت میں لا سکے مگر کل کے غصے میں وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا۔ تھک ہار کے اُٹھا اور پیلی ملکہ کو اس کے بازو اور ٹانگ کے ساتھ لے کر جھگی سے باہر نکل آیا۔ بستی کیا تھی، ایک خالی پلاٹ پر تقریباً بیس جھگیاں بکھری پڑی تھیں۔ کونے میں ایک نیم کا درخت سر اُٹھائے کھڑا رہتا تھا۔ مداری نے اس کے نیچے تھوڑی سی زمین کھودی اور پیلی ملکہ کا دھڑ، بازو اور ٹانگ اس میں دبا کے مٹی برابر کر دی۔ مرے مرے قدموں سے جھگی میں واپس آیا۔ بستر ٹھیک کرنے کا بھی حوصلہ نہ تھا۔ چاندنی کو اُٹھا کے ایسے سینے سے لگایا گویا کٹھ پتلی کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہو۔ اسی حالت میں بستر پر لیٹ گیا اور آپ ہی آپ رونے لگا۔

''دلچسپی کا عنصر''

سعید نقوی کے افسانوں کی انتہائی اہم خوبی، ان کا بے تحاشا Readable ہونا ہے۔ Readability مانتا ہوں کہ ایک موضوعی، اضافی قدر ہو سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے دلچسپی کا عنصر کسی بھی تحریر کا مرکزی عنصر بن جاتا ہے، وہ یوں کہ اس وصف کے ہوتے ہی تحریر کے دیگر اصناف کھل سکتے ہیں۔ سعید نقوی جو خود دیکھتے ہیں اُسے لفظوں کے طفیل دوسروں کو دکھا دینے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور سعید نقوی کی کہانی خود کو پڑھوانے کی صلاحیت سے ثروت مند بھی ہے۔ ان کے افسانے کئی وجوہ سے موجودہ اُردو افسانے کے منظر نامے میں اہم ٹھہرتے ہیں۔ موضوعات، بیانیہ، طرزِ بیاں اور تکنیک کے اعتبار سے وہ لائقِ توجّہ کہانی کار ہیں۔ اُن کے افسانوں کی زبان اور اُن کا اسلوبِ نگارش انتہائی سادہ اور دلکش ہے۔

شہزاد نیّر

براہِ راست

اردو نئی بستیوں میں جب بھی کوئی نیا پودا اُگتا، اُس کی کونپلیں پھوٹتیں اور خوشنما پھول اُگتے ہیں تو ہمارے دل میں خوشی کی لہر بہر ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی کی شکل میں اردو ادب میں نئے پودے کی بنیاد ڈلی ہے اور اُس پودے پر کونپلیں کھلنے کے بعد رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھلانے لگے ہیں۔ ناول ہو، افسانہ، ترجمہ، غزل یا نظم ہو، ہر صنف پر ڈاکٹر سید سعید نقوی کو یکساں دسترس حاصل ہے۔ قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر سید سعید نقوی کس میدان کے شہسوار ہیں۔

اسی معمہ کو حل کرنے کے لیے آج کی محفل آراستہ کی گئی ہے۔ کم تر عرصہ میں جس قدر تیزی سے ڈاکٹر سید سعید نقوی نے اردو ادب میں نو بہ نو کے ادبی اور تخلیقی پھولوں کا اضافہ کیا ہے اُس کے باعث وقت کے پیمانے ایک طرح سے بے معنی ہو گئے ہیں۔

ہر چند کہی ہوئی بات دوبارہ کہنے سے جی اوبنے لگتا ہے مگر کچھ باتیں کہے بنا چارہ بھی نہیں ہوتا۔ سو میرے حضور! ڈاکٹر سید سعید نقوی کی قلم کاوشات کی ہمراہی میں اُن کی شخصیت و فن کو اس خواہش کے ساتھ آپ کے روبرو کر رہے ہیں کہ آپ تمام تر توجہ انہماک سے ذیل کی صفحات کا مطالعہ کیجیے اور اپنی رائے سے ہمارے ساتھ اتفاق و اختلاف کے حق کو پوری طرح استعمال کیجیے۔

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر صاحب! ہمارا ہاتھ تھام کر یادوں کی پگڈنڈی کے اُس سرے پر لے چلئے جہاں سے آپ کی یادداشت کا سفر شروع ہوتا ہے؟

☆☆ اولین یادیں حیدرآباد سندھ کی ٹھنڈی، ہرباں ریت سے وابستہ ہیں۔ چھوٹے سے گھر میں ہم سات بہن بھائی، ماں باپ، پھوپھی اور چچا ساتھ رہتے تھے۔ دادا، دادی کبھی ہمارے ساتھ اور کبھی تایا کے پاس اسمٰعیل آباد ملتان میں۔ گھر کا ماحول مشفقانہ اور محبت بھرا تھا۔ اس میں ادب، بیت بازی، ڈرامے، اور دیگر فنون ہائے لطیفہ میں حصہ لینے کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ والدین نے اپنے حتی المقدور زیرِ مطالعہ کتابوں سے لائبریری بنا رکھی تھی۔ والد کی قلیل آمدنی میں سے بھی کچھ پیسے کتابوں کی خریداری پر ضرور خرچ ہوتے۔ منٹو سے قراۃ العین اور رضیہ بٹ سے شوکت تھانوی سب ہی کچھ تو تھا۔ غالب، اقبال، فیض، حالی سب کی کتابوں سے استفادہ مہیا تھا۔ والدین کا تعلق یوپی سے تھا، میری پیدائش ۱۹۵۹ جنوری کراچی میں ہوئی۔

☆ اس کے بعد تعلیمی اداروں کی سیاحت کچھ اس طرح کرائیے کہ چیدہ چیدہ ہم جماعت اور اساتذہ کا تعارف بھی شامل ہو؟

☆☆ گھر سے باہر اسکول میں بھی بہت حوصلہ افزا ماحول ملا۔ پرائمری سے انٹر تک پبلک اسکول حیدرآباد میں ہی تعلیم حاصل کی۔ یہ اصل میں ایک بورڈنگ اسکول تھا جس میں مجھ جیسے کچھ مقامی روز کے طلبہ بھی تھے۔ مختلف بورڈنگ ہاؤس میں مقابلہ بازی کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ وہیں سے تقریری مقابلوں، معلوماتِ عامہ کے مقابلوں، ڈراموں وغیرہ میں باقاعدگی سے حصہ لیا۔ یہاں دو اساتذہ کا ذکر بہت ضروری ہے۔ ایک محترم نعیم الرحمٰن جوہر، جو نو بہ رام جوہر سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، انہوں نے خوب مار مار کے اردو پڑھائی۔ حرف و قلم کے شوق میں ان کا بہت دخل ہے۔ دوسرا نام محترم استاد اختر ہلال زبیری کا ہے جو شعبہ مصوری کے استاد تھے۔ موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، ڈراموں سب کا مزہ چکھا۔ خواہ وہ ''مرزا غالب عوام کی عدالت میں'' کا وکیلِ صفائی ہو یا ڈرامہ ''سکون کی تلاش میں'' کی خاتونِ خانہ انہوں نے ہر جگہ حوصلہ افزائی کی۔ اب بھی دنیا بھر میں زبیری صاحب کی تصاویر کی نمائش ہوتی ہے، وہ اب بھی کراچی ڈیفنس میں بچوں کو مصوری کی تعلیم دے رہے ہیں۔

☆ ادب سے آپ کے تعلق کی ابتدا کا احوال قارئین ''چہارسو'' کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہونا چاہیے؟

☆☆ بحیثیت قاری ادب سے ہمیشہ تعلق رہا ہے۔ سب سے پہلی کہانی ہر لکھنے والے کی طرح اسکول کے مجلّے میں چھپی۔ پھر اسکول کے ایک اخبار کی ادارت کی۔ شاعری میں اولین نظم ایک ہم جماعت کے بارے میں تھی:

پھر شام کی جھلمن چلمن سے
تیری یاد کا چہرا جھانکا ہے

پھر سو کے جگ کے کٹنی ہے
یونہی رات گزرتی جانی ہے
گئی رات تری نئی رات تری
یونہی عمر کٹے تری یادوں میں وغیرہ وغیرہ

ایک طویل خوشامدی نظم ہے۔اب وہ خاتون ورجینیا میں کئی بچوں کی ماں ہیں۔اس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔اس کے بعد لکھنے کے اعتبار سے میڈیسن میں جا کر ایک طویل وقفہ آیا۔طبی رسالوں میں تحقیقی مقالے چھپتے رہے۔ پہلا افسانہ لگ بھگ بیس برس پہلے جان کاشمیری کے رسالے میں شائع ہوا۔

☆ کچھ احوال امریکہ آمد اور درپیش مسائل کا بتلایئے تا کہ یہاں آ کر بسنے کے خواہش مند نوجوان اصل صورت حال سے آگاہ ہو سکیں؟

☆☆ ۱۹۹۴ میں ایم آر سی پی کرنے کے بعد یا تو ہم انگلستان میں رہتے یا واپس پاکستان چلے جاتے۔میرے والدین اور بہن، بھائی ۱۹۸۸ میں ہی کینیڈا چلے گئے تھے،لہذا سب کے زور دینے پر قرعہ امریکہ کے نام نکلا۔مجھے ذاتی طور پر یہاں آ کر کوئی دشواری نہیں ہوئی۔لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آپ اپنے ملک میں کامیاب ہیں تو بیرونِ ملک جانا عقلمندی نہیں۔تربیت،تعلیم اور تحقیق کے لیے ضرور جائیں اور مکمل کر کے واپس آ جائیں۔

☆ پاکستان میں ڈاکٹر اکثر عدیم الفرصتی کا گلہ کرتے ہیں۔آپ امریکہ جیسے تیز رفتار معاشرے میں پیشہ ورانہ طبی ذمہ داریوں کے باوجود ادب کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں۔کچھ تفصیل روزمرہ مصروفیات کی بتلایئے؟

☆☆ صحیح گلہ کرتے ہیں۔لیکن اتنا سمجھ لیجیے کہ پاکستان کے مقابلے میں یہاں مصروفیت کم از کم پانچ گنا زیادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ میری تحریر میں ابھی تک وہ مقام نہیں آیا،جس سے میں مطمئن ہو سکوں۔عدیم الفرصتی کا بہانہ اچھا فراہم کیا ہے آپ نے۔اسی بھاگ دوڑ میں وقت نکالنا پڑتا ہے۔مشکل یہ ہے کہ افسانہ جب آنے لگتا ہے تو پھر اسے روکنا دشوار ہے، وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔اب تو ریٹائرمنٹ کا انتظار ہے کہ ادب کو کل وقتی توجہ دے سکوں۔یہ بھاگتے دوڑتے کی شاعری اور افسانہ نگاری سے بات نہیں بنتی۔

☆ آپ کے پہلے افسانوی مجموعہ ''نامہ بر'' کی اشاعت کے بعد اردو افسانے سے آپ کے عشق کو نوجوانی کا عشق کہا گیا۔آپ کے خیال میں اب اس عشق کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ جب دوسرے لکھنے والوں کو پڑھتا ہوں تو اپنے کام کو بچپنے کا شوق سمجھتا ہوں کہ ابھی طفلِ مکتب ہوں۔پھر بھی میرے خیال میں تخلیق ریاضت کی پابند نہیں ہوتی۔اس اپج کو نکھارا جا سکتا ہے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ویسے بھی جوانی نہ جانے کب گزر گئی پتہ ہی نہیں چلا۔

☆ آپ کو یہ خیال کب اور کیونکر ہوا کہ آپ صرف موضوعاتی کہانی لکھتے ہیں؟

☆☆ یہ تو آپ میرے منہ میں الفاظ رکھ رہے ہیں، میں نے کب اس قسم کا بیان دیا ہے۔اگر آپ میری کہانیاں پتلی تماشہ،آٹو ورکشاپ،شمشان گھاٹ، سخت جانی ہائے تنہائی، دھوپ کی تپش، جگ بیتی وغیرہ چند نام ہیں جو ذہن میں آ رہے ہیں جو موضوعاتی نہیں کہے جا سکتے۔ویسے دیکھا جائے تو دنیا کی ہر کہانی کا محور محبت یا نفرت کا جذبہ ہے۔میرے خیال میں محبت کوئی معمولی جذبہ نہیں، کائنات اپنی تمام وسعت میں صرف محبت ہی محبت ہے،موضوع تو ایک مختصر سا لفظ ہے۔مجھے انسانوں سے بہت دلچسپی ہے،ان سے بات کرنے،ان کی کہانی جاننے اور اسے بیان کرنے کا شوق۔

☆ بیانیے میں مداخلت اور جملہ معترضہ پر اعتراض کرنے والے آپ کی کس خامی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ کہانی سنانے کا انداز ہے جو مغرب سے درآمد شدہ ہے۔لیکن اس میں یہ ضرور خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ربط برقرار رہے، ورنہ قاری کی دلچسپی کھو جاتی ہے۔ایک اور امر جس پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے،لیکن آپ نے سوال نہیں اٹھایا وہ اندازِ بیاں میں لطیف، ہلکا سا مزاح کا آمیزہ ہے۔یہ بھی نادانستہ طور پر موجودہ عالمی نثر نگاری سے اثر قبول کیا ہے۔حالانکہ ایک دوست نقاد نے مشورہ بھی دیا کہ اگر تمھارے افسانوں کی زباں سنجیدہ رہے تو وہ زیادہ موثر ہوں گے۔ لیکن دوسری جانب ایک بڑی اکثریت نے اسے سراہا ہے،لہذا برداشت کیجیے۔

☆ افسانے کی زبان میں ادبیت پیدا کرنا کیوں ضروری ہے۔آپ اپنے افسانے کو دانستہ Defamilarize کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟

☆☆ شاعری کی اپنی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ہر لفظ کا شعر میں استعمال اچھا نہیں معلوم ہوتا۔اسی طرح افسانہ نگاری کا اپنا ایک ڈھنگ ہے۔ زبان کا حسن قاری کی توجہ مرکوز رکھتا ہے۔روانی اور شگفتگی قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہے۔تحریر کو پھکڑ پن اور عامیانہ پن سے محفوظ رکھتی ہے۔

☆ آپ کے افسانوں میں Allogery یعنی تمثیل کا استعمال اس قدر زیادہ کیوں ہوتا ہے؟

☆☆ زندگی جیسی نظر آتی ہے، ویسے ہی بیان کر دینا اخباری نمائندوں کا کام ہے۔افسانہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی کو افسانے کے روپ میں بیان کرے۔افسانہ نگاری کہانی سنانے کے آرٹ کو کہتے ہیں۔افسانہ نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے اطراف میں بیٹھے سامعین،افسانہ مکمل ہونے سے پہلے اٹھ کر نہ جائیں۔ان کے انہماک کا یہ عالم ہو کہ بیرونی مداخلت انہیں ناگوار گزرے۔اس کمال فن کے حصول کی خاطر افسانہ نگار مختلف حربے استعمال کرتا ہے،تمثیل نگاری ان ہی میں سے ایک ہتھیار ہے۔

یہ المیہ بھی ذہن میں رہے کہ ہم ابھی اس سماجی بلوغت اور شعور کو نہیں پہنچے جہاں ہر موضوع پر شائستگی سے گفتگو ہو سکے۔دوسرے کے نکتہ نظر کو سن سکیں اور برداشت کر سکیں۔ہماری کوشش ہوتی ہے کہ بلند آواز سے چیخ کر اس کی

آواز بند کردیں، نادان پھر بھی نہ مانے تو زبان کاٹ دیں۔ خاص طور پر عقائد، مذہبی امور، انسانی حقوق ایسے حساس موضوعات ہیں جن پر گفتگو کی قیمت جان دے کر بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صرف ہمارا ہی المیہ نہیں بلکہ بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، سوڈان اسلامی دنیا کے ادیبوں کو یہ جان لیوا مراحل ہر جگہ درپیش ہیں۔ استعارہ اور تمثیل اکثر اس پس منظر میں اپنی بات کہنے کا ایک فن ہے۔ کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے۔ اسے آپ بزدلی کہیں یا سیانا پن، مجھے ہنوز زندگی سے اتنا پیار ہے کہ ان بیساکھیوں کا سہارا لے سکوں۔ میں بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن یہاں قلم کا مقابلہ کلاشنکوف سے ہے۔

☆ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سعید نقوی صاحب پہلے سے کوئی نقطہ یا خیال ذہن میں رکھ لیتے ہیں پھر اُس کے گرد کہانی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں اگر یہ اختلاف درست ہے تو کہانی کہنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

☆☆ میری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ کہانی لکھنے میں زیادہ تیل نہ جلانا پڑے۔ فکر و قلم میں ایسا ربط رہے کہ رک رک کے سوچ سوچ کر کہانی نہ لکھنی پڑے۔ میرے سارے افسانے ایک ہی نشست میں مکمل ہوتے ہیں۔ کہانی شروع کرتے ہوئے کوئی ایک فقرہ، کوئی ایک واقعہ، کوئی محبت اپنی کہانی سنانے کو بے تاب ہوتی ہے تو باقی کہانی خود بخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ نوے فیصد افسانوں کو شروع کرتے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انجام کیا ہوگا۔ عموماً افسانہ بنتے بنتے خود اپنا انجام ڈھونڈ لیتا ہے۔ سو ان کا اعتراض درست لیکن غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی افسانہ لے لیجیے اس کا ایک مرکزی نکتہ یا خیال ہوگا جس کے گرد کہانی نگار نے افسانہ بنا ہوگا۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ کی کہانیاں پڑھ کر قاری کسی قدر بوجھل اور اُداس ہو جاتا ہے؟

☆☆ یہ الزام درست ہے، مجھے اقبالِ جرم ہے۔ ادیب کا کام یہ ہے کہ وہ ظاہری حقیقت کے پس پردہ محرک حقیقت دکھائے۔ کبھی یہ حقیقت خوبصورت ہوتی ہے تو کبھی بدنما۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ یہ اکثر بعد الذکر سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں خیال یہ رکھنا ہوتا ہے کہ کہانی کسی بلند منبر سے خطابت کا لہجہ نہ اختیار کرلے۔ ہم اپنے ارتقا میں ایک سماجی انقلاب سے گزر رہے ہیں۔ اپنی شناخت کے دھندلے کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے اطراف اتنی غربت، دکھ، ناانصافی، جبر اور کرپشن ہے کہ جب ہم ان افسانوں کے آئنے میں اپنا آپ دیکھتے ہیں تو دکھی ہو جاتے ہیں۔ یہ ادب کی سماجی معنویت ہے۔ میرے خیال میں تو پھر بھی ہمارے افسانہ نگاروں اور تخلیق کاروں کا اختلافی رویہ معذرت خواہانہ ہے۔ آپ ان حالات کو بدل کر خوشیاں بکھیر دیجیے، میرے افسانوں کے موضوع اور فضا خود بخود بدل جائے گی کہ یہ افسانے میں نے اپنے اطراف سے ہی اٹھائے ہیں۔

☆ آپ کو دو کشتیوں کا مسافر کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ میں یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو افسانہ عالمی افسانہ نگاری میں کسی سے کم نہیں (یہ بات اردو ناول نگاری کے لیے کہتے ہوئے شرما جاتا ہوں)۔ لیکن افسانوں کی دنیا میں جہاں منٹو، انتظار حسین، نیر مسعود (ان کے جو افسانے سمجھ میں آجائیں) سے اثر قبول کیا ہے وہیں مورا کامی، کافکا، موپاساں کی تکنیک اور اندازِ بیاں نے بھی لاشعوری طور پر ہو سکتا ہے اثر چھوڑا ہو۔ یہ تو ہوگئی بات کہانی سنانے کے فن میں دو کشتیوں کی سواری کی۔ اس میں مجھ سے زیادہ قاری کو دشواری ہے کہ وہ روایتی اردو افسانہ نگاری کی امید میں ورق الٹتے ہیں لیکن درمیان میں بدیسی تکنیک بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً افسانے ''دامِ آگہی'' میں قاری کو مسلسل کئی مرتبہ ماضی و حال میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ ایلس منرو نے اس تکنیک میں بہت مہارت حاصل کی ہے، ہو سکتا ہے یہ ان کی کہانیاں پڑھنے کا شاخسانہ ہو۔

اگر یہ سوال میری فکر سے متعلق ہے تو دو کشتیوں میں سواری کوئی حیرت کی بات نہیں، زندگی کے پہلے پچیس سال ایک ماحول میں گزارے اور آئندہ تیس سال ایک دوسرے قسم کے سماجی اور سوشل نیٹ ورک کا سامنا رہا۔ میرا خمیر مشرق کی مٹی سے اٹھا ہے اور اس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے، مگر اب اس میں مغربی تنور کی آنچ بھی لگی ہے، بس دعا کیجیے کہ یہاں سے اچھائیاں ہی چنوں۔

☆ وہ کونسے بے رنگ خاکے ہیں جن میں رنگ بھرنے کی خواہش آپ کے ہاں نمایاں ہے؟

☆☆ اس سوال کا جواب آسان اور سادہ ہے، زندگی وہ خاکہ ہے جس میں رنگ بھرنے کی کوشش ہے یہ سب۔ اکیسویں صدی میں پہنچ کر بھی انسان اپنی تمام ذہانت، ترقی اور ایجادات کے باوجود وہ ماحول وہ نظام نہیں فراہم کر سکا کہ یہاں پیدا ہونے والے ہر بچے کو چھت اور خوراک فراہم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ ہماری مردانگی اور عزت کا سارا زور عورت کی پاکیزگی اور اس کی تابعداری پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر اس خود ساختہ عمارت میں کہیں بال آجائے تو ہم اپنی شکست خوردگی کا بدلہ تشدد سے لیتے ہیں۔ یہ صرف ہمارے ہی معاشرے کا مسئلہ نہیں جان لیجیے یہ ہر معاشرے کی کہانی ہے، فرق صرف درجے کا ہے۔ لیکن یہاں بھی گھٹنا پیٹ کی طرف ہی مڑتا ہے، گیس اسٹوو پھٹنے سے صرف بہو ہی مرتی ہے، لیکن اگر عزت پر پڑنے والی ضرب سنگین ہو، تو بیٹی بھی کاروکاری کا شکار ہوتی ہے۔

منٹو کے افسانے ''کالی شلوار'' کی سلطانہ ریل کی پٹری پر اس ڈبے کی مانند ہے جسے انجن نے چھوڑ دیا ہے، اور دوسرے اس کا کانٹا بدل رہے ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے اور ڈبہ رک جاتا ہے۔ میں اس ڈبے میں جنریٹر لگانا چاہتا ہوں کہ انجن سے علیحدہ ہو کر یہ ڈبہ خودکار ہو جائے۔ مغرب نے کم از کم اس عمل میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے اہم قدم عورت کی معاشی آزادی، یا کم از کم آزادی

کا امکان ہے۔ جب کہ ہم نے اب تک عورت کو وہ گائے بنا رکھا ہے کہ اس کے گلے میں بندھی رسی جس کے ہاتھ میں ہو، وہ جہاں جاتا ہے وہ اس کے پیچھے چل پڑتی ہے۔ اس خاکے میں رنگ بھرنا بہت ضروری ہے۔

☆ جو لوگ آپ کے ہاں نسیان کی نشان دہی کرتے ہیں اُن کا منشا و مقصود کیا ہے؟

☆☆ نسیان کے مارے ہیں۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔

☆ آپ کے استعمال کردہ کچھ موضوعات اجنبی اور غیر مانوس دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مصنف خود کے بجائے دوسروں کے مشاہدات کو کام میں لا رہا ہے؟

☆☆ میں مشکور ہوں کہ آپ نے یہ بات کہہ دی۔ ورنہ یہاں تو بیشتر افسانوں پر تنقیدی تجزیہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ''لگتا ہے مصنف نے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا ہے۔'' اب اس افسانے میں چاہے کتنے ہی سنگین اور غیر انسانی مسائل کا ذکر ہو اس قسم کا تبصرہ پڑھ کر کتنی کوفت ہوتی ہے۔ مشاہدات مصنف کے ہوتے ہیں، لیکن سب وارداتیں اس کی ذات سے وابستہ نہیں۔ پھر یہ کہ ایک واقعے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ ہمارے سامنے تو محض بہت سرسری سا منظر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کار کسی راہ گیر کو ٹکر مار دے۔ ایمبولنس آئی، پولیس نے رپورٹ درج کی، تماشائی اپنے گھر چلے گئے۔ لیکن جس شخص کو ٹکر لگی، وہ کہاں جا رہا تھا، اس کے متعلقین پر کیا گزری، کیا سر کی چوٹ سے وہ یادداشت کھو بیٹھا، یا دو تین دن بعد مر گیا۔ تو یہ سب نتائج سامنے نہیں ہوتے، افسانہ نگار مختلف زاویوں سے انہیں دیکھتا ہے، بیان کرتا ہے، اس میں کچھ مشاہدے تو ذاتی ہوئے جو فوری سامنے آ گئے، کچھ دوسروں کے حوالوں سے یا نسبت سے کھوجنے پڑے۔ آپ آم کھایئے، کیسے توڑے تھے یہ جانے دیجیے۔

☆ آپ کے ہاں انسانوں کے ساتھ حیوان بھی کثرت سے زیر بحث آتے ہیں۔ اُن کی جبلت کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنا بھی باعثِ اشتیاق ہے؟

☆☆ یہ تمثیل والے سوال کا ضمنی سوال ہے۔ مثلاً ''جنگل کا قانون'' ایک مورنی کے ساتھ زیادتی کا افسانہ ہے، جو ہماری روز کی کہانی ہے۔ اسے اس طرح بیان کرنا تھا کہ اس کی زیادتی کی سفاکی برقرار رہے، نازک مسائل بیان ہو جائیں، لیکن پڑھنے والے کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے۔ یہ محض فکر کی اڑان ہے۔ کہانی گوموج میں آتا ہے تو کہانی کسی اور استعارات میں بیان ہو جاتی ہے۔

☆ جب آپ اپنے افسانوں میں نسلی تعصب کا ذکر کرتے ہیں تو کونسا خطہ یا علاقہ آپ کے پیش نظر ہوتا ہے؟

☆☆ نسلی تعصب ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ میں نے پاکستان، ایران، سعودی عرب، آئرلنڈ، امارات، انگلستان اور امریکہ میں نوکری کی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کے بیشتر قابلِ ذکر ممالک کی سیاحت کا موقع بھی ملا۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ تعصب ہمارے خمیر کی سڑاند ہے، فطرت میں گندھ گئی ہے۔ اس میں محض نسلی تعصب کو ہی انفرادیت حاصل نہیں۔ یہ زبان، مذہب، رنگ، فرقہ، قبیلہ، جائے پیدائش، جنسیت ہر رنگ میں برتا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں برتا جاتا ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ اس کی جڑیں اکثر معیشت میں پیوست ہوتی ہیں۔ جب دو افراد کے درمیان کھانے کو ایک ہی روٹی میسر ہوگی تو دونوں دوسرے کو کسی بنیاد پر اس سے محروم کرنا چاہیں گے کہ اکیلے مکمل روٹی کا لطف اٹھا سکیں۔ جہاں معاشی میدان قدرے ہموار ہو وہاں اس سے دوسری مراعات کا حصول محرک ہوتا ہے۔ کہیں یہ احساسِ برتری کا شاخسانہ ہے تو کہیں احساسِ کمتری کا دفاعی ہتھیار۔ ہم نے اسی عفریت کے ہاتھوں اپنا مشرقی بازو گنوایا۔ لیکن موجودہ فرقہ واریت سے قطع نظر جو کہ وحشت و بربریت کی بدترین مثال ہے، نسل و زبان کی بنیاد پر تعصب دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک میں ہم سے کہیں زیادہ ہے۔

☆ اگر تخلیق کار ارادی یا غیر ارادی طور پر معاشرے کے سدھار کی خواہش میں مصلح بن جائے تو اُسے آپ کس نظر سے دیکھیں گے؟

☆☆ اس میں سب سے پہلے تو قاری کے باغی ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ادیب کا کام معاشرے کی اصلاح نہیں معاشرے کو آئینہ دکھانا ہے۔ لیکن اگر کسی مسئلے کے بیان میں ادیب اپنے نکتہ نظر سے کوئی حل کہانی میں بیان کرے تو کچھ ایسا حرج بھی نہیں۔ لیکن یہ مزاج کے خلاف ہے۔ یہ کہنا کہ ادیب غیر جانبدار ہوتا ہے فریب ہے، اگر منٹو غیر جانب دار ہوتے تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کیوں لکھتے۔ لیکن اگر اس میں انداز خطیبانہ ہو جائے تو ایک معرکتہ الآرا کہانی کی جگہ سوشل کنٹری یا چوں چوں کا مربہ رہ جائے گا۔ اگر اصلاح مقصود بھی ہے تو ایسے غیر محسوس طریقے سے ہو کہ آپ اس پر انگلی نہ رکھ سکیں۔ جز بُز رہیں، مشکوک رہیں، لیکن بتا نہ سکیں کہ دیکھا میں نہ کہتا تھا یہ ہمیں درست کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

☆ سارتر کے خیال میں معاشرے کو آئینہ دکھانا انقلابی فعل ہے۔ آپ اس خیال سے کس قدر اتفاق کرتے ہیں اور آپ کے آئینہ دکھانے سے معاشرے میں تبدیلی کے امکانات سے آپ کتنے پُر امید ہیں؟

☆☆ معاشرے کو آئینہ دکھانا انقلابی ہو یا نہ ہو ایک تندرست فعل ضرور ہے۔ جو بات افسانہ نگار نے بیان کی ہے وہ عموماً قاری کی نظر سے بھی گزری ہے، لیکن قاری اس کے مضمرات، اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کر سکا۔ افسانہ نگار انہی پہلوؤں کو عیاں کرتا ہے۔ تبدیلی راتوں رات نہیں آتی، آتی ہے تو پائیدار نہیں ہوتی۔ تبدیلی ممکن ہے افسانہ نگار کی زندگی میں بھی نہ آئے۔ لیکن میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ تبدیلی اتنے بہت سے عوامل پر منحصر ہوتی ہے، کہ قوموں کی زندگی میں ان تمام عوامل کا ایک ساتھ ایک ہی وقت پر ایک جگہ جمع ہو جانا روز کا معمول نہیں۔ مثلاً عرب اسپرنگ کی ہوا کتنے ہی ممالک میں چلی۔، لیکن کتنی کم جگہوں پر کامیاب ہو سکی۔ حالانکہ ان تمام ممالک میں ایک زبان، ایک لباس، ایک مذہب رائج ہے، سب میں جابرانہ، آمرانہ حکومتوں کا قبضہ ہے۔ ایک

سادہ مثال مصر کی ہے کہ جہاں زیادہ تر عوامل میسر ہو گئے تھے، لیکن ملک کی عسکری قیادت اس پلیٹ فارم پر نہ آسکی۔

☆ ایک ناقدانہ رائے یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے تمام طبقات پر طنز و تنقید کرنے کا ہوکا ہے؟

☆☆ یہ ناقدانہ رائے کس رخ سے ہے؟ نقاد کا کام ہے میری کہانی، میری زبان، میری تکنیک، میرے کرافٹ کی خوبیوں اور کمزوریوں پر بات کرے۔ ورنہ آپ کیا چاہتے ہیں کہ میرا قلم محض کسی مخصوص طبقے کی کمزوریوں کو عریاں کرے، دوسرے طبقات کی کمزوریوں پر پردہ ڈالے؟ یہ تو ردِ عمل اور احتساب کے معاملات ہیں۔ بہرحال میں نے ادب کو اپنا پیش رو رکھا ہے، اور ادبی اقدار کی پاسداری کو اولیت دی ہے۔

☆ آپ کی استعمال کردہ زبان کراچی بلخصوص لیاری کے تڑکے سے مماثل کیوں ہے؟

☆☆ اس کا آسان جواب تو یہی ہے کہ میں کراچی اور حیدرآباد میں پلا بڑھا ہوں، ۔دوسری بات یہ کہ جب منٹو صاحب سوگندی لکھتے ہیں تو زبان اور ہوتی ہے، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اور۔ تو میرے افسانے ''آٹو ورکشاپ'' کے کردار اردوئے معلیٰ میں گفتگو کریں تو افسانہ غارت ہو جائے۔ میں شعوری طور پر افسانے میں مقفع و مسجع الفاظ ٹانکنے کے خلاف ہوں۔ اس سے کہانی کا قدرتی حسن جاتا رہتا ہے۔ میرے بیشتر افسانوں کا پس منظر حاشیوں میں بسنے والے افراد ہیں، ان کا رہن سہن، ان کی گفتگو کا انداز مختلف ہوتا ہے۔

☆ آپ کے استعمال کردہ بہت سے جملے اور محاورے انگریزی سے مستعار بتلائے جاتے ہیں؟

☆☆ رد و قبول کا یہ عمل ذاتی لیکن غیر شعوری ہے۔ مشکل یہ ہے کہ گفتگو کرتے وقت بہت زیادہ رواں محاورے بھی زبان پر آجاتے ہیں۔ میرا قیام پچھلے تیس برس سے پاکستان سے باہر رہا ہے، اور دن کے چودہ گھنٹے زبانِ غیر سے اینٹھن رہتی ہے۔ میرا کہانی سنانے کا انداز میرا اندازِ گفتگو ہے، ۔اگر ان محاوروں کے اردو ترجمے سے تاثر قائم رہا تو میں نے اس کے استعمال سے دریغ نہیں کیا۔ اسے آپ ڈیوائس کہہ لیں۔ اس سے (میرے خیال میں) میرے بیانیے کی width میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہنر یہی ہے کہ انگریزی کہاوت کو اس روانی سے پیوست کیا جائے کہ منہ میں کنکر محسوس نہ ہو۔ حذف و اختیار مصنف کا استحقاق ہے۔

☆ ایک تصور یہ ہے کہ آپ پیچیدہ مسائل کو زیرِ دام لانے کی کوشش میں خود الجھتے جا رہے ہیں؟

☆☆ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے افسانوں کی ریچ ذرا زیادہ منتشر ہے۔ اس میں تاریخ، مذہب، سیاست، جذبات، تعصب، فرد کی ناکامی اور اس کی کامیابی، عصری مسائل غرض سب عنوانات پر افسانے ملتے ہیں۔ لیکن میں کما حقہ ان موضوعات میں الجھ جانے کی بجائے انہیں آگے بڑھنے کے لیے استعمال کرتا ہوں تا کہ فکری تھکن کا شکار نہ ہو جاؤں۔

☆ آپ کی تخلیقات میں غصہ، تلخی، جھنجھلاہٹ کی نشان دہی کس حد تک درست ہے اس کا سبب کیا ہے؟

☆☆ یہ موضوع پر منحصر ہے پھر سمجھنے والے کی صوابدید پر۔ میری تحریر کا ڈسکورس خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔ مثلاً افسانہ ''پتلی تماشہ''، ممکن ہے کسی کو اس میں غصہ یا جھنجلاہٹ نظر آئے، مگر حقیقتاً اس افسانے کا ان جذبوں سے دور کا بھی تعلق نہیں موضوع کا تلخی کا افسانے کے عمومی تاثر سے discordant ہونا بہتر ہے۔ موضوعات یوں تلخ ہیں بھائی کہ افسانہ نگار تو معاشرے کا آئینہ ہے۔

☆ یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ اردو افسانے میں دہرانے کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ آپ کے ہاں صورت احوال کیا ہے؟

☆☆ اردو افسانے میں تھوڑا بہت دہرانے کا عمل ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خود ایک ادیب ایک ہی موضوع پر مختلف انداز سے کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ اور یہ محض اردو کا ہی قصہ نہیں، دنیا بھر کی زبانوں میں یہی ہوتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ افسانہ نگار ایلس منرو جدید افسانے کی امام مانی جاتی ہیں۔ وہ اپنے شائع شدہ افسانے کو کچھ عرصہ بعد قطع و اضافت کے ساتھ دوبارہ پیش کر دیتی ہیں۔ لیکن نئے موضوعات بھی خود بخود سامنے آتے رہیں گے۔ مثلاً ہابیل قابیل کے زمانے سے رقابت پر کتنے افسانے لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ لیکن کمپیوٹر، خلائی سفر، ایڈز، طول العمری کے مسائل، مشینی زندگی، ایٹمی ہتھیار یہ سب اپنے مسائل خود لائیں گے۔ انسانی جذبے تو اب بھی وہی ہیں جو غاروں کے زمانے میں تھے؛ رشک، حسد، جنس، رقابت، محبت ان پر افسانے نئے نئے انداز میں لکھے جاتے رہیں گے۔ لیکن مثلاً ہم جنس پرستی، ہم جنس پرست جوڑے کے پالے پوسے بچوں سے متعلقہ سوالات نے کہانیوں کا ایک نیا پنڈورا باکس کھول دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی تشویش سے متفق نہیں ہوں۔

☆ صنفِ نازک کا یہ گلہ کس حد تک بجا ہے کہ اُن کی نمائندگی آپ کی تخلیقات میں نہ ہونے کے برابر ہے؟

☆☆ پتلی تماشہ، جنگل کا قانون، کالی آندھی، ہم جولی، گنوارن، مسابقت، شمشان گھاٹ، تعلق خاطر، بے جرم ضعیفی وغیرہ خالصتاً صنف نازک پر لکھے گئے افسانے ہیں، ان کا مرکزی کردار صنفِ نازک سے مستعار ہے۔

☆ شاعری تو اچھا خاصا تکنیکی کام ہے آپ نے اس پر کب اور کیونکر دسترس حاصل کی؟

☆☆ شاعری بھی اظہار کا ایک پیرایہ ہے۔ بقول کنڈیرا: ادیب کے پیٹ میں ایک کیڑا ہوتا ہے۔ جو اسے اس وقت تک مروڑ میں مبتلا رکھتا ہے جب تک کہ وہ اپنی بات کہہ نہ دے۔ تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ بات شعر میں کہہ دینے سے یہ مروڑ

ختم ہوا ہے۔ایک اچھے شعر کے دو مصرعوں میں جو افسانہ بیان ہوسکتا ہے اس کے لیے آٹھ صفحے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔مثلاً ہمدمِ دیرینہ 'شوکت فہمی' کا یہ شعر :

اک عمر تک میں اس کی ضرورت بنا رہا
پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی

تو اس شعر میں جو کہانی شوکت نے اتنی خوبصورتی سے بیان کر دی، وہ شاید پورے افسانے میں بھی تشنہ رہتی۔میری بنیادی پہچان افسانہ نگاری ہے، لیکن شاعری بھی گاہے گاہے اظہارِ مدعا کے لیے استعمال ہوئی ہے۔پہلا مجموعہ ''دامِ خیال'' آغا نثار صاحب کے سرورق کے ساتھ اس وقت زیرِ اشاعت ہے، اگست کے آخر میں بازار (کتابوں کے) میں مہیا ہوگا۔فن شعر گوئی میں پہلے مامون ایمن صاحب اور پھر رفیع الدین راز صاحب کی رہنمائی حاصل رہی۔شوکت فہمی کے مشورے بھی شاملِ شعر رہے۔

☆ جو صاحب اچھے شعر کی چار خوبیاں بیان کرتے ہیں اُس پر آپ کا کلام کس قدر پورا اُترتا ہے؟

☆☆ اگر آپ ان کا پورا بیان پڑھیں تو علی اکبر ناطق نے مثالوں سے یہ بات واضح کی ہے کہ میری شاعری ان چاروں شرائط پر کہاں تک پوری اترتی ہے۔ناطق نئے لکھنے والوں میں (عمر کے حساب سے) صفِ اول کے لکھاری ہیں۔انہوں نے نظم، افسانہ اور ناول نگاری ہر فن میں اتنے کم وقت میں اپنے آپ کو منوایا ہے۔

☆ موقعہ کی مناسبت سے اس شعر کے مخاطب پر کچھ روشنی ڈالئے

میں اپنے ساتھ بھی چلتا کہاں تک
ہر اک رستہ تمہاری یاد کا ہے

☆☆ مخاطب خود اپنی ذات ہے، کہ مقابلہ خود اپنے آپ سے ہی ہے۔سفر کے اختتام تک ساتھ صرف اپنی ذات ہی دیتی ہے۔پھر لکھنے والا سب سے زیادہ خود اپنے ضمیر کو جوابدہ ہوتا ہے۔اس میں بعض اپنے جانے بوجھے رستوں سے ہٹ کر رستہ نکالنا پڑتا ہے۔مزا تو جب ہے کہ لکھنے والا خود اپنے آپ کو پیچھے چھوڑ دے۔

☆ آپ نے مغرب میں مقیم اردو افسانہ نگاروں کا ایک انتخاب بھی کیا تھا۔انتخاب کے معیار اور تخلیقات کے جانچنے پرکھنے کے طریقے سے آگہی کی خواہش فطری بات ہے؟

☆☆ یہ آپ کی آگہی کی فطری خواہشات بہت جان لیوا ہیں۔اس کو جانچنے کا صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ کہ تحریر میرے دل میں اتر جائے۔میں نے جتنے بھی ترجمے کیے ہیں سب وہی ہیں جنہوں نے مجھ سے گفتگو کی ہے، اپنی طرف کھینچا ہے۔کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسّی فیصد وقت پڑھنے میں اور دس سے بیس فیصد لکھنے میں خرچ ہو۔تو جو پڑھتا ہوں اس میں سے شاید ایک فیصد ترجمہ کے لائق بنتا ہے۔پھر یہ بھی کہ وہ ترجمہ ہو کر اپنی کشش برقرار رکھے۔بعض تخلیقات کتنی بھی پسند آئیں، ترجمہ ہو کر اپنا حسن کھو دیتی ہیں، مثال کے طور پر پڑھیے مرزا اسداللہ خان غالب کو!

☆ تراجم کی جانب آپ کی طبیعت کب اور کیونکر مائل ہوئی اور اب تک آپ نے کتنے اہلِ قلم کو اردو میں منتقل کیا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں تراجم نئی ذہنی وسعت پیدا کرتے ہیں۔اردو میں دوسری زبانوں سے تراجم ہوئے ہیں لیکن بہت کم۔اب تک مغربی افسانہ نگاری دو بڑے قبیلوں میں منقسم تھی؛ موپاساں اور چیخوف۔موپاساں اور ان کی حقیقت نگاری، چیخوف اور ان کے افسانوں میں غلط نمبر کی عینک لگا کر پڑھنے کا احساس۔اب ایک تیسری طرز جنم لے رہی ہے، اور اس کا ماخذ پوسٹ کالونیل معاشرہ ہے۔اس کا سہرا کسی ایک افسانہ نگار کے سر پر نہیں باندھا جاسکتا، بلکہ عموماً جنوبی امریکہ کے لکھاریوں کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ہم تو خود بھی ایک کالونی رہے ہیں۔جہاں جہاں کالونیوں کو آزادی ملی، وہاں مخصوص سماجی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل نے سر اٹھایا۔پھر جنوبی امریکہ میں بھی ضعیف الاعتقادی بہت ہے۔اس سب گڑبڑ سے فائدہ اٹھا کر مارکیز، پبلو نرودا، ماریو ورگاس لوسا، بورخیس وغیرہ نے عظیم ادب تخلیق کیا۔اب اس کا اثر دوسرے علاقے کے لکھاریوں مثلاً جاپان کے مورا کامی کی تحریر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔یہ تحریریں اتنی عجیب، اتنی دلکش اتنی دلنشیں ہیں کہ انہیں پڑھ کر اپنے ہاں کے لکھنے والوں سے شیر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔سنگین مسائل کے افسانوں میں بھی ان کا اثر خوشگوار رہتا ہے۔دنیا کے پڑھنے والوں کے لیے یہ ایک نئی دریافت ہے۔پھر انہوں نے مافوق الفطرت کو ایک ڈیوائس کے طور پر استعمال کیا ہے جو حیرت انگیز حد تک فریش ہے۔اب تک دو درجن کے قریب لکھنے والوں کا ترجمہ کر چکا ہوں۔

☆ جو لوگ آپ کے ناول ''گرداب'' کو آپ بیتی سے تشبیہہ دیتے ہیں اُن سے اتفاق یا اختلاف میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

☆☆ ہاں یہ ان خاندانوں کی آپ بیتی ہے جو بہتر مستقبل کی تلاش میں سمندر پار کر کے امریکہ گئے اور اچانک اس تصادم میں پھنس گئے جسے تہذیبوں کی جنگ کہا جارہا ہے۔اور یہ محض ہمارے ساتھ ہی نہیں ہوا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقی مسلمانوں یہاں تک کہ داڑھی کی وجہ سے سکھوں کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔خاص طور پر وہ تارکین وطن جو غیر قانونی طور پر یہاں مقیم تھے، وہ از خود ردِ عمل کے خوف سے گھر بار، کاروبار، سب چھوڑ کر چلے گئے۔اس کہانی میں میری کوشش تھی کہ ان کی کہانی بیان ہو، اور پھر حتی المقدور اس حادثے کی اردو میں غیر جانبدارانہ تاریخ قلمبند ہو جائے۔

☆ ایک صاحب نے آپ کے ناول ''گرداب'' میں آپ کو پُل صراط سے گزرنے میں ناکام کن معنوں میں گردانا ہے؟

☆☆ یہ جنت اور دوزخ کی کہانی نہیں۔میں اپنے اعتقاد (یا عدم اعتقاد)

میں بہت پختہ ہوں، اور اپنی کھال میں بہت مطمئن اور امریکہ پر حملہ کرنے والے انتہاپسندوں کو جنت اور دوزخ سے تعبیر کرنا فکر کی غربت ہے۔

☆ آپ کے ناول ''گرداب'' میں امریکن پولیس اور دیگر اداروں کی کرپشن کا جو ذکر کیا گیا ہے بہت سے لوگوں کے نزدیک باعث حیرت ہے۔ مختصر طور پر امریکی معاشرے کا تجزیہ کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

☆☆ اس دنیا یاترا میں جو بات میں نے بہت زیادہ محسوس کی وہ انسانی جذبوں، رشتوں، لالچ، حسد، رشک، رقبت کی یکسانیت ہے۔ یہ جذبے سرحدیں نہیں پہچانتے، انہیں کوئی پاسپورٹ درکار نہیں۔ انسانی ضروریات اور احساسات نہایت سادہ لیکن پیچیدہ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ امریکہ میں قانون کی حکمرانی ہے، ہمارے ہاں لاقانون کی حکمرانی ہے۔ یہاں سب کو معلوم ہے کہ پکڑے جائیں تو بچ نہیں سکتے۔ اس وقت بھی نیویارک اسمبلی کا اسپیکر، شکاگو کا سابق گورنر، ریپبلیکن پارٹی کا ایک سابق سربراہ، ٹیکساس کا کانگریس مین جیل میں ہیں یا جانے والے ہیں۔ رات کے تین بجے بھی ٹریفک کے سگنل کی مکمل پابندی ہوتی ہے، اس لیے لالچ بہت مہنگی پڑتی ہے۔ یہ ملک بھی آپ اور مجھ جیسے لوگوں سے ہی آباد ہے۔ پانچوں انگلیاں کہیں بھی برابر نہیں ہوتیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ امریکہ میں کرپشن آٹے میں نمک کے برابر ہے، ہمارے ہاں نمک میں آٹے کا تناسب ہے۔

☆ آپ نے اپنی تخلیقات میں اس حوالے سے کافی کچھ کہا ہے اگر ہم اس تصادم یا ٹکراؤ کے انجام کی بابت آپ سے دریافت کریں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ کس تصادم یا ٹکراؤ کے انجام کا ذکر کر رہے ہیں۔ اگر تہذیبوں کے تصادم کی بات ہے تو ہماری ہار یا جیت ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس میں مد مقابل کی کمزوری یا برتری کا ذکر نہیں ہم خود اپنی شکست کے اسباب پیدا کرنے کے درپے ہیں، ورنہ یہ اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ امریکی توسیع پسندی تین سو سال پہلے کی برطانوی، فرانسیسی یا پرتگالی توسیع پسندی سے مختلف نہیں۔ امریکہ اپنی معاشی اور عسکری برتری کا دفاع کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتا ہے۔ بالکل جیسے جلیانوالہ باغ کے بعد جنرل ڈائر کو برطانوی پارلیمنٹ میں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ امریکہ بھی اپنے تحفظات کے تحفظ میں کسی دوست دشمن کو رستے سے ہٹانے میں نہیں ہچکچاتا۔ جرمن چانسلر انجلا مرکل کے سیل فون کی نگرانی اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ جہاں جمہوریت سے کام نکلتا ہے وہاں جمہوریت کا نعرہ اور جہاں آمریت امریکی مفادات کا تحفظ کرے وہاں آمریت کی حمایت۔ نائجیریا، فلسطین، مصر میں منتخب شدہ جمہوری حکومتوں کو اس لیے غیر مستحکم کیا گیا کہ وہ نظریاتی طور پر امریکہ مخالف حکومتیں تھیں۔ نیوکلیر ہتھیاروں کی موجودگی میں ہماری عسکری شکست غیر ممکن ہے۔ ہماری بدعنوانی اور چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی عادت ہمیں اقتصادی غلامی میں ضرور مبتلا کر چکی ہے۔ ہمیں ساتویں بحری بیڑے کا انتظار ترک کر کے پہلا بحری بیڑا خود بنانا ہے۔ جہاں تک دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کی بات ہے، تو یہ جنگ تو ہوئی ہی نہیں۔ جن دو تہذیبوں میں ٹکراؤ ہے وہ اصل میں میانہ رو، معتدل مسلمان اور انتہا پسند my way or high way گروہ ہے، جو اختلاف کی سزا موت کی صورت دیتا ہے۔ مسلمانوں کو امریکہ نہیں، خود مسلمان مار رہے ہیں۔

☆ نو گیارہ سے پہلے اور نو گیارہ کے بعد امریکی معاشرے میں کس طرح کی تبدیلیاں آئیں اور اُس کے نتیجے میں مسلم بلخصوص پاکستانی کمیونٹی کو کس طرح کے مسائل کا سامنا ہے؟

☆☆ نو گیارہ کے واقعے کے وقت بدقسمتی سے امریکہ میں ایک ناعاقبت اندیش گروہ حاکم تھا۔ ان کا ردِعمل جاہلانہ اور غیر منصفانہ تھا۔ اس واقعے سے سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل اور ہندوستان نے اٹھایا ہے۔ آزادی کی تحریکیں بدنام ہوئی ہیں۔ انگریزی کہاوت ہے کہ انہوں نے ٹب کے پانی کے ساتھ بچے کو بھی باہر پھینک دیا۔ فلسطین جسے سوائے امریکہ کے ساری دنیا کی حمایت حاصل تھی وہ کسی حد تک یہ حمایت کھو بیٹھا۔ لیکن پھر وہی irony سعودی عرب کسی حد تک بلاواسطہ اور نادان دوستی کی مثال نو گیارہ میں ملوث ہونے کے باوجود امریکی حلیف بنا رہا۔

پاکستانی اور دوسرے مسلمان کمیونٹی متاثر ہوئی ہے، لیکن فوری ردِ عمل کے بعد بہت قابلِ ذکر پیرائے میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ذرائع ابلاغ میں ان کے انخلا کی خبریں نہیں دیکھیں۔ لیکن پسِ پردہ مسلمانوں کی نقل و حرکت، اقتصادیات اور رابطوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں اس سے خلل نہیں پڑتا۔ عام نوکریوں میں اور ترقیوں میں بھی بہت زیادہ فرق نہیں پڑا سوائے حساس پوسٹوں کے۔ امریکہ نظریاتی طور پر جنوبی اور شمالی حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ میں امریکہ ملک کی بات کر رہا ہوں (شمالی اور جنوبی امریکی برِ اعظم کی نہیں)۔ جنوبی امریکی ریاستیں ہمیشہ سے زیادہ متعصب رہی ہیں۔ ان کے تعصب کا شکار یہودی، مسلمان، کالے سب ہی ہوتے ہیں۔ حجابی عورتوں اور باریش مسلمانوں کو یقیناً زیادہ مشکلات کا سامنا ہوا ہے۔

☆ نو گیارہ کے بارے جو قیاسے لوگ باگ لگا رہے ہیں آپ نے کبھی اُن کی بابت غور فرمایا ہے مثلاً یہ کاروائی آپ کے خیال میں کس نے کی اور وہ اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہا؟

☆☆ میں نے اپنے ناول کے لیے بہت سی کتابیں پڑھیں، اخباری آرٹیکل دیکھے۔ مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ یہ القاعدہ کا پلان تھا۔ جو لوگ اسے یہودی یا سی آئی اے کی سازش بتاتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان ابھی چاند پر نہیں اترا۔ القائدہ یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بعد سے امریکی سرزمین پر کسی نے براہ راست حملہ نہیں کیا تھا۔ القاعدہ کا مقصد توجہ حاصل کرنا تھا اس میں وہ کامیاب رہے۔ امریکہ کو ناقابلِ مرمت اقتصادی نقصان پہچانا تھا، اس میں وہ ناکام رہے۔ میرے خیال میں القاعدہ اس اسکیم میں exit strategy کے بغیر داخل ہوا

''چہارسُو''

تھا، جس کا انہیں بہت خمیازہ بھگتنا پڑا۔

☆ موجودہ عالمی منظرنامے بالخصوص مسلم ممالک کے خلاف امریکہ کے معتدانہ رویہ کو مذہبی کشاکش سے تعبیر کرنا مناسب ہے کیا؟

☆☆ امریکہ کا معاندانہ رویہ امریکی مفادات کا تابع ہے۔ یہ کسی مذہبی کشاکش، جمہوریت یا رشتہ داری کے خلاف نہیں۔ کویت، قطر، سعودی عرب، اردن، عمارات اور مصر وغیرہ سے امریکہ کے گہرے تعلقات ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کئی سخت اسلامی مذہبی روایات کے پابند ممالک ہیں۔ اس کے مقابلے میں پاکستان، ایران، صومالیہ، لیبیا وغیرہ سے امریکہ کے مشکل روابط کے پیچھے سیاسی حقائق کارفرما ہیں، مذہبی نہیں۔ اس کی تازہ مثال ایرانا امریکی معاہدہ ہے جو اسرائیل اور سعودی عرب کی مخالفت کے باوجود لاگو ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ جب بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی ہو رہی تھی تو یہ امریکی طیارے تھے جنہوں نے کرسچن فوجوں پر بمباری کر کے اس سلسلے کو رکوایا۔ امریکی رویہ اسلام دشمن نہیں، امریکی رویہ اپنی توسیع پسندی کا محافظ ہے۔

☆ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ، کینیڈا، برطانیہ میں تارکین وطن کے حوالے سے جو نئی قانون سازی ہو رہی ہے اُس کے ردِعمل میں ایک اور ریڈانڈین کمیونٹی کے خدشات سر نہیں اُٹھا رہے؟

☆☆ معاف کیجیے گا آپ کی اطلاعات مقامی اخبارات کے حوالوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ امریکہ یا کینیڈا میں تارکین وطن کے حوالے سے کوئی متعصّبانہ قانون سازی نہیں ہو رہی۔ وقتاً فوقتاً آبادی کے تناسب اور ورک فورس کے اعتبار سے امیگریشن کے قوانین میں ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً جب ڈاکٹروں کی کمی کا سامنا ہوتا ہے تو ان کی درآمد بڑھا لیتے ہیں، جب یہ کمی پوری ہو جاتی ہے تو سختی کر لیتے ہیں۔ یہ عمل تقریباً نصف دہائی کے دورانیے سے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ فرانس میں چہرے پر نقاب ڈالنے پر پابندی لگی ہے، لگنی بھی چاہیے۔ ان کے سیکیورٹی خدشات کو ذہن میں رکھیے اور خود کو ان کی جگہ رکھیے تو بات سمجھ میں آجائے گی۔ یہ معاشرتی دین کو سیاست میں دخل اندازی نہیں کرنے دیتا، یہ ان کے آئین کی خلاف ورزی ہے۔ امیگریشن پہلے یورپ سے زیادہ ہوتی تھی، پھر ایشیا سے ہونے لگی، پھر مشرقِ وسطیٰ سے اور اب جنوبی امریکہ سے۔ امیگریشن سے وابستہ قانون سازی کا محرک اقتصادی حقائق ہیں۔ ورنہ اب نیویارک اسٹیٹ میں تو اسکولوں میں کرسمس اور یہودی تہوار کے ساتھ عید کی تعطیل بھی ہوتی ہے۔ رمضان میں وائٹ ہاؤس میں ہر سال مسلمانوں کے ساتھ افطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ سب نمائشی اعمال ہیں لیکن ان کی symbolic حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

''بشرنوازی''

سید سعید نقوی کے افسانوں میں پوائنٹ آف ویو (Point of view) راوی، بیان کنندہ Narrator کا تنوع ہے یعنی ان کے بیانیے کو آپ ایک حد تک Polyphonic یا Poly vocatic کہہ سکتے ہیں۔ گویا یہ خصوصیات بالعموم ناول کے بیانیے سے منسوب کی جاتی ہیں۔ بیشتر مقامات پر وہ مضبوط آواز یا بیانیے میں مداخلت کرنے والے جملے مقتدر آواز کے برعکس استعمال کرتے نظر آتے ہیں جو بالعموم قاری سے براہِ راست خطاب ہوتے ہیں بلکہ بعض افسانوں سے اگر ان جملوں کو نکال دیا جائے تو کہانی کے معنوی تسلسل میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا البتہ افسانے کا مجموعی تاثر ضرور متاثر ہوگا۔ یہ مجموعی تاثر کا متاثر ہونا دراصل مصنف کی زبان کا متاثر ہونا ہے کہ ان جملوں کی معرفت مصنف نے اظہار کی جن ڈیوائس کو استعمال کیا ہے ان جملوں میں کہیں Irony، کہیں Paradox اور کہیں Satire کا استعمال ان کی تحریر کو ادبی صفت یا ادبیت سے مملو کرتی ہے۔

سید سعید نقوی کی زبان نہ کرخنداری زبان ہے اور نہ ہی کراچی کی زبان کا مغالطہ ان کی زبان سے ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان خالصتاً ادبی زبان ہے اور ایک باشعور افسانہ نگار کی طرح سعید نقوی کو بھی علم ہے کہ افسانے کی زبان میں ادبیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے۔

بحیثیت ادیب سید سعید نقوی کے نقطہ نظر کو بشر دوستی یا بشر نوازی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک انسان دوست، ادیب، شاعر، ناول نگار اور مترجم ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج تو ہے ہی اُن کا اور آنے والا کل بھی سید سعید نقوی کا ہی ہوگا۔

عقیل روبی

عصری زندگی کی تصویر کشی

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

آج کے ممتاز امریکی فکشن نگار اور نقاد رچرڈ روسو (Richard Russo) نے بغیر حوالہ دیے کسی افسانے کے دو کرداروں، باپ اور بیٹے کا ذکر کیا ہے۔ دونوں افسانہ نگار ہوتے ہیں۔ باپ جس نے بڑی عمر میں افسانے لکھنے شروع کیے، افسانہ نگاری کو خواب دیکھنے اور دکھانے کے مماثل گردانتا ہے جبکہ بیٹے کے خیال میں افسانہ شہد کی مکھیوں سے بھرا مرتبان ہے۔ ڈھکن کھلا اور شہد کی مکھیاں باہر۔ رچرڈ روسو شہد کی مکھیوں کے ڈنکوں کی سوزش، حدت اور سوجن کا ذکر کرتے ہوئے اس خصوصیت پر زور دیتا ہے کہ ایک اچھا افسانہ، قاری کو اچانک ڈنک مار کر حیران کر دیتا ہے اور ڈنک کی چبھن میں ایک نوع کی تیکھی لذت سے آشنا کر دیتا ہے۔

اگرچہ ڈاکٹر سید سعید نقوی نے افسانہ نگاری کا آغاز خاصی پختہ عمر میں، تاخیر سے کیا لیکن خواب دیکھنے اور دکھانے کی جگہ شہد کی مکھیوں سے بھرے ہوئے مرتبانوں کے ڈھکن کھولنے کو ترجیح دی۔ ان کا افسانہ زندگی کی تنقیدی تصویر کشی ہے۔ یہ تنقید طنز سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ تجاوز کر کے سٹائر (Satire) کا روپ نہیں ڈھارتی۔ نیشن سوزن رہتی ہے نیش عقرب نہیں بنتی۔

میں نے جب ان سے سوال کیا کہ وہ کردار اساسی افسانے لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں یا پلاٹ (وقوعہ) اساسی، تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ موضوعاتی افسانے لکھتے ہیں لیکن شگفتہ انداز میں۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام ''نامہ بر'' اس حقیقت کا ابلاغ کرتا ہے کہ افسانہ نگار قاری تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے کا نام ''دوسرا رخ'' قاری کی توجہ ہمارے اطراف پھیلی ہوئی معاشرتی زندگی کی جانب مبذول کرتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ تصویر کے ایک رخ کو دیکھنے پر اکتفا نہ کریں، دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ کتاب دوسرا رخ کے آغاز میں دو ماسک مکھوٹے دکھائے گئے ہیں۔ آگے کا مکھوٹا منہ پھاڑ کر ہنس رہا ہے تو عقبی مکھوٹا حلق پھاڑ کر رو رہا ہے۔ دونوں مل کر انسانی زندگی کے دو متضاد رخوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ زندگی خوشی اور غم کا سادہ آمیزہ نہیں بلکہ کیمیائی مرکب ہے۔ جس طرح ہائیڈروجن اور آکسیجن کا کیمیائی مرکب پانی ہے عین اسی طرح خوشی اور غم کا کیمیائی مرکب انسانی زندگی ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے بیانیے اور زبان پر بات کرنا اس سبب سے ضروری ہے کہ انہیں افسانے کے بہانے زندگی اور اس کے متنوع عوامل اور انسانی معاشروں (مشرقی، مغربی، ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پست) پر ناقدانہ اور طنزیہ انداز میں رائے زنی کا شوق نہیں۔۔۔ ہوکا۔۔۔ ہے۔ اسی شوق اور ہوکے کے زور پر وہ اپنے افسانے کا شہد کی مکھیوں بھرا مرتبان کھولتے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ ''غبارِ خاطر'' کے مولانا ابوالکلام ہیں اور نہ ہی ''آبِ حیات'' کے محمد حسین آزاد۔ ان کی زبان کرخنداروں کی تو نہیں البتہ پاکستان کے بڑے تجارتی شہر کراچی کی اردو ہے جس پر لیاری کا تڑکا بھی لگا ہے۔ یوں بھی ڈاکٹروں کی زبان کا کیا ٹھکانہ! ان کے افسانوں کی زبان سے یہ ضرور عیاں ہوتا ہے کہ وہ رواں، فصیح اور اچھی سے اچھی اردو لکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

''جوانی سب پر آتی ہے مگر بعض پر ایسی کہ نظر جما کر دیکھ لو تو ایمان ہاتھ سے جاتا رہے۔۔۔''

''عبدالحق سے اسے بہت الجھا دینے والے سگنل ملتے۔۔۔ تجھے یہ ڈر نہیں یہ جسم جہنم میں جلایا جائے گا'' عبدالحق نے جہنم میں جلنے والے اس جسم کا ایسے بغور معائنہ کیا جیسے جلنے سے پہلے آخری دفعہ دیکھ رہے ہوں (مولوی عبدالحق)

''مرنے کا شوق ہے تو ٹرین کے آگے کود کہ نہ تو وہ وقت پر آتی ہے اور نہ وقت پر جاتی ہے اور نہ ہی وقت پر رک پاتی ہے۔۔۔ غبارہ پھولتا رہے اور پھر اچانک ایک سوئی کی نوک لگے اور بوم۔۔۔ بغیر محنت کے پھل سے کم ہی لوگ پرہیز کرتے ہیں۔۔۔ خوشی اپنے وقت سے آتی ہے ہمارا کیلنڈر نہیں دیکھتی۔۔۔ تاریخ کے جو باب تاریک ہوتے ہیں انہیں یا تو ہم بند کر دیتے ہیں یا ان میں Spin پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر کیا نابینا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ (سودوزیاں)

''رات کے سناٹے کی اپنی ایک آواز ہے خامشی سے بالکل علیحدہ۔۔۔ باورچی خانے سے دو فرنچ نسل کے دروازے باہر باغیچے میں کھلتے تھے۔ یوں تو یہ دروازے بہت کارآمد ہوتے ہیں دونوں پاٹو پاٹ کھل جاتے ہیں۔ بڑے اسکرین کے ٹی وی سے لے کر صاحبِ خانہ کی میت تک گزار لیجیے۔۔۔ نوجوان نے چاقو اپنے ہاتھ میں ذرا سامنے کی رخ پر رکھا کہ اس کا فاصلہ میری ہمت سے بمشکل ایک فٹ رہا ہوگا۔۔۔ بس اتنا دے دیجیے کہ پھر چوری کا کھٹکا نہ رہے۔ مرزا تو رہزن کو دعا تک دیتے تھے۔۔۔ غریب جرنلسٹ کو عموماً صلیب انعام میں ملتی ہے۔۔۔ بے محل شعر پڑھنے والوں کو میں ویسے بھی قابلِ دست اندازیٔ پولیس سمجھتی ہوں۔۔۔ (چور)

''سوال کا جواب سوال سے دیجیے، آزمودہ نسخہ ہے۔۔۔ میرے پاس قابلِ فروخت دلائل کی کمی تھی''۔۔۔ (نگینہ)

''اور یہی خود بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا'' منظر تھا کچھ اور، انہیں کچھ اور نظر آتا رہا۔۔۔ (چشمِ حیران)

''بہت سے دیسی گوری خواتین سے ۱۸۵۷ء کی توہین کا بدلہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں''۔۔۔ (آٹو ورکشاپ)

''منہ تو چارے کی بالٹی میں تھا مگر آنکھیں ماتھے پر دھرتی تھیں''
---(بے لگام)

''کامیابی اپنا ثبوت خود ہوتی ہے''---(پلے بوائے)

''سارا شہر ایک اجتماعی نیند سو رہا ہے''---(صبح کا بھولا)

''کتنی خواہشیں برقع اوڑھے پھر رہی ہیں''---(شمشان گھاٹ)

''قیمت چیز کی نہیں بلکہ اس کے حوالے اور وابستگی کی ہے''---
(تعلقِ خاطر)

''کچھ خود ساختہ سماجی کارکنوں کا کہنا تھا کہ برائیاں کم نہیں ہوئیں اندرون ہوگئی ہیں''---(گرگٹ)

مندرجہ بالا اقتباسات کو پڑھنے کے بعد آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے بعض فقرے انگریزی سے مستعار ہیں۔

''میرے پاس قابلِ فروخت دلائل کی کمی تھی''

''کامیابی اپنا ثبوت خود ہوتی ہے''

''فرنچ نسل کے دروازے''

ان کے کچھ فقرے کہاوتوں اور ضرب المثل کا مزاج رکھتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کو حکمت و دانش کے جواہر پارے کہا جا سکتا ہے۔

''بغیر محنت کے پھل سے کم ہی لوگ پرہیز کرتے ہیں''

''گفتگو میں پہل کرنے سے اکثر کمزور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں''

''خوشی اپنے وقت سے آتی ہے، ہمارا کیلنڈر نہیں دیکھتی''

''تاریخ کے جو باب تاریک ہوتے ہیں، انہیں یا تم ہم بند کر لیتے ہیں، یا ان میں Spin پیدا کر دیتے ہیں''

''کیا نابینا خواب دیکھ سکتے ہیں''

''یہ بتایئے پکڑے گا کون؟ پکڑنے والے کے آگے پیٹ نہیں لگا کیا''

''سوال کا جواب سوال سے دیجیے''

ڈاکٹر صاحب نے کہیں کہیں اپنے بیانیے کو شعر و ادب کے حوالوں سے پُر لطف بنا دیا ہے:

''بہت سے دیسی گوری خواتین سے ۱۸۵۷ء کی توہین کا بدلہ لینے پر آمادہ رہتے ہیں۔(ن۔م۔راشد کی نظم کا حوالہ)

''بس اتنا دے دیجیے کہ پھر چوری کا کھٹکا نہ رہے۔ مرزا تو رہزن کو دعا تک دیتے تھے۔

(مرزا غالب کے مشہور شعر کا حوالہ: رہا کھٹکا نہ چوری کا---دعا دیتا ہوں رہزن کو)

افسانے کے تشکیلی عناصر میں پلاٹ اور کردار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض افسانے بڑی حد تک کردار اساسی ہیں جیسے گرگٹ، پلے بوائے، آٹو ورکشاپ، شمشان گھاٹ، نگینہ اور صبح کا بھولا۔ ان میں آخر الذکر تین افسانوں میں کرداروں کی کشمکش یا دیگر معاملات الجھا دیے گئے ہیں۔ یوں بھی کردار اساسی افسانے سطحی، سپاٹ اور تہہ داری سے محروم ہوں تو خاکوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانوں میں کردار گوشت پوست سے تشکیل پاتے ہیں کارڈ بوائے کردار نہیں ہوتے، نہ ہی سطحی خارجی، یک رخے ہوتے ہیں۔ ''گرگٹ'' کا مولوی مشتاق گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے والا آدمی ہے۔ دنیا مشرق ہو یا مغرب کسی زمانے میں مولوی مشتاق جیسے لوگوں سے خالی نہیں رہی اور نہ رہے گی۔ ایسے لوگوں کے لیے کہا گیا ہے ''چوں بہ خلوت می روند آن کارِ دیگر می کنند'' اس ٹائپ کے کردار کو افسانہ نگار نے زندہ 'فلش اینڈ بلڈ' کردار میں تبدیل کر کے اپنی تکنیکی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مولوی مشتاق کے مقابلے میں ''آٹو ورکشاپ'' کا چوہدری افتخار ٹائپ کردار کم ''راؤنڈڈ'' کردار زیادہ ہے۔ اس میں آٹو ورکشاپ مکینک کی عادات، حرکات و سکنات کے علاوہ دیسی آدمی کی کمزوریاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور یہی اس کو الم ناک موت سے دو چار کر دیتی ہیں۔ ''پلے بوائے'' کا فراز اپنی اصلی شخصیت سے قطعی مختلف اور متضاد شخصیت کا نقاب (ماسک) اوڑھے ہوئے ہے۔ شمشان گھاٹ کی ''میں'' ایک پیچیدہ کردار ہے جو کرداروں کی دنیا میں اپنی انوکھی انفرادیت تسلیم کرواتا ہے۔ اس ''میں'' کا اشتراک یا تصادم جن کرداروں سے دکھایا گیا ہے وہ پیشے کے لحاظ سے محترم ہیں۔ ایک استاد ہے تو دوسرا ڈاکٹر۔ ''میں'' ان دونوں کی بیک وقت ہدف بھی ہے اور شکاری بھی۔ ''میں'' ان دونوں کو بے نقاب بھی کرتی ہے اور ان دونوں سے بے نقاب بھی ہوتی ہے۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ میں ان دونوں کی تکمیل کرتی ہے جب کہ ان دونوں کو اس کی با اعتبار پیشہ اصلاح اور تکمیل کرنی چاہیے تھی۔ ''نگینہ'' اور ''صبح کا بھولا'' کردار کے مطالعہ پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک کرداروں کے مطالعے کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب کے سبھی افسانے اس دائرے میں آتے ہیں۔ ان میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جن کے کردار جانور ہیں، جیسے افسانہ ''بے لگام'' کے گھوڑے یا ''طائرِ لاہوتی'' کے بندر۔ ''بے لگام'' پڑھنے کے دوران آپ اکثر و بیشتر گھوڑوں کی حیوانیت کو آدمیوں کی بشریت کے مقابل ہی نہیں بلکہ متبادل سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ خیال رکھیے کہیں اس افسانے کے زیرِ اثر آپ کو ہر آدمی کے اندر اک گھوڑا ہنہناتا نظر نہ آنے لگے جس طرح سندھ کے دتا یو فقیر کو آدمیوں کے اندر جانور دکھائی دینے لگے تھے اور وہ ان سے محفوظ رہنے کے لیے ایک پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔

امریکہ میں ابراہام لنکن کے جرأت مندانہ اقدامات کے طفیل غلامی کا خاتمہ ہوا تو ساتھ ہی اس ملک میں بسنے والے کالوں پر گوروں کی برابری کے دریچے وا ہوئے۔ لیکن گوروں کے بطون میں سمائے ہوئے رنگ و نسل کی اساس پر قائم و دائم ''گورا امتیاز'' (White Superiority) کا بیج و بُن سے اکھاڑا جانا آسان ثابت نہیں ہوا۔ ''بے لگام'' یوں گورا امتیاز کے موضوع پر ایک شاندار افسانے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس افسانے کی کئی جہتیں ہیں۔ یہ ایک

کامیاب موضوعاتی افسانہ (Thematic Story) ہے۔ مطالعہ کردار کی ایک اور دلآویز صورت ہے۔ یہ پلاٹ اساسی افسانہ ہے۔ اس میں ایک بنیادی پلاٹ کے علاوہ، ایک سے زائد ثانوی پلاٹ دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ بنیادی کہانی میں شمالی فلوریڈا میں جارج کے چھوٹے سے رینچ یا اصطبل میں ایک سفید گھوڑی کے علاوہ تین گھوڑے بندھے تھے۔ درجہ بندی کے مطابق ان میں ایک نمبر سفید رنگ کا نوجوان اور تیز وطرار گھوڑا، بے حد مغرور ہونے کے ساتھ ''گوراامتیاز'' کا حامل تھا۔ اس کے برخلاف سفید گھوڑا نمبر دو منکسر المزاج، لبرل، انصاف پسند اور نرم خو تھا۔ تیسرا گھوڑا جو کسی نہ کسی طرح ان دو سے ہل مل گیا تھا، کالا تھا۔ وہ مرنجاں و مرنج طبیعت کا تھا۔ یوں بھی وہ اپنے سیاہ رنگ کی احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دبا دبا سا رہتا تھا۔ ان تین گھوڑوں کے درمیان ایک سفید گھوڑی نسائیت کی رول ماڈل تھی۔ وہ اپنی نسائیت کو کسی ایک گھوڑے یا رنگ ونسل کے امتیاز سے ملوث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے انفرادی فیصلے خود کرتی اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں تامل کرنے کی روادار نہیں تھی۔ کہانی کے آغاز کے مرحلے پر ان چاروں میں امریکی ''ملٹی کلچرل'' آپسی برداشت، رواداری، لین دین (Give and Take) جو کچھ بھی کہا جائے، رسان سے جاری تھا کہ پانچویں گھوڑے کی اصطبل میں آمد (انٹری) ہوئی اور توازن بگڑ گیا۔ اس افسانے کا پلاٹ دو بڑے تکونوں پر مشتمل ہے۔ اہم ترین تکون میں اصطبل کے مالک جارج کی جوان بیٹی لوسی مرکز اور محور ہے، جبکہ ایک جانب سفید گھوڑا نمبر ایک جو افسانے کا ولن ہیرو ہے، دوسری جانب دھاریدار گذوڑا، نووارد واجنبی لیکن لوسی کی توجہ کا نیا سا جھے دار یا حقدار۔ یہ لوسی وجہ نزاع (Bone of Contention) اور سفید گھوڑے نمبر ایک کی اموات کے المیے پر ختم ہونے والا تکون ہے۔ دوسرا سفید گھوڑے نمبر ایک، دھاریدار گھوڑے اور سفید گھوڑی پر مشتمل ہے۔ اس تکون میں دھاریدار گھوڑا ہیرو، سفید گھوڑی ہیروئن اور سفید گھوڑا نمبر ایک ولن کے روپ میں نمودار ہوتے ہیں ان تکونوں کے علاوہ پلاٹ کی ایک اور شکل سامنے آتی ہے جس میں دھاریدار مہاجر (Immigrant) ہے۔ سفید گھوڑا نمبر ایک، سفید گھوڑا نمبر دو، اسپ سیاہ اور سفید گھوڑی فرزندان ودخترِ زمین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس پلاٹ میں سفید نمبر ایک متعصب، رنگ ونسل، سازشی، شر پسند اور دہشت گرد کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ہندو پاک کے دیہاتی رومانس کی رو پر بھی ایک پلاٹ ابھرتا ہے جس کے مطابق دھاری دار پردیسی بامی، سفید گھوڑی گاؤں کی گوری اور سفید گھوڑا نمبر ایک رقیب رو سفید ہے۔

عالمِ حیوانات سے متعلق دوسرا افسانہ موضوعی ہے جس کا مرکزی خیال بظاہر علامہ اقبال کے مندرجہ شعر سے ماخوذ ہے:

اے طائرِ لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

فرق صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے افسانے میں کرداروں کے طور پر طائروں کی جگہ بندروں کو لیا ہے۔ اس افسانے میں ایک جانب غلامی کی زندگی کی تن آسانیاں تو دوسری جانب آزادی کی زندگی کی صعوبتیں ایک دوسرے کے مقابل دکھائی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے افسانوں کے موضوعات وسیع، کثیر الجہات اور انتہائی پیچیدہ اصلی زندگی سے لیتے ہیں، اس سبب سے ان کا پلاٹ ان کے قلم کی گرفت سے پھسل پھسل جاتا ہے اور ساتھ ہی یک موضوعیت کی ڈور بھی ایک سے زائد موضوعات کے جال میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ''طائرِ لاہوتی'' میں غلامی کے حصار سے باہر نکلے ہوئے بندر کو پہاڑی والے بندروں کی بارشِ سنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ زخمی ہو کر پسپا ہوتا ہے اور واپسی کے سفر کے دوران مر جاتا ہے۔ یہ پسپائی اور موت افسانے کو اصل موضوع، غلامی اور آزادی سے دور کر کے بندروں کے جتھے کی صورت زندگی گزارنے کی جبلت سے الجھا دیتی ہے۔ اس جبلت کے زیرِ اثر پہاڑی والے بندر اپنے جتھے میں کسی اجنبی بندر کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ جبلت بندروں تک محدود نہیں تقریباً سارے جانداروں بہ شمول حضرت انسان، کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی نے اپنے افسانوں میں نت نئے تکنیکی تجربوں کو راہ دی ہے اور طرح طرح کے ڈیوائسس (Devices) سے کام لیا ہے۔ ''چور'' میں آئینہ، ''چشمِ حیراں'' میں فلم بین اور ''سود زیاں'' میں جن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ان کی یہ کوششیں لائق تحسین ہیں۔ آرٹ کے ساتھ کرافٹ بھی جدت طرازی اور تازہ کاری کا طالب رہتا ہے۔

قارئین میں بہت کم کو یہ ادراک ہوتا ہوگا کہ افسانہ نگار اپنے افسانے کو کاغذ پر لانے کے دوران کیسی کیسی تکنیکی دشواریوں سے عہدہ برا ہوتا ہے۔ اس غریب کو اپنے ہر افسانے کے موضوع، مرکزی خیال کے مطابق کہانی گھڑنی یا اپنے اطراف پھیلی ہوئی زندگی سے مستعار لینی پڑتی ہوگی۔ کہانی کی اساس پر وقوعہ یا واقعات کا تعین کرنا پڑتا ہوگا۔ جیتے جاگتے لوگوں جیسے کردار تخلیق کرنے پڑتے ہوں گے۔ ان کو زندگی گزارنے کے لیے ایک چھوٹی یا بڑی دنیا (Locate) دینی پڑتی ہوگی اور پھر ان کی زندگیوں کو مناسب اتار چڑھاؤ، مناسب منظر نگاری اور مکالموں کی مدد سے اصل زندگی کا تاثر ودیعت کرنا پڑتا ہوگا کہ قاری اس پیشکش کو حقیقی تسلیم کر لے اور سسپینشن آف ڈس بیلیف (Suspenson of Disbelief) کا جادو قاری کو مسحور کر لے۔

میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ چند ایک سینئر اہلِ نقد ونظر نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ علامتی افسانے کی رخصتی یا نیم رخصتی کے بعد افسانہ لکھنا آسان ہو گیا ہے۔ یہ محض ایک قیاس ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج افسانہ لکھنا پہلے سے زیادہ مشکل ہے۔ افسانہ نگار اگر اپنے مشاہدہ، حیات کا نچوڑ قاری تک پہنچانا چاہے تو علامت، رمز، ایمائیت، تجسیم، تجرید اور ابہام اس کی اعانت کرتے ہیں۔ ان سے گریزاں افسانہ اتنا زیادہ شفاف (Transparent) ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کو ایسا کرنے کے لیے افسانے کی افسانویت کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

قدرت کا تخلیقی عمل (تخلیق کائنات سے لے کر رحمِ مادر میں جنین کی پرورش تک) نیم روشن، نیم تاریک فضا میں تکمیل پاتا ہے۔ علامتی، رمزیتی، تجریدی، نیم تجریدی اسالیب سے کہانی (No Story) کے مرحلے تک افسانہ نگار کو ایسی فضا دستیاب رہتی ہے۔ آج جو اچھا افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ نہ تو آسان ہے اور نہ ہی بے بضاعت۔ آج بھی معیاری افسانے تخلیق ہو رہے ہیں۔ اگر ہمارے نقاد نئے افسانوں کو پڑھنے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس میں افسانے کی صنف یا آج کے افسانہ نگاروں کی کوتاہیوں کا دخل نہیں ہے۔ آج بھی افسانہ اپنے اختصار کے باوجود عصری زندگی کی تصویر کشی کو حال سے ماضی میں، مستقبل میں دور تک پہنچا کر اس کو آفاقیت کی وسعتوں، بلندیوں اور گہرائیوں سے روشناس کر رہا ہے۔ میں نے افسانوں کے معاملے میں بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ اس تلخ اور اندوہ ناک حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ آج کے اکابر نقاد افسانوں کی کتابوں کا مطالعہ تو رہا ایک طرف، ورق گردانی کے بھی روادار نہیں۔ آج کے افسانے کا المیہ یہ ہے کہ افسانہ بہت آگے، تنقید بہت پیچھے ہے۔ اردو افسانے کو مغربی ممالک کے افسانے کے مقابل رکھا جائے تو اس کی کمزوریوں کا ادراک ہمیں صورتِ حال پر ہمدردانہ غور کرنے پر مائل کرتا ہے۔ پاکستان کے معاشرے میں روز افزوں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی، منقسم عوام، مقتدر طبقے، کالے انگریزوں اور سرکار کی انگریزی نوازی اور سرپرستی اور ہندوستان میں رسم الخط کی ٹیڑھ اردو افسانے کی ترقی کی راہ میں حائل بظاہر ناقابلِ تسخیر سنگ ہائے گراں ہیں۔ مجموعی طور پر جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ حوصلہ شکن ہے۔ اس کے باوجود آج کا اردو افسانہ اعلیٰ ادبی معیاروں کے جس قدر قریب ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کا یہ دوسرا افسانوں کا مجموعہ ان کے شاندار تخلیقی کارناموں کا نقیب ہے، انتہا یا نقطۂ عروج نہیں۔

☆

''پھول ہی پھول''

ڈاکٹر سید سعید نقوی نے اپنے افسانوں کے نئے مجموعے ''دوسرا رُخ'' میں اپنی اس طمانیت کا اظہار کیا ہے کہ پہلے مجموعے ''نامہ بر'' کے جواب میں ہر طرف سے پھول ہی پھول آئے۔ ان پھولوں سے وہ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھے بلکہ بعد کے افسانوں کو اردگرد کے تجربات سے نکھارتے رہے۔ کسی تخلیق کار کا مثبت رویہ یہی ہوتا ہے۔ اپنی تحریر سے مطمئن ہو کر بیٹھ جانا، اُس کی تخلیقی صلاحیت کو زنگ لگا دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ وہ افسانے لکھتے رہے اور اپنے افسانوں کا اگلا مجموعہ ''دوسرا رُخ'' لے آئے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں مشاہدہ تیز اور تخلیقی نکھار پن ہے۔ کسی افسانوی مجموعے پر مجموعی طور پر رائے دینا آسان نسخہ ہوتا ہے۔ مثلاً: ''آٹو ورکشاپ'' میں گاڑیوں کے ماڈلز، انجن اور پرزوں کے ذریعے معاشرے کی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ ''چور'' نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔ اس افسانے کی اہم خوبی اس کی معنویت اور نفسیاتی ٹریٹمنٹ ہے۔ ''چشمِ حیراں'' کا آغاز افسانوی کم لگتا ہے۔ اس افسانے میں جانوروں کے ذریعہ بات کہی گئی ہے۔ ''دوسرا رُخ'' جذباتی اور سوگوار کر دینے والا افسانہ ہے۔ اس میں مغرب کی زندگی کے ایسے گوشے سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو عام طور پر پوشیدہ رہتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ جرأت مندانہ افسانہ ہے۔ ''مولوی عبدالحق'' مشرقی ماحول بالخصوص پاکستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں ایک سچا اور عمدہ افسانہ ہے۔ کہانی میں دریا کی سی روانی ہے جس میں مرکزی کردار مولوی عبدالحق کی مذہب کے لبادے میں حیوانی خصلت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ افسانہ ڈاکٹر سید سعید نقوی کا نمائندہ افسانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ''مسابقت'' ایک مختصر اور بھرپور افسانہ ہے۔ افسانہ نگار نے کرداروں کا نفسیاتی ٹریٹمنٹ نہایت کامیابی سے کیا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی اور مضبوط افسانہ ہے۔ ''نگینہ'' کا مرکزی کردار حور نامی لڑکی کو پسند کرنے کے لیے امریکہ سے آتا ہے۔ اُس کے حُسن اور دلآویز شخصیت کی تعریف میں ایک عمدہ فقرہ ملتا ہے کہ اُس کی موجودگی میں کمرے میں پاکیزگی کا احساس تھا۔

زیرِ نظر مجموعے میں ایک افسانہ ''صبح کا بھولا'' کا موضوع عام مشاہدے میں آتا ہے مگر ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ انسان شعوری اور لاشعوری طور پر کیا کیا بے ایمانیاں اور گناہ نہیں کرتا۔ اُسے کبھی یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ایسے اعمال سے ہماری عبادت قبول نہیں ہوتی۔ البتہ وضو اور نماز کے ارکان میں غلطی کا احساس اُسے فوری ہو جاتا ہے۔ ''رکھوالے'' بظاہر سادہ سا بیانیہ افسانہ ہے مگر پنجروں اور جانوروں کے حوالے سے اسے علامتی افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ معاشرے میں سب کی ہاں میں ہاں ملانے والوں کی اکثریت ہے۔ اسی حوالے سے اس افسانے میں بڑے پتے کی باتیں کہی گئی ہیں۔

طاہر نقوی

جسم وزباں کی موت سے پہلے

آصف فرخی
(کراچی)

دو پاٹن کے بیچ آ گئی ہے کہانی۔

چکّی چلتی رہتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی کا عمل بھی جاری ہے اور کہانی بھی روانی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔لیکن سعید نقوی کی نئی کہانیوں کو پڑھ کر یہ ایسا لگتا ہے کہ جہاں زندگی کا عمل جاری ہے اور اپنی رفتار سے مسلسل آگے بڑھتا جا رہا ہے، اسی قدر چکّی کے ان دو پاٹوں کے بیچوں بیچ پستے چلے جا رہے ہیں جس سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، کوئی امید بر نہیں آتی۔

زندگی کے بھاری بھرکم بوجھ تلے دبتے چلے جانے کا احساس ان کہانیوں میں دوگنا ہے، اس لیے کہ یورش بھی دو طرف سے ہے۔چکّی کا ایک پاٹ اردو افسانے کا ارتقائی سفر اور اس کا موجودہ مرحلہ ہے۔۔۔ میں اپنی بات اسی سے شروع کرنا چاہوں گا۔اس سفر کے مختصر دورانیے میں یقیناً اردو افسانے نے کافی کچھ حاصل کر لیا، زندگی کے اظہار کے نئے طریقے آزمائے، فنّی داؤ پیچ بھی سیکھے اور برتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یوں بھی ہونا چاہیے تھا کہ یہ کوشش ہمہ دم جاری رہے۔۔۔ جو ہاتھ آ گیا اس سے نئی، ان چھوئی اور اَن دیکھی منزلوں کے حصول کی حسرت بیدار ہو اور مائل بہ عمل رکھے۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔اس کے بجائے افسانہ نگاروں میں ایک خود اطمینانی سی آ گئی، انہوں نے ماندگی کا وقفہ بہت جلدی حاصل کر لیا اور آگے بڑھنے کے بجائے اپنے آپ کو دہرانے لگے اور اب تو یہ یقین بھی پختہ ہو چلا ہے کہ دریا کے اُترتے پانی کی طرح یہ قدم پیچھے جا رہے ہیں۔ایسے میں اردو افسانے میں نئی تخلیقی رو کی بات کیسے ہو اور افسانے کی جانب آنے والا نیا فن کار احساس زیاں اور شکست خوردگی کے آثار سے بچ کر کیسے لکھے؟ ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اندازہ ہے کہ سعید نقوی اس مشکل سے نبرد آزما ہوئے ہیں اور ان کی یہ مشکل ان کے افسانوں میں ایک ذیلی متن کے طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

حساس اور باشعور فن کار ہونے کے ناتے سعید نقوی جیسے افسانہ نگار کے لیے چکّی کا دوسرا پاٹ بھی موجود ہے اور وہ ہے مغربی افسانے کی ہمہ وقت موجودگی کا احساس جو افسانہ نگار کے طور پر ان کی وجودی صورتِ حال کا شاخسانہ ہے۔اردو افسانے لکھنا اور دیارِ مغرب میں رہنا ان کا دوطرفہ ماجرا ہے۔امریکا ہو یا انگلستان، ادب واشاعت کے ایوانوں میں یہ خیال عام ہے کہ افسانہ نسبتاً کم تر صنف ہے، اور اس لیے ثانوی اہمیت کی حامل۔کہانی اصل اور بنیادی صورت رکھنے کے باوجود ناول کے سامنے دب کر رہ گئی ہے۔مغربی معاشرے میں ناول کی اہمیت بجائے خود بڑی اہم بات ہے اور ادب کے ساتھ ساتھ زندگی کی معنویت کی عقدہ کشائی کا اہم ذریعہ لیکن افسانے کے ساتھ اُلٹا معاملہ چل رہا ہے۔کوئی اشاعتی ادارہ یا صحافت کا کوئی سلسلہ افسانے پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کچھ دیر اس کی بازگشت رہتی ہے لیکن وہ کوئی سنجیدہ ادبی بحث اور جاری ڈسکورس میں تبدیلی کا عندیہ کہاں بنتی ہوئی نظر آتی ہے؟ ایسی صورت حال میں افسانہ خود اپنے لکھنے والے کے لیے ایک نئی دشواری سامنے لے آتا ہے۔اس دشواری کا سراغ بھی سعید نقوی کے افسانوں میں بین السطور کے طور پر موجود ہے۔

افسانہ نگاری کے بارے میں اپنے روّیے میں سعید نقوی بیک وقت دو کشتیوں پر سوار ہیں۔۔۔ اردو میں افسانے لکھنا اور وہ مغربی معاشرہ جس میں ان کا قیام ہے، اس کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے فنّی روّیے اور تکنیکی ہُنر مندی سے اپنی حیثیت کے مطابق کسبِ فیض کرنا۔وہ بڑی متانت اور آہستگی کے ساتھ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی اس صف میں شامل ہو گئے ہیں جو بہت وقار کے ساتھ ایک مختلف اور تخلیقی جذبے سے سرشار ہو کر اردو افسانے کو ایک منفرد ذائقے سے روشناس کراتے رہے ہیں۔وہ پریم چند کے کفن والے مادھو اور گھیسو ہوں یا منٹو کا ''نیا قانون'' والا منگو کوچوان، احمد علی کی ''ہماری گلی'' ہو یا غلام عباس کی ''آنندی'' ان افسانوں کا جغرافیائی محلِ وقوع اتنا واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں اور یہ سارے کردار دھرتی سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔زمین ان کے پیروں تلے قائم ہے اور سر پہ آسمان۔ان کا زاویۂ نظر اور طرزِ زندگی سامنے رکھ کر بعض افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کو ایک نئی نہج پر چلانے کی کوشش کی کہ مغرب کے معاشرے سے اپنی مڈھ بھیڑ اور تصادم کو ایک فن پارے میں ڈھالا جائے۔اس سلسلے میں عزیز احمد کا نام سرفہرست آتا ہے اور ان کے بعد ضمیر الدین احمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور طویل مسافت کے رہ رو عبداللہ حسین بھی۔خاص طور پر مجھے منیر الدین احمد کے افسانے یاد آتے ہیں، ملک در ملک سفر اور ایک نامعلوم، موہوم سی جستجو جن کا تشکیلی عنصر ہے۔بہت واضح اور بنیاد گزار تہذیبی قدروں سے ٹوٹ کر اپنے آپ کو صرف معاشی اور معاشرتی بحران ہی نہیں بلکہ اخلاقی بحران میں مبتلا دیکھنے کا احوال قیصر تمکین کے افسانوں میں پہلو دار بیانیے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے۔حیرت اور افسوس ہے کہ ان کے کام پر نقادوں کی نظر کم ہی گئی ہے۔''جزیرہ'' جیسے افسانوں میں جیلانی بانو نے انفرادی روداد کے ذریعے سے ایک اجتماعی تصور کو بڑی عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ڈاکٹر مصطفیٰ کریم نے مشرق کے ساتھ مغربی معاشرے کی عکاسی بہت کامیابی سے کی ہے جب کہ آصف الرحمٰن طارق کے افسانوں میں زبان کا حوالہ اتنا بھرپور ہوتا ہے کہ افسانے کی بُنت کو ایک الگ رنگ عطا کرتا ہے۔اسی طرح اور بھی کئی حوالے شامل کیے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل خود ایک بہت دل چسپ داستان ہے۔سعید نقوی

دیارِ مغرب میں جا بسنے والے افسانہ نگاروں کا عمدہ انتخاب ترتیب دے چکے ہیں، اس لیے وہ افسانے کی اس قلم رو سے بہ خوبی آشنا ہیں۔ یعنی وہ اس راستے پر چلے ہیں تو اس کے مختلف مراحل کے تنقیدی مطالعے اور واقفیت کے ساتھ۔

سعید نقوی کے فنّی و ادبی روّیے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے چند ایک افسانے انگریزی میں بھی لکھے (یا منتقل کیے) اور ان کی اشاعت کے توسط سے مین اسٹریم پبلشنگ میں بھی داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بین الاقوامی ادب کے مطالعے کو ترجمے کے ذریعے بھی اردو میں ڈھالتے رہے۔ چنوا اچیبے کا ایک مختصر ناول، شوئنکا کے خطابات، مچ آلبین کا تمثیلی قصّہ، پیٹر اسٹام کا تیز اور لمسیاتی حدت سے مملو افسانہ ان کی اس کامیابی کے مختلف مراحل ہیں۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ درست لیکن کہانی کا اصل مزہ تو اس کے کہنے سُننے میں آتا ہے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو بیان کرنے والا کتنے پانی میں ہے۔ سعید نقوی کے افسانوں میں ہم ایک خوش گوار تنوع سے دوچار ہوتے ہیں۔ کہیں ان میں علامتی رنگ نظر آتا ہے (''گرمیِ بازار'') تو کہیں طنز بڑھ کر اہمال کی حدوں کو چھو لیتا ہے (''رہزنِ ایماں'')۔ ان کے افسانوں میں کئی جگہ ایسے مقامات آتے ہیں جن سے زبان و بیان پر افسانہ نگار کی ماہرانہ گرفت کا اندازہ ہوتا ہے اور پڑھنے والوں کو ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیتے ہیں جو شاید صرف اسی انداز بیان کی مرہونِ منّت تھی۔ یہ منور لمحے جیمز جوئس کے لمحۂ انکشاف والی epiphanies تو نہیں ہیں، اس کے بجائے ان کو Critical moments قرار دیا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''اب چوراہے پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جتنے منہ اتنے مشورے۔ کہنا تو یہ چاہیے کہ جتنے ذہن اتنے مشورے مگر اس کے لیے ذہن اور زبان میں ربط درکار ہوگا جو کچھ اتنا عام بھی نہیں۔''

''بھاری جوتوں، باریش جنت کے طلب گاروں اور وقت کے آگے بھاگتے کمشنروں کے درمیان منجمد وقت کو دوبارہ چلانے کی کیا امید رہ گئی تھی۔ بقراط، اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی گرفت میں میرا ہاتھ بہت تکلیف میں تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر بھاگنا چاہا، تو اس نے پکڑ کر کھینچ لیا اور ہم دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ نہ چیونٹی دیکھو گے نہ کچلنے کو دل چاہے گا۔''

''کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا، وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ یقیناً میری آنکھ اس کی موجودگی سے ہی کھلی تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان نہیں سکا۔ آنکھ کھلتے ہی ہر چیز ایک سی نظر آتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ذہن کے کسی گوشے میں شناسائی کے خلیے بیدار ہوتے ہیں تو شکل کے ساتھ ذہن میں ایک نام ابھر آتا ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو جیبوں میں ہاتھ ڈالے برآمدے میں کھڑا ہے۔ بہت سارے سوال بیک وقت ہی ذہن میں ابھرے۔ یہ کیسے گھر کے اندر گھس آیا، بیچ رات میں کیوں آیا ہے اور سب سے اہم یہ کہ اب میں اس کو ٹالوں کیسے۔''

''مجھے گلدان میں سجا اکلوتا پھول سخت ناپسند ہے۔ کل رات میری پڑوسن ملنے آئی تو پتلی گردن والے، ایک گلدان میں لمبی ڈنڈی کی نوک پر جڑا ایک پیلا گلاب رکھ کر لے آئی۔ پھول گلدستے کا حصہ ہو تو ڈائیں بائیں کے ہم جنسوں سے سہارا مل جاتا ہے، استقامت سے اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ یہ اکلوتا پھول تو گلدان میں جس سمت جھکاؤ ہو، اسی سمت لڑھک جاتا ہے۔ کنارے کا سہارا لیے بنا اپنی استقامت سے خود سیدھا نہیں کھڑا رہ سکتا۔''

''فون رکھ کر میں دوبارہ صوفے پر آ بیٹھی۔ عینک ناک پر رکھی اور کتاب اٹھالی ''قدرت نے ہر چیز پہلے سے طے کر رکھی ہے، بس ہماری آنکھ سے اوجھل رکھا ہے۔ کہ ہم اس اشتیاق میں رہیں کہ آئندہ کیا ہے، اگلی ساعت ہمارے لیے اپنے پہلو میں کیا چھپائے بیٹھی ہے۔ قدرت خود خاموش تماش بین بنی بیٹھی ہے۔'' میں نے دو سطریں پڑھ کر کتاب پھر بند کر دی۔ یہ ''قدرت کون ہے''، ہمارے ادیب اس قدر فلسفہ لکھتے ہیں کہ طبیعت اکتا جائے لیکن یہ نہیں کہتے کہ لفظ ''قدرت'' میں انہوں نے انسان کی ساری بے چارگی اور لاعلمی سما دی ہے۔ اب کیا کروں؟ اب کیا کروں؟ پھر یہ مہیب سوال درپیش ہے۔''

''اس دن میں بس اچانک ہی مر گیا۔ دن اور تاریخ تو اب مجھے یاد نہیں اور یاد رکھنے کا فائدہ بھی کیا۔ احساسِ وقت تو زندگی میں بھی ایک فریب تھا اب مرنے کے بعد میں دوبارہ اس جھمیلے میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا۔ وہ بھی کوئی طریقہ تھا جینے کا۔ وقت کو مہ و سال میں تقسیم کر کے ہر پل آنے والے پل کے خوف میں یا بیتے پل کے ذکر میں بتایا تھا۔ وقت کے جال میں ایسے پھنسا رہا جیسے کوئی مکھی ایک مکڑی کے جال کے عین وسط میں گرفتار ہو جائے۔ بس اتنا یاد ہے کہ عید کا دوسرا دن تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی میرے گھر والے ابھی خوشیوں بھرا دن پوری طرح گزار بھی نہیں پائے تھے کہ میرے غم نے انہیں آ لیا ہوگا۔ ساری زندگی بس یہی داستان رہی۔ ایسے ہی خوشی اور غم سے آنکھ مچولی رہی، کبھی خوشی آگے تو غم پیچھے اور کبھی غم آگے تو خوشی اس کے تعاقب میں۔ عجیب گورکھ دھندا تھا نہ کبھی چین سے خوشی منائی نہ ہی غم کو پوری طرح اوڑھ سکے۔''

ان مختلف ٹکڑوں سے افسانہ نگار کے طرزِ نگارش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ٹکڑوں کے بجائے بعض پورے افسانے ایک گہرا نقش قائم کرتے ہیں۔ امریکا میں رہتے ہوئے کسی اور مذہب سے اپنا جیون ساتھی تلاش کرنے والے نوجوان کردار ہوں یا Autistic بچے کے ذہنی کرب کا تکلیف دہ اظہار یا پھر قبر میں اتارے جاتے وقت بدل جانے والے مردے جو اپنے دفن کرنے والوں کے عقیدے کا حساب پورا نہیں کر پاتے۔۔۔ یہ مرّقعے سعید نقوی نے ان مٹ نقوش سے تیار کیے ہیں خاص طور پر یہ آخری افسانہ جو عبرت کا ایک عجیب نقشہ کھینچتا ہے۔ بہت پہلے قدیم ہندوستانی روایت میں وہ قصّہ پڑھا تھا کہ ایک عورت کا بھائی اور شوہر قتل ہو گئے اور اس کی تپسیا سے ان کے مردہ بدن میں دوبارہ جان پڑ گئی لیکن ایک بھول ہو گئی کہ ایک کا سر دوسرے کے دھڑ پر لگ گیا۔ اور ہمیں

''چہارسُو''

اس دبدھا میں چھوڑ گیا کہ اس بدلے ہوئے سر دھڑ کے ساتھ شوہر کون ہے اور بھائی کون؟ اس قصّے کو بنیاد بنا کر تو ماس مان نے The Transposed Heads جیسا طویل افسانہ لکھا اور ہمارے عہد میں انتظار حسین نے ''نرناری'' کا قصّہ بیان کیا جس میں ایک سیاسی رمز بھی بن بلائے مہمان کی طرح آن موجود ہوتا ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ الٹ پلٹ ہو جانے والی قبروں اور ان سے مطابقت نہ رکھنے والے مُردوں کا یہ افسانہ بھی ایسا ہی قصّہ ہے جو ہمارے اردگرد بڑھتی ہوئی عصبیت اور تفریق کا ایسا طنزیہ نقشہ پیش کرتا ہے جس کی زد میں ہمارا پورا معاشرتی روّیہ آ جاتا ہے۔ زندگی ایک قبرستان بن کر رہ گئی ہے۔ پس ماندگان واپس جا چکے ہیں، گورکن ہنس رہا ہے اور مٹّی کا ڈھیر بن جانے والی قبروں میں مُردے خاموشی کی زبان میں بول اٹھے ہیں۔

کیا ہم اس گورکن کی ہنسی سُن سکتے ہیں؟ ذرا سی دیر میں ہمارے سننے، سمجھنے کی صلاحیت بھی مٹّی کے اس ڈھیر کے تلے دب چکی ہوگی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ افسانہ کہیں روداد نہ بن جائے اور پھر ہمارے پاس ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہے!

بے بسی کے عالم میں اس دید کے مسلسل عذاب میں مبتلا ہو جانے کے بجائے میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ سعید نقوی یا مشرق و مغرب کے دوسرے افسانہ نگار جن کو انہوں نے پڑھا ہے اور جن سے یگانگت محسوس کی ہے، کسی کے پاس ایسا کوئی قصّہ ہے جس سے سر دھڑ کی یہ الٹی بازی ٹھیک ہو جائے، کٹے ہوئے دھڑ سے دوبارہ وہ سر جُڑ جائے جو اس کا اپنا انگ تھا، اس کے جسم پر کسی اور کا سر نہیں؟

شاید یہ توقع افسانے کی بساط سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کا جواب افسانہ نگار کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟ خونِ فرہاد بر سرِ فرہاد۔۔۔

''مشرق و مغرب کی آویزش''

سعید نقوی ابھی تک ایک افسانہ نگار اور مترجم کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ''گرداب'' کی شکل میں ان کا پہلا ناول سامنے آیا ہے تو ان کی پہچان بے شک پہلے سے کچھ زیادہ متعین ہوئی ہے۔ یوں بھی ناول ہمیشہ سے ادب کی ایک ایسی صنف کے طور پر مقبول رہا ہے جسے ہم آپ بیتی سے قریب ترین ہیئتِ اظہار کا نام دے سکتے ہیں۔ میں نے اس ناول کو بھی سعید نقوی کی خودنوشت سوانح عمری کے ایک متبادل کے طور پر دیکھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی، ان کی کہانیوں کی طرح، اس ناول میں بھی یہی رہی ہے کہ وہ ایک بے پیچ اور قدرے بے تکلف اسلوب میں سوانحی قسم کا ناول لکھنے کے باوجود، کسی بھی سطح پر جذباتیت اور ''ذات آسودگی'' کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔ گردوپیش کی دنیا اور نجی سطح پر اس دنیا کے ردِعمل کا احاطہ کرتے ہوئے، انہوں نے اس پورے بیانیے میں کہیں بھی خودنگری کے عنصر کو اپنے آپ پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ وہ خود کو بھی دور سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

''گرداب'' کے پس منظر میں، یہ پہلو اس لیے اور زیادہ معنی خیز، بلکہ اہم ہو جاتا ہے کہ اس بیانیے کا زمانی پس منظر، جدید دنیا کے سب سے پر آشوب اور ہولناک دور سے منسلک ہے۔ اس دور نے پوری دنیا کے لیے، خاص طور پر ایک معینہ قوم کے لیے ذہنی، جذباتی، تہذیبی اور سیاسی مسئلوں کی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے۔ مشرق اور مغرب کی آویزش کا مسئلہ اور اپنے اجتماعی تشخص کی حفاظت کے لیے نظریاتی تشدد کے ایک نئے سلسلے کی شروعات، اسی دور کی سوغات ہے۔ یہ سلسلہ ایک عالمگیر تاریخی تجربے سے بندھا ہوا ہے۔ تاہم، اس نے مسلمان قوم، خاص طور پر پاکستانی قوم کے لیے، کم و بیش ایک ذاتی اور انفرادی واردات کی حیثیت بھی حاصل کر لی ہے۔ سعید نقوی نے اس پوری صورتِ حال کو ایک وسیع اور کثیر الجہات تہذیبی اور ثقافتی مسئلے کے طور پر دیکھا ہے۔ زمان و مکاں کے ایک معلوم اور مانوس دائرے میں رہتے ہوئے، واقعے کو افسانہ بنا دینا، ظاہر ہے کہ آسان نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً کسی ایسے شخص کے لیے جو اس قصّے میں براہِ راست شامل نہ ہو اور صرف تماشائی بنے رہنے پر بھی قانع نہ ہو۔ اس ناول کے واسطے سے بھی، سعید نقوی نے اپنے ثقافتی موقف اور زاویے نظر پہ پردہ ڈالنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی ہے۔ ''گرداب'' کی کہانی قاری کے لیے اپنے بیانیے کے ساتھ ساتھ، سوالات کا ایک جال بھی بچھاتی گئی ہے۔ اس طرح فنی سطح کے علاوہ بھی یہ کہانی ہمیں سوچ و بچار کی کئی سطحیں مہیا کرتی ہے۔ جہاں کہیں کچھ شوخ چھینٹوں کے باوجود، یہ کہانی خاصی سنجیدہ توجہ کے ساتھ پڑھے جانے کا تقاضہ کرتی ہے۔

شمیم حنفی

انفرادی عمل

سلمیٰ اعوان
(لاہور)

افسانے کی دنیا میں ڈاکٹر سعید نقوی کی آمد کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے لیکن ان کی انٹری اس طرح ہوئی جس کے لیے کسی نے کہا تھا کہ ''وہ آیا اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا''۔ ان کے افسانے کے پہلے مجموعے ''نامہ بر'' کی اشاعت کو ابھی ایک ہی سال ہوا ہے اور ان کا دوسرا مجموعہ ''دوسرا رخ'' اشاعت کے لیے تیار ہے۔ نوجوانی کے عشق میں جو شدت، سچائی، سرشاری اور وفور ہوتا ہے یہی کیفیت سعید نقوی کے تخلیقی عمل کی ہے۔ ان کا افسانوں کے ساتھ عشق اپنے ابتدائی ایام اور جوانی میں ہے۔ اس لیے ان کا تخلیقی وفور دیدنی ہے۔ میرے خیال میں ''نامہ بر'' کے بعد ''دوسرا رخ'' میں سعید نقوی نے تخلیقی سطح پر ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔

سعید نقوی اپنے افسانوں کا مواد ہماری اجتماعی زندگی سے لیتے ہیں ان کی نظر ہماری معاشرتی سیاسی اور تہذیبی زندگی کے دوغلے پن اور تضاد پر ہے اس سے وہ بعض سوالات اٹھاتے ہیں۔ (مثلاً ''صبح کا بھولا'' نماز بے ایمانی اور فراڈ میں جائز اور وضو کے بغیر ناجائز؟)

ڈاکٹر سعید نقوی اپنے افسانوں میں ایلوگیری (تمثیل) Allogery سے خاص طور پر کام لیتے ہیں۔ ''نامہ بر'' میں ''جنگل کا قانون'' ابدی کھیل اور جگ بیتی اس کی مثالیں ہیں۔ ایلوگیری میں بالعموم وہ کسی انسانی صورت حال کی پیش کش اور وضاحت کے لیے جانوروں کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی بہت سی کہانیوں میں اہم کردار جانور ہیں یا وہ جانوروں کے بارے میں لکھی گئی ہیں اور اس طرح انسان کی غیر موجودگی سے انسانی صورت حال اس کا بھیانک پن، اس کی درندگی اور اس کے تکلیف دہ پہلوؤں کو سامنے لایا گیا ہے۔ ''دوسرا رخ'' میں ان کے افسانے ''بے لگام'' میں امریکی سوسائٹی کے ایک اہم مسئلہ نسلی تعصب کو ایلوگوریکل انداز میں موضوع بنایا گیا جس کا شکار کالوں (افریقن امریکن) اور مقامی انڈین کے علاوہ دنیا جہاں کے تارکین وطن یا رنگ دار قوم کے افراد ہیں۔ امریکہ میں نسلی تعصب کا مسئلہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ لیکن ساٹھ کی دہائی میں سول رائٹ کی تحریک اور کالوں کے کچھ حقوق حاصل کر لینے یعنی گوروں کے ساتھ ایک ہی بس میں سفر کرنے یا ریسٹورنٹ میں جانے، ووٹ کے حق اور اسی طرح کے دوسرے معاشرتی وسیاسی حقوق حاصل کرنے کے بعد نسلی تعصب کا کھلا مظاہرہ قانوناً جرم قرار پایا۔

اب ظاہر اس جرم کا کھلم کھلا مرتکب کوئی نہیں ہوتا مگر رنگ ونسل کی بنیاد پر تعصب سوسائٹی کے رنگ و پے میں موجود ہے جس کا اظہار مختلف اوقات میں مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ سعید نقوی نے ''بے لگام'' میں اس نازک موضوع کا انتخاب کیا ہے جس کا شکار بیشتر رنگ دار قوم کے تارکینِ وطن ہیں۔ اس افسانے میں ڈاکٹر سعید نقوی نے ایلوگوریکل پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اس افسانے کے بنیادی کردار گھوڑے ہیں۔ (سفید، سیاہ اور دھاری دار) اور یہ پوری کہانی گھوڑوں کی Feelings اور رویوں کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ امریکی معاشرہ کی جڑوں میں بیٹھے ہوئے اس نسلی امتیاز اور تعصب کو ایک مختصر افسانے میں غالباً کسی اور طرح اس موثر انداز میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر سعید نقوی کے ہر افسانے میں ایک بنیادی مقولہ (خیال/نقطہ) موجود ہے اور اس مقولے کے گرد سوالات کا ایک سلسلہ چلتا ہے جو قاری کے ذمہ آ لگتا ہے کہ وہ اب اس پر سوچے جس حد تک سوچ سکتا ہے۔ اسی سبب سے ان کے افسانے انفرادی مسائل، معاملات اور تجربے سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک اجتماعی احساس کا حامل معلوم ہوتے ہیں خواہ وہ ''تنہائی کا سفر'' اور ''مسابقت'' ہوں جو ہمارے معاشرہ میں عورت کی حیثیت سے متعلق ہیں یا ''چشمِ حیراں'' جس میں مرکزی کردار ایک فلم بیں سے اس دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔

''تنہائی کا سفر'' اور ''مسابقت'' کو ملا کر پڑھیں تو ہمارے معاشرہ میں عورت کی انتہائی صورت سامنے آتی ہے جو عورت کی تنہائی (اور مظلومیت) کی المناک صورتحال کو پیش کرتا ہے اگر عورت کی شادی نہیں ہوئی ہے تو بھی وہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ اگر طلاق ہو جائے تب بھی! (سہیلیاں الگ اس خدشے میں رہتی ہیں کہ وہ ان کے شوہر کو کہیں چھین نہ لے) اگر شادی شدہ ہے تو شوہر کی مرضی ومنشا اور اختیار کے تابع۔ اس سلسلے میں مرد کی برخود غلط ''نام نہاد مردانہ'' انا عجیب و غریب تماشے دکھاتی ہے۔ عورت اس صورت حال کو قبول کر کے جیے تو نہ ہونے کی حالت میں اور اگر اپنے وجود پر اپنے ہونے پر اصرار کرے تو طلاق کی صورت میں پھر وہ سزا جو ''تنہائی'' اور ''غیر معتبر'' ہونے کی صورت میں اسے دی جاتی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر سعید نقوی عورت ایک بڑے مردانہ شاؤنزم پر مبنی معاشرے کے سیاق میں لے آتے ہیں اور یہ افسانے انفرادی ہونے کے باوجود ایک طرح کی اجتماعی صورت حال کو پیش کرتے ہیں۔

''چشمِ حیراں'' تو خیر ہے ہی اجتماعی زندگی سے متعلق۔ اجتماعی کردار کی گراوٹ اجتماعی زندگی کی یکسانیت و جمود، تاریخ سے کھلواڑ، لالچ، حرص خود غرضی، تین ٹانگوں والے مینڈک کا اپنے کنویں کے اوپر کے آسمان تک (کل حقیقت) دیکھنا۔ ہر کتے کا زنجیر کھلتے ہی خرگوش کے پیچھے سرپٹ دوڑنا، جمعہ کے نماز کی چھٹی کے نام پر چھٹی کی عیاشی، عرب شیوخ کا بچوں کو اونٹ کے ریس میں استعمال کرنا، شیر اور چیتے کے سامنے بکری اور ہرن کے گوشت کا انبار، گیدڑ کی نوزائیدہ جمہوریت کا دم گھٹنے سے انتقال کی خبر کے ساتھ شیر ببّر کے لیے نظریہ ضرورت ظاہر یہ ہماری اجتماعی صورت حال ہے۔ سعید نقوی نے اسے گرفت میں

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

توانا فکر قلم کار

رفیع الدین راز
(کراچی)

میں سب سے پہلے نیویارک والوں کو اس بات پر مبارکباد دینا چاہوں گا کہ انہیں ڈاکٹر سعید نقوی جیسا ایک ایسا ورسٹائل قلم کار مل گیا ہے جس کی تحریر نہ صرف امریکہ بلکہ برصغیر میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہے۔ ڈاکٹر نقوی نے جس مختصر سے عرصے میں یہ جگہ بنائی ہے' وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ مجھے شمالی امریکہ میں سعید نقوی جیسا کوئی دوسرا قلمکار نظر نہیں آرہا ہے جو ان کی طرح اچھا اور بہت لکھ رہا ہو سوائے ڈاکٹر تقی عابدی کے' لیکن دونوں کے کام میں بڑا فرق ہے۔ سعید نقوی ڈاکٹری کے پیشے سے منسلک رہتے ہوئے تندہی سے لکھ رہے ہیں۔ صاحبِ نظر لوگ کہتے ہیں کہ کام کرنے کا وقت انہی لوگوں کے پاس ہوتا ہے جو زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ بے کار لوگوں کے پاس کام کرنے کیلئے وقت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نقوی نے اس مقولے کو سچ کر دکھایا ہے۔ یہ مختصر سی تمہید میں نے ان کے پہلے ناول ''گرداب'' کے سلسلے میں باندھی ہے۔ ناول میری نظر میں بہت ہی مشکل صنف ہے۔ اتنی مشکل کہ غزل کا اچھے سے اچھا شاعر بھی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کانپ اٹھتا ہے۔ افسانے اور ناول کی نثر نگاری غزل کے شاعر کیلئے انتہائی دشوار کام ہے اور اس کی وجہ ہے غزل میں مضمون کو سمیٹا جاتا ہے جبکہ نظم افسانہ اور ناول میں اسے پھیلانا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے میری اک غزل کا شعر ہے۔

جو مزاجِ غزل سے واقف ہیں
گفتگو ان کی مختصر ہو گی

ممکن ہے آپ مجھ سے یہ سوال کرنا چاہ رہے ہوں کہ ڈاکٹر سعید بھی غزل کے شاعر ہیں تو پھر انہوں نے کس طرح اس کا فراداصنف کی طرف نہ صرف دیکھا بلکہ سرِ بازار بلا کسی خوف کے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ میرا جواب ہے کہ سعید نقوی کو یہ حوصلہ ان کی افسانہ نگاری نے دیا ہے۔ آپ قرۃ العین حیدر' شوکت صدیقی اور دیگر ناول نگاروں پر نظر ڈالیں یہ سب آپ کو ابتدا میں افسانہ نگار نظر آئیں گے۔ ناول کی دیوی بھی اپنا پورا چہرہ دکھانے کیلئے چالیس برس کی ریاضت مانگتی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا پہلا افسانہ غالباً سولہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ ''آگ کا دریا'' ''میرے بھی صنم خانے'' اور ''چاندنی بیگم'' تک کا سفر اتنی آسانی سے طے نہیں ہوا ہے۔ ''اداس نسلیں'' یا ''خدا کی بستی'' نقشِ اول نہیں ہوا کرتے۔

مضمون کو سمیٹنے اور پھیلانے کے حوالے سے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ وہ میں آپ کو اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے اس مضمون کو خشک سنجیدگی کی نذر نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایک صاحب نے پہیلی کے انداز میں فرمایا زید نے کہا کل دوپہر بکر صاحب کے یہاں میری دعوت تھی۔ انہوں نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ دونوں میاں بیوی بڑے خوش اخلاق ہیں۔ دو اڑھائی گھنٹے دیکھتے دیکھتے گزر گئے۔ اس بات کو بکر نے یوں بیان کیا کل دن کے کھانے پر ہم لوگوں نے زید صاحب کو اپنے گھر بلایا تھا۔ چھٹی کے دن میری بیگم کھانے کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ کل بھی چھٹی کا دن تھا' سو بیگم نے چکن کے علاوہ شامی کباب اور بھنڈی کی ترکاری کا بھی اہتمام کر لیا تھا۔ زید صاحب خوش خوراک نہیں ہیں' لیکن میٹھا پسند کرتے ہیں لہٰذا بیگم نے رس ملائی کو بھی کھانے میں شامل کر دیا تھا۔ صبح سے بارش بھی ہو رہی تھی۔ تین ہفتوں کے بعد کی پہلی بارش نے ماحول کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ لان کی گھاس کی ہریالی جاذب نظر ہو گئی تھی۔ پھولوں اور پیڑ کے پتوں کے رنگ نکھر اُٹھے تھے۔ میں اس ماحول سے لطف اندوز ہونے کیلئے کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا۔ اتنے میں زید صاحب کی گاڑی ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ اس وقت ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ زید صاحب گرے شلوار قمیص میں اپنی کار سے نکلے اور تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے انہیں دروازے کی گھنٹی بجانے کی زحمت نہیں دی۔ اس سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا۔ شاید ہم دونوں ہی بھوکے تھے اس لئے سیدھے کھانے کے ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔ پہیلی والے صاحب یہیں رکے اور حاضرینِ محفل سے بولے۔ سوچ کر بتائے زید اور بکر کون ہیں۔ محفل میں موجود ایک شخص جس کا تعلق ادب سے بھی تھا' اس نے جواباً کہا' اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ زید غزل کا شاعر اور بکر افسانہ نگار ہے۔ یہ بات تو میں نے محض تفننِ طبع کے طور پر لکھ دی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بڑے منظرنامے کے اظہار میں اس کی فطری خوبصورتی کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ ڈاکٹر سعید نے بڑی کامیابی سے اس معرکے کو سر کیا ہے۔ اس ناول میں کردار بھی زیادہ ہیں اور اس کے زمان و مکان کا پھیلاؤ بھی کافی وسیع ہے۔ یعنی پاکستان سے امریکہ تک بلکہ افریقہ کی ایک فیملی بھی اس منظرنامے میں موجود ہے۔ ناول کا بنیادی خیال تو دہشت گردی' اس سے منسلک عوامل اور لوگ ہیں' لیکن ناول نگار سفر کے دوران اردگرد کے ماحول سے بھی غافل نہیں اور یہ بھی نہیں کہ سعید نقوی وہاں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔ سگنل پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ معاشرے کے ان مکروہ چہروں پر سے نقاب ہٹانا نہیں بھولتے جن کے سبب قوم کے بچے تباہ ہو رہے ہیں۔ بلدیہ کے ایک ایماندار ریٹائر افسر کی بات کرتے ہوئے وہ یہ کہنا نہیں بھولتے کہ بلدیہ کا چپڑاسی بھی اپنے لئے چپڑاسی رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح کے ایک خوبصورت جملے میں کراچی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''غربت اب اس شہر کے منظرنامے کا حصہ ہے۔'' محبت زندگی کی اساس ہے۔ انسان کا بچہ ہو یا کسی بھی جاندار کا' اگر اسے محبت کا لمس میسر نہ ہو تو وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ آج ہمارے ملک میں یہ فطری محبت بھی قدم قدم پر پامال ہو رہی ہے۔ کہیں غربت کے ہاتھوں اور کہیں لالچ کے ہاتھوں۔ اسی ناول میں ایک باپ محض چند روپوں کی خاطر نہ صرف اپنے پانچ برس کے بیٹے کو مدرسے میں چھوڑ آتا ہے بلکہ اپنے تین سال کے بیٹے

کو بھی نام نہاد مولوی کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر سعید نقوی نے جا بجا ایسی باتوں کا ذکر کیا ہے' لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ بھی کم عبرت انگیز نہیں ہے۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے اس منظر نامے کو ہم روز دیکھتے ہیں اور تماشائی کی طرح گزر جاتے ہیں۔ ایسی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہماری آنکھوں سے لہو نہیں ٹپکتا۔ آخر کیوں۔ قدم قدم پر وقوع پذیر ہونے والے ایسے واقعات نے شاید ہمیں بے حس بنا دیا ہے۔ میں بھی اس میں شامل ہوں۔

جو عیب سب میں ہے وہ میری ذات میں بھی ہے
اک خطِ بے حسی تو مرے ہاتھ میں بھی ہے

چیڑ اسی کا اپنے لئے چیڑ اسی رکھنا ہمارے لئے حیرت کی بات نہیں کیونکہ اس جیسے مناظر ہمارے ملک کے بیشتر ادارے ہمیں ہر روز دکھاتے رہتے ہیں اور ہم مثلِ تماشا اسے مسلسل دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیوں۔ کاش ہمارے ملک کے صاحبِ اختیار لوگوں کی زبان سے بھی کبھی نکلے ''آخر ایسا کیوں'' میں یہاں پر ڈاکٹر سعید نقوی کو ان کی فنی بصیرت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیں تمام تر خرابیوں کے باوجود صحرا میں اذان دیتے دکھائی دے رہے ہیں۔ تیرگی کی ہولناک فضا میں بھی وہ چراغ جلانا نہیں بھولے۔ اس ناول میں ہمیں حامد صاحب کی شکل میں کوئی اذان دیتا اور چراغ جلاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ناول نگار نے امید سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ ایک سچا قلم کار امید سے رشتہ توڑ بھی نہیں سکتا۔ اس ناول کے اور بھی کردار ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ شکیلہ کے سچ سے ہم سرسری نہیں گزر سکتے۔ یہ سچ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ سچ جتنا بڑا ہوگا' اس کے اقرار کیلئے اتنے ہی بڑے حوصلے کی ضرورت پڑے گی۔ شکیلہ کو یہ حوصلہ غالباً امریکہ نے بخشا ہے۔ ہمارے وہ بچے جو یہاں پیدا ہوئے ہیں' ان میں سچ بولنے کا حوصلہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ تین سال پہلے ہی مقصود الٰہی شیخ صاحب کا اک انٹرویو ٹی وی پر دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اک سوال کے جواب میں کہا تھا ''میں نے سچ بولنا انگلینڈ میں سیکھا'' ہم جیسے لوگ تو سچ بولنا اپنے ملک ہی میں سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ سو ہمیں مغرب میں آ کر سچ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہمیں ان کی بُرائیاں ڈھونڈنے سے فرصت کہاں کہ ان کی اچھائیوں پر غور کریں۔

میمونہ کا کردار انتہائی متاثر کن ہے۔ مشرق اور مغرب کا خوبصورت امتزاج ہمیں اس کردار میں نظر آتا ہے۔ والدین کو ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہنے سے لیکر شوہر کی واپسی تک۔ زندگی کی جنگ لڑتے ہوئے اک حوصلہ مند اور اعتدال پسند ذہن رکھنے والی خاتون کی صورت میں وہ ہر وقت ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ خاص طور سے اس کا وہ عمل جب وہ اپنے بھائی کا رشتہ اس لڑکی کے پاس لے جاتی ہے جس کا اسقاط اس نے خود کروایا تھا؟

مجھ جیسے قاری کیلئے یہ ناول اچھا خاصا معلوماتی بھی ہے۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آسٹریلیا کے ابتدائی آباد کار جرائم پیشہ تھے۔ جرائم پیشہ افراد کی تو ہمارے ملک میں بھی کوئی کمی نہیں' لیکن ہمارا کوئی شہر آج تک سڈنی' ملبورن اور پرتھ نہیں بن سکا۔ اسی ناول کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ میں امریکہ کی پولیس کو جتنا ایماندار سمجھتا تھا' وہ اتنی ایماندار نہیں ہے۔ خاص کر شکاگو اور نیویارک کی پولیس۔ محفوظ اسقاط کیلئے جس مدت کا ذکر ہوا ہے' میں اس سے بھی ناواقف تھا۔ ہوائی جہاز والے پھٹے ہوئے سوٹ کیس کے عوض نیا سوٹ کیس اور ڈالر بھی دیتے ہیں۔ یہ خبر بھی میرے لئے نئی تھی۔ اور بھی بہت ساری معلومات ہیں۔ بلاشبہ م ناول کا طرزِ تحریر قاری کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس ناول کو شروع سے آخر تک کسی ایک سطر چھوڑے بغیر پڑھے' لیکن جب ہم اس ناول کو ختم کرتے ہیں تو ہمیں ایسا گمان گزرتا ہے کہ ناول کے مرکزی خیال' اس سے منسلک کرداروں اور عوامل پر وہ محنت نہیں کی گئی جس کے وہ متقاضی تھے۔ حامد صاحب اور شریف صاحب کے یہاں کچھ بچانے اور کچھ پانے کی ایسی کوئی جستجو نظر نہیں آتی جو ہمیں میمونہ کے کردار میں نظر آتی ہے۔

ناول چاہے رومانی ہی کیوں نہ ہو' کہیں نہ کہیں اس کا تعلق تاریخ سے بھی جڑ جاتا ہے اور یہی مقام قلم کار کے امتحان کا ہوتا ہے۔ اس موقع پر اسے اپنی غیر جانبداری ثابت کرنے کیلئے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ ''گرداب'' کے بین السطور سے ہمیں گمان گزرتا ہے کہ ڈاکٹر سعید نقوی کوشش کے باوجود اس پل صراط سے گزرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں' لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ پل صراط سے جتنی آسانی کے ساتھ ایک مومن گزر سکتا ہے' اتنی آسانی سے کوئی قلم کار نہیں گزر سکتا۔

9/11 کے حوالے سے بہت کچھ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے اس لئے میں نے اپنے اس مضمون میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ ویسے بھی قاری کے پڑھے کیلئے کچھ چھوڑ دینا چاہئے۔ ناول کے حوالے سے ''گرداب'' ڈاکٹر صاحب کا نقش اول ہے' لیکن اس میں ہمیں نقش ثانی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دے رہی ہے۔ جس طرزِ تحریر کے سبب میں اس ناول کو پڑھنے پر مجبور ہوا' اس کی اک جھلک نہ دکھلانا بے ایمانی ہوگی۔ دعوے کو دلیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو ''گرداب'' کی چند سطور ملاحظہ فرمائیے اور مجھے اس مضمون کو ختم کرنے کی اجازت دیجئے۔

میمونہ نے باقی رات بھی آنکھوں میں کاٹ دی۔ اب صبح کے تقریباً چار بج رہے تھے۔ گھر کے باقی افراد نیند اور تھکن کے ہاتھوں شکست کھا کر سو چکے تھے۔ میمونہ نے پردے کا کونا اٹھا کے باہر جھانکا۔ ہو کا عالم تھا۔ خزاں کی سرد رات' کچھ پتے درختوں پر باقی تھے' کچھ خزاں رسیدہ زمین پر آ رہے تھے۔ جو پتے اب بھی درختوں سے جڑے تھے' وہ تیزی سے رنگ میں بدل رہے تھے جیسے ان کے بھیس بدلنے سے سردی دھوکا کھا جائے گی' لیکن قدرت نے اجل کو وہ چشمِ دور بیں عطا کی ہے کہ لاکھ اپنا حلیہ بدلو' اس کو فریب دینا ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا۔ سبز پتوں نے اپنے رنگ بدل کر زردی' سرخی اور پیلاہٹ اوڑھ لی تھی' لیکن کوئی چار چھ ہفتوں میں یہ سب پتے اپنی شاخوں سے جدا ہو کر زمین پر آ گریں گے۔ یہ اشجار کی سخت سردی سے دفاع کی حکمت عملی ہے۔ پتوں کے جھڑنے سے ان کی خوراک کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔ شجر کی کیا اوقات' انسان ناموافق حالات سے اس طرح مقابلہ کرتا ہے۔ زندہ رہنے کی خواہش زندگی کی جبلت میں شامل ہے۔

''محبت فاتح عالم''

شہلا نقوی

(کراچی)

ہم ایک حیرت آمیز مسرت کے ساتھ سعید نقوی کے افسانوں کے تیسرے مجموعے کا استقبال کررہے ہیں۔ سعید کی زندگی میں اپنا ڈاکٹری کا کام کرنا، اس کیلئے سفر کرنا، لگاتار علم میں اضافہ کرنا یعنی Containg Medical Experts کی سرگرمیوں میں وقت گزارنا، دوستوں سے ملاقات کرنا، سب کا اپنا مقام ہے، اسکے بعد ان صاحب کے پاس لکھنے کیلئے وقت کیسے بچتا ہے یہ ایک راز ہے۔ تو میں گھر کے بھیدی کی حیثیت سے اسکی یہ وجہ بتاؤنگی کہ سعید اپنے گھر میں کباڑ نہیں رکھتا۔ میرا تو یہ حال ہے کہ ردی نکالنا چاہتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ایک بار اخبار کی اس خبر کو پھر پڑھ لوں۔ میرا خیال ہے کہ شائد اس طرح سعید اپنے گھر کی ردی نکالتا ہے، اسی طرح ذہن کی ردی بھی نکالتا رہتا ہے۔ نفرتوں سے، غلط خیالوں سے خالی کرتا رہتا ہے، عموماً لوگ مہمانوں کے آنے پر ہی گھر کی کھڑکیاں چھڑک چھڑک کر صاف کرتے ہیں لیکن سعید روز اپنے ذہن کے جالے نکالتا ہے، ذہن کی کھڑکیوں کے شیشے صاف کرتا ہے، تازہ ہوا کیلئے سردی میں بھی کھڑکیاں کھول دیتا ہے اور اندھیرا ہوتے ہی اپنے سجے ہوئے گھر کے فانوس روشن کردیتا ہے۔ یہ میری طرح امریکی ٹی وی کی افیم کے پینک میں نہیں بیٹھتا، پاکستان کی خبریں لگا کر سر و سینہ پیٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ غم و غصے کا لاوا ایک افسانے کی صورت میں باہر نکل آئے۔

زندگی خصوصاً پاکستان کی زندگی، پاکستانیوں کی زندگی ہر روز ہمیں ناقابل یقین تضادات اور اندوہناک واقعات سے دوچار کرتی ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مترادف زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر ظلم کو دیکھنا اور اسکے خلاف آواز اٹھانا بھی ظالم کا ساتھ دینا ٹھہرتا ہے تو ہم میں سے زیادہ تر اسکے گناہگار ہیں۔ اسکے برعکس سعید کے افسانے معاشرتی ظلم کی نشاندہی کرتے ہیں، اس پر واویلا کرتے ہیں، اس کا حل نہیں بتاتے کہ حل اظہر من الشمس ہے۔ یہ وہ راز ہے جو افشاء ہے، جس کسی نے بھی پچھلے پچاس برس میں پاکستانی معاشرے کی تبدیلیاں دیکھی ہیں وہ وقت کا پہیہ جام ہونے بلکہ اسکے الٹا چلنے کی کوششوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اس افسانے ''ٹک ٹک دیدم'' کے چند جملے ''کل تو اتنا دلفریب اتنا پرکشش ہوتا ہے، کل کی آس ہی تو ہمیں رواں رکھتی ہے''..... ''بھئی بند کمرے میں تو گھٹن ہی رہے گی ناں، تازہ ہوا کیلئے کوئی کھڑکی یا دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا، یہاں تو معمار کہہ گئے ہیں کہ دروازہ یا کھڑکی کھولی تو گھر مسمار.....''

افسانہ ختم ہونے تک آدمی، بیوروکریسی اور مذہبی انتہاپسندی سب کا جائزہ لے لیا گیا ہے۔ سعید کے افسانوں میں زبان و بیان کی خوبی بھی ہے اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں متنوع انداز سے کہانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں ''دامِ آگہی'' اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ ''بے دخلی'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ ہم سب ایک طرح سے اپنے دیس سے بے دخل ہیں۔ افسانہ کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہماری بے احتیاطی کی وجہ سے گھر کی قیمت اگلی نسل کی زندگی ہے ورنہ عربی بولتے مہاجن کے ہاتھوں بے دخلی ہے۔

''رہزنِ ایمان'' کی توصیف میں آصف اسلم اور نصرت انور نے جو لکھا ہے اس سے متفق ہوں لیکن میں اس میں فرقہ واریت کے علاوہ ایک اور خیال بھی دیکھ رہی ہوں۔ اپنے حریف یا دشمن کا بدلہ اسکے قبیلے کی کمزور ترین ہستی سے لینے کا جذبہ، وہ جس کے تحت جنگ اور فسادات میں عورتوں کی آبروریزی کی جاتی ہے۔ اس افسانے میں گورکن جن کو آصف اور نصرت نے غیر جانبدار سمجھا ہے، دونوں فرقوں کو اپنا دشمن سمجھ کر انکے مُردوں سے بدلہ لے رہے ہیں اور واقعی ایک لاش ایک زندہ عورت سے بھی زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ اس 80 سال بوڑھی عورت سے بھی کمزور جو بے جرمِ ضعیفی میں اولاد کے ہوتے بھی تنہا ہے۔ ''بے جرمِ ضعیفی'' افسانہ سے جو ایک 80 سالہ بوڑھی کی زبانی لکھا گیا ہے، اس افسانے کے باوجود سعید کی افسانہ نگاری بے حد مردانہ ہے۔ اسکی کوئی سطر بھی کسی عورت کی تحریر نہیں لگتی۔ افسانہ ''ٹک ٹک دیدم'' میں شہر کا شہر چوک میں کھڑا ہے لیکن اس میں ایک بھی عورت نہیں ہے۔ کوئی لڑکی سینہ پر کتاب کو ڈھال بنائے پہلو بچاتی نہیں گزرتی۔ کوئی عورت چادر کا پلو ناک پر رکھے بچے کو ہاتھ سے گھسیٹتی نہیں آتی کہ ایک نگاہ بند گھٹنے پر ڈال کر نسوانی نقطہ نظر سے کچھ کہہ دیتی۔ آخر یہ عورت کا بھی مسئلہ ہے بلکہ عورتوں کی زندگیوں کیلئے وقت کا الٹا چلنا زیادہ خطرناک ہے۔ سعید اصل میں عورت کے ہمدرد اور مربی تو ہیں لیکن اسکے ذہن و دل میں جھانکنے والے نہیں ہیں۔

شکر ہے ''رعنائی خیال'' کی جہنم میں بھی سب مرد ہیں۔ صرف ایک عورت تھی لیکن ایسی جس نے عورت کے خاندان اور قانون سے مایوس زندگی کی ہر رعنائی کو ٹھکرا دیا تھا۔ ''جنگل کا قانون'' میں مورنی بغاوت بھی کرسکتی تھی۔ وہ مختاراں مائی کی طرح ظلم کیخلاف علم کو استعمال کرسکتی تھی۔ کچھ نہیں تو شکاری کے جال میں پھنس کر چڑیا گھر میں بیٹھ سکتی تھی۔ صرف ایک افسانہ بجوکا ہے جس میں ایک عورت کا ذہنی ارتقاء بھی دکھایا گیا ہے اور اسکی انا بھی۔ بجوکا ان تمام ہندو مسلم شیعہ سنی میلوں، عرس اور جلوسوں کا مظہر ہے۔ اس سے امیدیں لگا کر عقیدتمند اپنی قسمتوں پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے یہ جملہ ماضی کے صیغے میں لکھا ہے کہ اب سب کی آنکھیں کھل چکی ہیں، کوئی یہ یقین نہیں رکھتا کہ اگر جلوس میں کسی مبارک ہستی کی شبیہہ جھلک گئی تو جاگیر تباہ ہوجائیگی، وبا پھیل جائیگی، فصل

تباہ ہوجائیگی، اب ہر جلوس ہماری انا کی تصویر ہے۔ فرد کی انا کا بھوت اب ہر قوم کیا اجتماعی انا کا دیوقامت خون آشام عفریت بن چکا ہے۔ بجو کا عوام کے استحصال کا ذریعہ بھی ہے اور اس کا ادراک ہی رابعہ کی ذہنی بالیدگی کا سبب بنتا ہے۔

افسانہ ''دھوپ کی تپش'' راہِ حیات میں ایک شجرِ سایہ دار کے نیچے گزرنے کی داستان ہے۔ مجھے ''پتلی تماشا'' پسند ہے۔ ایک مرد کے غم ومحرومیت کی کہانی لیکن یہ کٹھ پتلی ہے کہ عورت کٹھ پتلی ہے کہ بیوی، اس کو مار کر اسکی موت پر مرد کو افسوس تو ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں کہ کسی دوسری عورت یا کٹھ پتلی سے مداوا نہ ہوسکے۔ بلکہ افسانے میں کٹھ پتلی کا ٹوٹ جانا کسی۔۔۔ سے کم نہیں۔ اس مجموعے میں تین افسانے تارکینِ وطن کے مسائل سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے کی دو کہانیوں ''بے جرم ضعیفی'' اور ''خوں گشتہ'' پڑھ کر مجھے یہ عجیب سا خیال آیا کہ فعال زندگی وہ وطن ہے جسے چھوڑ کر ہم بڑھاپے کے دیس میں تارکِ وطن کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ایسے افسانے جنہیں پڑھنے سے خیال کی رو آگے بڑھے۔

حالات سدھر جانے ۔۔۔ ابھی تو بچے چھوٹے ہیں۔ انکی ذمہ داریاں پوری ہوتے ہی میں وعدہ کرتا ہوں تم کو ضرور حج کراؤنگا''۔ لیکن ریحانہ جانتی تھی کہ بچوں کی ذمہ داریاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ بچے کتنے ہی بڑے ہوجائیں وہ ماں باپ کیلئے بچے ہی رہتے ہیں اور انکے مسائل حل کرتے کرتے والدین کی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ ریحانہ جب بھی کوئی فیصلہ کرتی تو پوری توجہ اس کی طرف مرکوز کردیتی اور جب تک اسے حاصل نہ کرلیتی اسے چین نہیں آتا۔ اب اسکی ساری توجہ حج کی طرف مرکوز ہوگئی تھی۔ پچھلے پانچ سالوں سے اس نے اپنے اخراجات میں کٹوتی شروع کردی تھی۔ ہر وقت پیسہ بچانے کی فکر میں رہتی، اکثر زاہد کہتے ریحانہ تم آج کل بہت کنجوس ہوگئی ہو، مگر وہ اپنی دھن میں مست رہتی۔ پیسے بچا بچا کر صندوق میں ڈالتی رہتی، حالانکہ آج کل لوگ صندوق کے بجائے بینک میں پیسہ رکھتے ہیں لیکن ریحانہ کو یہ ڈر تھا کہ کہیں کسی کام کیلئے اسے وہ پیسے نکال نہ لینے پڑیں۔۔۔ اور آج پانچ سال بعد جب اس نے پیسے گنے تو اسکی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ زندگی میں وہ کبھی اتنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس نے اتنے سارے پیسے جمع کرلئے ہیں۔ کئی بار اس نے انہیں گنا اور جب اسے یقین ہوگیا تو اس نے زاہد کو فون کیا، ''آپ گھر کب آئیں گے؟'' ''کیا بات ہے، روز کے ٹائم پر۔۔۔ کیوں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اور زاہد کے گھر آتے ہی وہ اسکے سینے سے لگ گئی اور خوشی سے اسکے آنسو بہنے لگے۔ حج کا موسم قریب آرہا تھا۔ دوسرے ہی دن انہوں نے ایجنٹوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کردیا۔ حج پر جانے کے بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ ریحانہ کے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا ہر مشکل آسان ہوجائیگی۔ اسکی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا اور وہ انہیں حج کے بارے میں بتاتی۔ بچے ضد کرتے کہ امی ہم بھی جائینگے، لیکن وہ انہیں سمجھاتی ''بیٹا آپ لوگ ابھی چھوٹے ہیں، آپ پر حج فرض نہیں ہے۔ جب آپ بڑے ہوجائینگے۔۔۔ تو ضرور حج کرنا''۔ بچوں کو چھوڑ کر جانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اسکے ساس سسر بوڑھے تھے اور بچوں کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتے تھے۔ ننھیال میں اسکی صرف ایک بہن تھی اور بچے خالہ امی سے بہت مانوس تھے۔ بچے بھی بہت خوش تھے کیونکہ خالہ امی کے بھی چار بچے تھے۔ فرزانہ نے حج نہیں کیا تھا، اسکے وسائل محدود تھے، پچھلے دو سالوں سے اسکے شوہر کا کاروبار بھی بہت ماند پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے گزارا ہورہا تھا، مگر وہ خوش تھی کہ گو وہ خود حج پر نہیں جاسکی مگر ایک حج پر جانے والی کی مدد تو کرسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے بھی کچھ نہ کچھ ثواب تو دیگا۔

ریحانہ دن رات حج کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ اس نے اپنے لئے تین چار جوڑے کپڑے بھی سلوالئے تھے۔ وہاں گرمیوں میں سوتی کپڑے ہی کام آتے ہیں۔ اس نے سفر کی پوری تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ جوتے، چپل، دوائیں، راستے کیلئے خشک میوہ، لوگ کہتے ہیں بعض دفعہ بسوں میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ وہ روز ہی زاہد سے پوچھتی کہ ٹکٹ آگئے کیا اور زاہد جواب دیتے کہ نہیں جب تک ویزا نہیں ملے گا ٹکٹ نہیں ملیں گے۔ ایجنٹ نے کہا کہ دو چار دن میں ویزا ضرور آجائیگا اور وہ پھر خداوندِ کریم سے دعا کرنے بیٹھ جاتی۔ آج صبح سے اسکا دل بہت بے چین تھا جیسے اندر سے دل بیٹھا جارہا ہو اور وہ سوچنے لگی اسکی ایسی کیفیت کیوں ہورہی ہے، آخر لاکھوں لوگ تو حج پر جاتے ہیں؟ وہ باتھ روم میں تھی تو اسے فون کی آواز آئی۔ فون اسکے بہنوئی کا تھا۔ وہ پریشان ہوگئی، خالد تو اسکو بہت کم فون کرتے ہیں، کیا بات ہے؟ جلدی سے اس نے فون اٹھایا، خالد کی بات سنتے ہی جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو، فون اسکے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسکے ہاتھ پیر کانپنے لگے، فون پر خالد کی آواز آرہی تھی۔ فرزانہ کو بریسٹ کینسر ہوگیا ہے، کئی دنوں سے ہم پریشان تھے لیکن ہم نے یہ بات چھپائی لیکن آج ڈاکٹر نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسکا علاج کینسر ہسپتال میں نہیں ہوا تو اسکے بچنے کی امید نہیں ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، کینسر کے علاج میں بھی لاکھوں لگ جاتے ہیں۔ میرے پاس تو کوئی سرمایہ نہیں، نہ قرض لینے کا کوئی راستہ ہے، نہ میں اسے تڑپ تڑپ کے مرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں، یا اللہ کیا امتحان ہے؟ ریحانہ بستر پر گر کر بہت دیر تک روتی رہی، یا اللہ تو نے کیوں یہ موذی مرض میری بہن کو دیدیا، یا اللہ اسکو صحت دے۔ زاہد کے آنے کا وقت ہورہا تھا لیکن اس میں ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ اٹھ کر باورچی خانے تک بھی جائے۔ زاہد کے آتے ہی اس نے پھر سوال کیا کہ کیا ہمارے ٹکٹ آگئے؟ زاہد نے کہا ''ریحانہ کیوں اتنی بے چین ہورہی ہو، انشاءاللہ دو چار دنوں میں آجائینگے''۔

ریحانہ نے کہا ''اللہ کا شکر ہے، زاہد ایجنٹ سے کہئے ہم حج پر نہیں جائینگے، ہمارے پیسے واپس کردے''

زاہد کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ''ریحانہ یہ کیا کہہ رہی ہوں؟ کیا تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ حج پر جانے کیلئے تو تم دن رات تڑپ رہی تھیں اور

اب کیا ہو گیا ہے؟''

''زاہد آپی کو کینسر ہو گیا ہے، انکے پاس علاج کیلئے پیسے نہیں ہیں۔ ان پیسوں سے انکا علاج ہو گا۔ خداوندِ کریم سے دعا ہے کہ ہماری یہ عبادت کو قبول کرلے اور ہمیں حج کا ثواب عطا کرے، آمین!''

سعید کو میں کیا کہوں، علامہ اقبالؔ کہہ گئے ہیں

یقینِ محکم عملِ پیہم محبتِ فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

سعید کا یقین انسانیت پر ہے، وہ دنیا کی ہر اونچ نیچ، ظلم اور بربریت کو دیکھنے کے بعد بھی اس پر یقین رکھتا ہے کہ بالآخر انسان کے اندر چھپی ہوئی انسانیت اسکے ذاتی مفادات اور اسکی عصبیت کے اوپر حاوی آ جائیگی۔ اگر وہ یہ یقین نہ رکھتا تو قلم پھینک کر چین سے ٹی وی دیکھتا، گانوں پر سر دھنتا اور پاکستان اور پاکستانیوں کے مفادات کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھتا۔ حال ہی میں کینیڈا کے پس منظر میں جو ناول ''رنگِ گل'' لکھا گیا ہے اسکے ہیرو کا نقطہ نظر یہی ہے۔ اس ناول کے ہیرو کا زیادہ وقت کینیڈا کی صفائی، خوبصورتی اور وہاں کی خواتین پر اسکی دسترس کے بیان میں گزر جاتا ہے۔ اس حالیہ ناول کے تناظر میں سعید کے ناول ''گرداب'' کو دیکھا جائے تو اسکا دل ان دلوں کے دکھوں سے بھرپور نظر آتا ہے جو اسکے ہیں، ان سے چوتھائی صدی ان سے دور رہ کر بھی وہ انہی کا ہے۔ انکا بھی جو مظلوم ہیں اور انکا بھی جو ظالم ہیں۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مظلوم کو ظلم سے بچا کر، اسکا حق دلا کر اسکی طرف سے آواز اٹھا کر اور ظالم کی مدد کرو اسکو ظلم سے روک کر..... چونکہ وہ بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے۔

اس ناول میں تصویریں ہیں، ان لوگوں کی جن سے سعید کو ہمدردی ہے۔ ان میں پاکستان کا عام آدمی ہے جو پاکستان میں پس رہا ہے اور وہ بھی جس نے امریکہ میں رہائش لیکر سکون کو تلاش کیا لیکن اسکے ملک کے حالات اسکے تعاقب میں یہاں بھی آ گئے۔ اس میں ان لوگوں کی تصویریں بھی ہیں جن کو سعید غلط سمجھتا ہے لیکن وہ ان کے موقف سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان تمام عوامل کا اظہار کرتا ہے جنہوں نے انکی زندگیوں کو اس مقام پر پہنچا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ''You Have Choice'' زندگی کے ہر موڑ پر آدمی ایک سے زیادہ راہ اختیار کر سکتا ہے لیکن ملکی معیشت اور خاندانی ذمہ داریاں ہی نہیں غلط معلومات بھی انسان کو غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

عمل پیہم۔۔۔ سعید غلط کو صحیح کرنے میں مصروف ہے۔ سارتر نے کہا ہے کہ معاشرے کو آئینہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہو سکتا ہے، اس امید کے ساتھ معاشرے کو آئینہ دکھانا کہ شاید اس چہرے کو بدہیئتی اسکے افراد کو روش بدلنے پر آمادہ کر سکیں۔ تو سعید لکھتا رہتا ہے افسانے اور اب ناول کہ جو اسے درست نہیں لگتا اس پر، جو توجہ طلب ہے اس پر اور کبھی کبھی تو جو وہ لکھتا ہے صرف اپنے بچھڑے ہوئے معاشرے کا نوحہ ہوتا ہے۔

اس خامہ فرسائی سے اسے کیا ملا۔۔۔ شاید اپنے ہم خیال دوستوں کی تعریف لیکن یہ امید کہ اسکا پیغام محبت ہے اور شاید دور تک پہنچ جائے، اس سے لکھوا تا رہتا ہے۔ ناول لکھنا افسانہ لکھنے سے مختلف کام ہے، یہ فرق اتنا وسیع ہے جتنا غزل اور مرثیے میں ہوتا ہے۔ ناول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کرداروں کی ایک طویل فہرست ہے جس کے ہر فرد کا نہ صرف کچھ جواز ہوتا ہے بلکہ اس کے ہونے سے ناول میں ایک اور پرت کا اضافہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ ایک آدمی کی زندگی پر مبنی ہو لیکن گرداب میں ایک بھی کردار بے وجہ نہیں ہے۔ نواز کے نوجوان سالے بھی اپنے والدین کے امریکہ منتقل ہونے کی وجہ ہوتے ہیں۔ بڑے بیٹے کا شادی کیخلاف فیصلہ ہمارے معاشرے کے ایک مخصوص رویئے کا مظہر ہے جہاں جھوٹ میں گناہ چھپائے جاتے ہیں اور سچ برداشت نہیں کیا جاتا۔ ناول کا ایک اہم اور۔۔۔ کردار عمران اس جگہ کیسے پہنچا، سعید نے اسکی وجوہات دکھا کر اسکے ساتھ بھی انصاف کیا ہے۔ ایک ذہین نوجوان کو کیسے آسائش اور روپے نہیں اہمیت دینے سے اپنے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ متوسط طبقے کا لڑکا جس نے باپ کو سفید پوش کلرکی میں بے وقار دیکھا ہے، معاشرے سے اہمیت کا سوال نہیں بندوق کے زور پر یہ مطالبہ کر رہا ہے۔ 11 ستمبر کے دھماکہ خیز سانحہ سے کتنی زندگیاں ختم ہوئیں اسکا عموماً علم ہے لیکن کتنی اجڑیں یا کس طرح برباد ہوئیں انکا عکس اس ناول میں دکھائی دیتا ہے۔ دو تہذیبیں جو متصادم نہیں ہیں لیکن جب انہیں ایک وقت اور مقام پر برتا جاتا ہے۔ نواز کی بیوی اگر پاکستان میں ہوتی تو عورتوں کی زندگی کی ناانصافیوں کو اپنی ماں کی طرح درگزر کر دیتی لیکن امریکہ میں جہاں نہ صرف وہ جرأت مردانہ سے اپنے گھر کی حفاظت کر سکتی ہے وہیں ان۔۔۔ ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہاتھ سے رکھ دینے کے بعد بھی آپ کو یاد رہے۔ اسکے کردار اور واقعات کسی دوست کی زندگی کی طرح آپکے ذہن کا حصہ بن جائے۔

اسرارِ مصر

برطانوی ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق مصر کی ملکہ نیفر یٹی کو توتن خامن نامی فرعون کے مقبرے میں دفن کیا گیا تھا۔ جدید تحقیق کے مطابق اب یہ بات سامنے آئی ہے کہ بادشاہ توتن خامن کے مقبرے میں ایک راستہ دو چیمبرز کی جانب جاتا ہے اور ماہرین اسی چیمبر کو ملکہ نیفر یٹی کی آخری آرام گاہ قرار دے رہے ہیں۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو یہ اکیسویں صدی کی اہم دریافت ہو گی جس کی مدد سے قدیم مصری دور کے اسرار سے پردہ اُٹھ سکے گا۔

☆

خودمختاری کی تہمت

ن۔م۔دانش
(برسٹل، کنیٹکٹ)

سعید نقوی کے افسانوں کا مجموعہ 'نامہ بر' پڑھتے ہوئے مشکل یہ آن پڑی کہ کہنے کو سعید نقوی نئے لکھنے والے ہیں، لیکن ان کے بیشتر افسانے اتنے بھرپور، جامع اور مکمل ہیں کہ دل چاہتا تھا، چاہتا کیا تھا بلکہ چاہتا ہے کہ کہ کوئی ان کے افسانوں کے حوالے سے چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق کوئی بڑی بات کی جائے۔ کوئی بڑا دعویٰ اور اعلان کر دیا جائے، مثلاً یہ کہ سعید نقوی کا افسانہ 'پتلی تماشہ' ایک ایسا افسانہ ہے جسے اردو کے اچھے اور اعلیٰ ترین افسانوں کے ساتھ رکھ کر پڑھا جا سکتا ہے۔'' ظاہر ہے دعوے کے بعد ثبوت کا مرحلہ آتا ہے، جہاں دعویٰ ثابت کیا جا سکے۔

اب اگر بات صرف اس ایک افسانے اور اس کی قدر و قیمت کے تعین پر رکھی جائے تو سعید نقوی کے دیگر افسانوں کے بارے میں بات نہیں ہو سکے گی۔ جس سے یہ تاثر ابھرنے کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اس پوری کتاب میں یہی ایک اچھا افسانہ ہے، اس طرح سعید کے فن اور افسانوں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

نامہ بر میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ کچھ افسانے تکنیک اور بیانیہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے نزدیک ہیں جیسے 'جنگل کا قانون'، 'ابدی کھیل'، 'جگ بیتی' اور 'بغاوت' تمثیل، allegory, fable اور parable کے استعمال اور تعلق سے ایک ضمن میں رکھے جا سکتے ہیں۔ 'کالی آندھی' اور 'دین کے محافظ' اپنے بنیادی تھیم یا موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قریب ہیں اور 'آخرِ شب' اور 'دین کے محافظ' نکتہ نظر اور نتائج کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں کہ ان دونوں افسانوں میں آپ کو مکافاتِ عمل نظر آئے گا۔

سعید نقوی کے یہاں موضوع، زبان، اسلوب، پیرایہ بیان اور تکنیک کے اعتبار سے تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن اس تنوع میں ایک قدر مشترک ہے، بلکہ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ اس زمین اور اس پر بسنے والے انسانوں سے اس کی محبت اور وابستگی ہے۔ ویسے تو ہر لکھنے والے کا سروکار انسان سے ہی ہوتا ہے، لیکن زبان کی foregrounding کی طرح انسان کا مختلف انسانوں میں اس شدت کے ساتھ موجودگی کہ کہانی اور تھیم کے برعکس ہمارا ذہن صرف اور صرف انسانی صورتِ حال کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ سعید نقوی کے افسانوں کی خاص صفت یا خصوصیت ہے۔

انسانوں کے ساتھ سعید نقوی کی انسیت، وابستگی اور محبت ہر افسانے کی تہہ میں کارفرما ہے۔ لیکن اس کی یہ وابستگی کمزور، بے طاقت اور بے بس انسانوں کے ساتھ ہے بغیر کسی اعلان اور شور و غوغا کے۔ بلکہ اس کے افسانوں میں بعض اوقات انسان کی غیر موجودگی، انسان کی اس مجبوری کی صورتِ حال کو اور واضح کر دیتی ہے کہ کس طرح وہ ظلم و زیادتی اور تشدد کا شکار ہے۔ جیسے 'جنگل کا قانون' اور 'ابدی کھیل' جس میں کردار جانور ہیں۔ 'پتلی تماشہ' جس میں اہم کردار پتلیاں ہیں، سوائے ایک انسان کے، اور 'جگ بیتی' جس میں مرکزی کردار زمین ہے۔ لیکن ان افسانوں میں مجموعی انسانی صورتِ حال، ظلم، جبر، تشدد، نفرت، بے کسی، بے بسی، مجبوری اور بے طاقتی کی کیفیت جس طرح ابھر کے سامنے آئی ہیں، وہ دوسرے افسانوں میں اس طرح نہیں ابھریں جن کے مرکزی کردار انسان ہیں۔ البتہ 'کالی آندھی' اور 'دین کے محافظ' میں اجتماعی رویے اور تشدد کی وہ مکروہ شکل ہمارے سامنے آتی ہے جس سے ہم آج کل دوچار ہیں۔ سعید نقوی انسان کی کمزوری کو پیشِ منظر میں رکھ کر ظلم اور طاقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔

یہاں میں سعید نقوی کے تمام افسانوں کے تفصیلی مطالعہ سے گریز کرتے ہوئے اس کے ایک افسانے 'پتلی تماشہ' کے مطالعے پر اپنی توجہ مبذول رکھوں گا، جو ایک غیر معمولی افسانہ ہے۔

'پتلی تماشہ' ایک اچھے اور اعلیٰ افسانے کی عمدہ مثال ہے۔ یہ ایک مکمل، perfect افسانہ ہے۔ کفایتِ لفظی کے اعتبار سے، اس افسانے میں کوئی فقرہ، جملہ، منظر یا صورتِ حال ایسی نہیں ہے جسے افسانے میں اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے۔ اس افسانے کی مثال ایک اچھے اور اعلیٰ شعر کی سی ہے۔ جس طرح اچھے شعر میں کسی لفظ کو آگے پیچھے نہیں کر سکتے کہ ایسا کرنے سے شعر کا سارا حسن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ یا جس طرح ایک خوبصورت پتنگ میں رنگوں کا ایک متناسب امتزاج ہوتا ہے، اور رنگوں میں کسی قسم کی کمی یا تیزی اس کی روح کو متاثر کر دیتی ہے، یہی کیفیت اس افسانے کی ہے۔ اس اعتبار سے یہ 'بیانیہ' forgrounding کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے میں سعید نقوی کا فن اس حد تک مکمل ہے کہ بمشکل یقین آ سکتا ہے کہ یہ کسی نئے افسانہ نگار کا افسانہ ہے۔ میں اسے ایک شاہکار افسانہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ قاری کو اپنے judgement پر بھروسہ ہونا چاہیے۔

پتلی تماشہ ایک تہہ دار افسانہ ہے اور میں نے اسے مختلف طریقے سے قرات کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح یہ افسانے میں focalise ہوا ہے، یعنی وہ نکتہ نظر، تناظر اور سیاق و سباق جس میں کہانی بیان کی گئی ہے۔

اس افسانے میں سارے اہم کردار کٹ پتلی ہیں سوائے مداری کے۔ اس طرح اس افسانے میں دو دنیائیں، دو کہانیاں ایک دوسرے کو overlap کرتی ہیں۔ پتلیوں کی دنیا، پتلیوں کی کہانی۔ مداری کی دنیا، مداری کی

کہانی۔لیکن یہ مداری پتلیوں کی دنیا میں جی رہا ہے،اس کے دن ورات انہیں کے ساتھ گزرتے ہیں۔

پہلی نظر میں اس افسانے کی ظاہری مصنوعی سطح یہ بنتی ہے کہ یہ ایک ایسے گروہ (طبقہ؟) ایک ایسے فرد،ایک فنکار کی کہانی ہے جو ایک خاص فن اور ایک خاص کام میں مہارت رکھتے تھے۔دوسرے لفظوں میں اس گروہ کا تعلق ایک خاص فن پتلی تماشے سے تھا۔وہ فن، وہ کام جس کا تعلق انسانی سماج اور تہذیب کے تفریحی پہلو سے تھا۔

پتلی تماشہ قدیم ترین اینٹرٹیمینٹ یا تفریح کی ایک شکل تھی۔اب اس فن پتلی تماشے کی جگہ متحرک، چلتی پھرتی پتلیوں، فلم نے لے لی ہے۔اب ان کا فن دم توڑ گیا ہے کہ ہر گاؤں اور قصبے میں سینما بلکہ ٹیلیوژن کی شکل میں ہر گھر میں ایک سینما موجود ہے۔اب یہ پتلی تماشے کا فن نایاب ہوتا جا رہا ہے، اور اس فن کے ماہرین معدوم۔یہ فن اور فنکار اب نوادرات میں شامل ہیں۔اس طرح سینما اور ٹیلی وژن کے مقابلے میں قدیم ترین تفریحی آرٹ پتلی تماشے کی کہانی ہے۔یہ اس نایاب فن اور معدوم ہوتے فنکار کی تنہائی، غریبی اور کسمپرسی کی کہانی ہے۔جس کا تعلق انسانوں سے کم اور پتلیوں سے زیادہ ہے۔انسانوں سے اس کا تعلق اس حد تک ہے کہ:

''تماشہ دکھا کر گھر آنے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد جھگی سے باہر نکل گیا۔آخر سونے سے پہلے دو گھنٹے مچھیروں کے ساتھ مل کر بیڑی یا حقہ کا دور چلتا۔کوئی دیسی ٹھرا بھی لے آتا تو وہ رات اور لمبی ہو جاتی۔اس ٹھرے اور حقے کے درمیان بستی کے معاملات طے ہوتے۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا احوال پوچھا جاتا۔پولیس اور بدمعاشوں کے بھتوں کا ذکر ہوتا۔ان دونوں گروہوں کے تذکرے اکثر اتنے ملتے جلتے ہوتے تھے کہ دونوں میں تمیز مشکل ہو جاتی۔ساحل پر سیر کے لیے آنے والوں کے لطیفے اور چٹکلے بیان ہوتے، غرض خوب محفل جمتی۔آج بھی مداری اس ہو ہا میں شامل رہا کوئی رات نو بجے کے بعد جھگی واپس آیا، اور پلنگ پر کھیس بچھا کر لیٹ گیا۔کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی تو اٹھ کر پیلی ملکہ (پتلی) کو بستر پر ساتھ لٹا لیا۔''

اس پورے افسانے میں مداری کے ساتھ دوسرے انسانوں اور انسانی تعلقات کا ذکر بس اسی حد تک ہے یعنی صرف سات، آٹھ لائنیں۔اور اس میں بھی مداری کی تنہائی میں دوسرا تھ پیلی ملکہ (ملکہ) کا ہے جسے وہ اپنے ساتھ لٹا کر سوتا ہے۔مداری کی تنہائی اور خالص گہرے انسانی رشتوں کی مکمل تصویر اس وقت ہمارے سامنے آتی ہے جب وہ پچھتاوے کی حالت میں پیلی ملکہ کا بازو ہاتھ ٹانگ دوبارہ لگانے میں ناکامی کے بعد، پیلی ملکہ اس کے بازو اور ٹانگ کے ساتھ جھگی سے باہر نکل آتا ہے:

''بستی کیا تھی خالی پلاٹ پر تقریباً بیس جھگیاں بکھری پڑی تھیں۔کونے میں ایک نیم کا درخت سر اٹھائے کھڑا رہتا تھا، مداری نے اس کے نیچے تھوڑی سی زمین کھودی اور پیلی ملکہ کا دھڑ، بازو اور ٹانگ اس میں دبا کر مٹی برابر کر دی۔مرے مرے قدموں سے جھگی میں واپس آیا، بستر ٹھیک کرنے کا بھی حوصلہ نہ تھا۔چاندنی کو اٹھا کر ایسے سینے سے لگایا کہ گویا کٹھ پتلی کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہو۔اسی حالت میں بستر پر لیٹ گیا اور آپ ہی آپ رونے لگا۔''

ظاہر ہے یہ بات صرف ایک کٹھ پتلی کی نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کی موت ہے۔جس میں پچھتاوا بھی شامل ہے۔وہ چاندنی (پتلی) کو اٹھا کر سینے سے لگاتا ہے کہ وہ اس دکھ کو کسی اور کے ساتھ share شیر بھی نہیں کر سکتا تھا۔مگر اس افسانے کا آخری فقرہ ''آپ ہی آپ رونے لگا'' کی ممکن ہے کہ پچاس وجوہ اور تعبیریں بیان کی جائیں، مگر اس فقرے میں جو کیفیت ہے اسے صرف انسانی سطح پر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہ پتلیاں مداری کی محض کمائی کا ذریعہ ہی نہیں ہیں، اس کے خاندان کے افراد ہیں، جس میں محبت کے حقیقی انسانی جذبات کارفرما ہیں۔

اس افسانے کی خوبی یہی ہے کہ گرے انسانی رشتے، افسانے میں انسانوں کی غیر موجودگی سے ابھرتے ہیں۔اس افسانے کے اہم کرداروں میں صرف مداری ہی انسان ہے، باقی سارے پتلی ہیں۔لیکن اس پورے افسانے میں انسانی تعلق اور محبت کی روح موجزن ہے۔اسی وجہ سے پیلی ملکہ کی موت گھر کے ایک فرد کی موت بن جاتی ہے۔

آپ اس افسانے کو یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ پتلی تماشے کے فن یا پتلی تماشے کے فنکار مداری سے زیادہ پتلی تماشے کے کردار، یعنی کٹھ پتلیوں؛ پیلی ملکہ، دلآرام، چاندنی، دلربا اور بوا کے بارے میں ہے جو اس کے مرکزی کردار ہیں۔افسانے میں سارا ماجرہ اور کہانی ان ہی کی ہے۔جو کچھ رونما ہوتا ہے، ان ہی کے ساتھ ہوتا ہے۔اور جو کچھ بھی کرتے ہیں وہی کرتے ہیں یعنی تماشہ دکھانے کا کام۔اسی لیے ہوا کے زور سے پیلی ملکہ کا بلاؤز اترنے، اور جہاں دلآرام کو پیلی ملکہ کو سلام کرنا تھا تو غلطی سے دلآرام کے ہاتھ کی جگہ پیر اٹھنے سے پورا عمل متاثر ہو جاتا ہے، تماش بین ہنس پڑتے ہیں، اور کچھ منچلے سیٹیاں مار مار کے آوازیں کسنی شروع کر دیتے ہیں۔بظاہر تماش بینوں کی یہ حرکت پیلی ملکہ اور دلآرام کے خلاف ہے لیکن منہ مداری کا سرخ ہو جاتا ہے (غصہ یا شرم سے، اس کی تشریح آپ اپنی صوابدید پر کر سکتے ہیں، کہ سعید کے نثر کی یہ ایک خوبی ہے)۔کیوں؟ اس لیے کہ پتلیاں اس کی سبجیکٹ ہیں۔چلیے ہم اس نقطہ نظر کو ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں کہ تماش بینوں کے ہنسنے پر مداری کا چہرا اس لیے سرخ ہو گیا تھا کہ اس کے آرٹ اور فن کی توہین کی گئی، اس کا تمسخر اڑایا گیا۔اگر یہ درست بھی ہے، تب بھی ہم پتلیوں کے عمل کے اختیار کے معاملے کو کہاں ڈالیں گے؟ اس لیے سائے اس کے کہ پتلیاں سبجکٹ ہیں اس لیے مداری کو غصہ آ گیا تھا، اس کو کسی اور طرح نہیں دیکھا جا سکتا۔

پتلیوں کے نقطہ نظر یا perspective سے افسانے کے مطالعے

سے کہانی کا ایک اور رخ یا پہلو سامنے آتا ہے۔یعنی مظلوم ترین انسان۔ پتلی کا تماشہ دکھانے والا مداری بھی ایک نہایت ہی ظالم، خودغرض، لالچی اور بے رحم انسان ہے۔پیلی ملکہ جو اس کے لیے رقص کرتی ہے، کما کر دیتی ہے، وہ اسے محض اس لیے مار دیتا ہے کہ ہوا سے پیلی ملکہ کا بلاؤز اتر گیا تھا۔یہ کہ اس کی اپنی انگلیوں کی غلط حرکت سے دلآرام ایک مضحکہ خیز عمل کی مرتکب ہوئی جس نے تماش بینوں کے لیے تفریح، تمسخر اور تضحیک کا سامان پیدا کیا۔اس پوری صورتِ حال میں کٹھ پتلیوں کا اختیار اور عمل کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔انسان اپنی غلطی کی سزا پتلیوں کو دے رہا ہے؟ اس پوری صورتِ حال کا اطلاق انسان پر کیجیے، اسے ہماری مخصوص فکری، تہذیبی بلکہ مذہبی تناظر میں دیکھیے۔جبر و قدر، اختیار مجبوری، انسان کتنا بااختیار ہے اپنے عمل میں اور کتنا مجبور؟ مداری کی جگہ طاقتور حکمران اور طاقتور طبقے کو رکھیے۔یا خدا، نامعلوم طاقت اور قادرِ مطلق:

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

چلیے اب اس افسانے کو ایک اور تناظر میں دیکھتے ہیں۔:

پیلی ملکہ کی سزا کی وجہ ہوا کے زور سے اس کا بلاؤز اٹھ جانا ہے۔یہ ہوا نہ پیلی ملکہ کے کنٹرول میں ہے اور نہ خود مداری کے اختیار میں۔لیکن سزا بہر حال پیلی ملکہ کو ملتی ہے۔یہاں ایک اور بات بھی غور طلب ہے کہ مداری کا غصہ پیلی ملکہ کے بلاؤز کے اوپر اٹھ جانے پر ہے، گویا پیلی ملکہ واقعی کوئی عورت ہے۔اس میں ہمارے معاشرے کی عزت و غیرت کے تصور کو ذہن میں رکھیے (’دلدل‘ میں ایک باپ محض اس لیے اقدامِ قتل کا مجرم ہے کہ کسی لڑکے نے اس کی بیٹی سے فون نمبر مانگا تھا، اور وہ روزانہ گرلز کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑا رہتا تھا)۔ایک اور نکتہ نظر بھی قابلِ غور ہے کہ مداری کا سروکار عورت پتلیوں سے ہے، یعنی اسے کما کر دینے والی۔اس کے استحصال کا شکار ہونے والی ساری پتلیاں عورتیں (نام کے اعتبار سے) ہیں۔اب یہاں پتلی کی جگہ عورت کو دیکھیے تو ہماری ایک معاشرتی اور تہذیبی صارتِ حال کا اظہار ہوتا ہے، جس میں عورت ایک یا دوسری شکل میں جبر و تشدد کا شکار ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات کہیں بھی افسانے کے پورے ڈسکورس میں موجود نہیں ہے۔عورت اور تشدد دونوں غائب ہیں اور ان کی غیر موجودگی نے ہی انہیں ڈسکورس میں موجود کر دیا ہے۔

اس افسانے کی علامتی تعبیرات کو ایک طرف ڈال کر، اور یہ بھول کر کہ یہ کہانی اپنی اوپری اور ظاہری سطح کے علاوہ بھی معنی کی دوسری تہیں رکھتی ہے۔ہم اس افسانے کو ایک آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے پڑھتے یا سنتے ہیں، تو یہاں کٹھ پتلیاں صرف کٹھ پتلیاں ہیں، ان کے کوئی اور معنی نہیں ہیں، تب بھی یہ ایک مکمل اور عمدہ افسانہ ہے، جس کی کہانی کو آپ صرف کہانی کے طور پر پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔اس میں بنیادی چیز اس کی زبان اور بیانیہ ہے۔دوسرے الفاظ میں یہ کہہ لیجیے کہ وہ اس کی foregrounding ہے۔

مثلاً اس افسانے میں ہر چیز اس کہانی کا لازمی حصہ ہے، خواہ کوئی منظر ہو یا صورتِ حال، اور سعید ایسا صرف اپنے بیانیہ کی بنیاد پر کرتے ہیں۔یہاں بیان اور کہانی گھل مل گئے ہیں۔زبان باہر کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں کہانی بیان کی جا رہی ہے بلکہ یہ کہانی خود بیان کے اندر موجود ہے۔

''کچھ بچے اب بھی دلچسپی سے اسے سامان بٹورتے ہوئے دیکھ رہے تھے گویا یہ بھی تماشے کا حصہ ہو'' (صفحہ ۱۳)

''اس منڈیر پر پچھلے بیس سال سے مداری اپنی کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھا رہا ہے۔ہر روز تین بجے سے لے کر سورج ڈھلنے تک۔اور چھٹی والے دن صبح نو بجے سے لے کر شام کے جھٹپٹے تک، اس کا کھوکھا ری، پانی، سڑک اور دیوار کے ساتھ اس منظر کا ایک حصہ بن چکا تھا'' (صفحہ ۱۳)

'[لکڑی کے فریم کے پیچھے کھڑا مداری کٹھ پتلیاں ایسے نچاتا کہ مانو خود سے ناچ رہی ہیں۔اس کی دائیں ہاتھ کی انگلی کا اشارہ کٹھ پتلی کے جسم میں جیسے حرارت بھر دیتا۔انگوٹھے کی جنبش سے کٹھ پتلی کا سر مٹکنے لگتا۔درمیانی انگلیوں سے کٹھ پتلیوں کے نچلے دھڑ ہلتے تھے۔ساتھ ساتھ مداری کا نیم نثری نیم نظمیہ بیانیہ بھی چلتا رہتا:

'آج دربار ہمارا خالی ہے
بادشاہ سب کا والی ہے'

ساتھ ساتھ مجمع بھی کنٹرول ہوتا:

''شاباش بچو پیچھے ہٹ جاؤ، دو قدم پیچھے کی جانب، صاحبان دو قدم''

''پیلی ملکہ رانی ہے
دلآرام اس کی باندی ہے
بادشاہ جب بھی آتا ہے
دلآرام کو نچاتا ہے' (صفحہ ۱۴)

''دن ڈھلنے تک اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں پوریں اس کے اشاروں پر چلنے سے انکار کر دیتیں۔اور وہ زور لگاتا تو کوئی کٹھ پتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی، تو وہ اپنے بیانیہ میں اس حادثے کو بھی شامل کر لیتا۔(صفحہ ۱۴)

کوئی بھی ادبی فن پارہ (افسانہ، ناول) اپنی زبان یا لسانی اہلیت و اہمیت پر forground ہوتا ہے۔یعنی یہ کہ بات کیسے اور کس طرح کی جاتی ہے۔یا کہتے ہیں۔ forgrounding میں مصنف ایسے ڈیوائس اور تکنیک استعمال کرتا ہے جو اظہار کے عمل کو fore ground میں لے آتا ہے، اور زبان خود اپنی طرف قاری کی توجہ مبذول کرا لیتی ہے۔یعنی جس موثر طریقے سے ادبی زبان حقیقت کو پیش کرتی ہے۔اس میں زبان خارج کے حوالے سے نہیں خود اپنے حوالے سے اپنا جواز پیش کرتی ہے۔یہ زبان بذاتِ خود ادبی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔قطع نظر اس کے کہ وہ کتنی بڑی یا اہم حقیقت کو پیش کر رہی ہے، یہ زبان

کی 'ادبیت' ہی ہے جو فکشن میں بذات خود اہمیت اختیار کر لیتی ہے، اور فکشن کی زبان کو روزمرہ کی زبان سے نہایت باریکی کے ساتھ علیحدہ کرتی ہے، جیسا کہ جوائس کے بارے میں کسی نے لکھا ہے کہ:

His writing is not about something, it is that something itself.

یہ زبان کا something itself ہونا وہی ہے جو شاعری میں (زبان کے حوالے سے) defamialirization ''اجنبیانہ'' کہلاتا ہے۔ سعید نقوی کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت اس کی foregrounding ہے۔ اور کوئی بھی زیرک قاری سعید نقوی کی زبان کی ادبی literaryness کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سعید نقوی کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے تالہ ٹالطینہ کا خیال آیا۔ Calvino اپنی چالیس سالہ فنکارانہ زندگی اور ناول نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''میرا کام کرنے کا طریقہ اکثر اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ میں نے وزن ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی لوگوں پر سے، کبھی مقدس اجسام سے اور کبھی شہروں پر سے۔ اور سب سے زیادہ میں نے کہانی کی ساخت اور زبان سے وزن ہٹانے کی کوشش کی ہے۔''

سعید نقوی بھی وزن ہٹاتے ہیں۔ انسان پر سے، حیوانوں پر سے اور زمین پر سے، اپنی کہانیوں کے ذریعے۔ اپنے افسانوں میں انسانی نخوت، غرور، تکبر، انا، کروفر، ظلم، تشدد، زیادتی اور طاقت کی مکروہ اور قابل نفرین صورتوں کو پیش کر کے، وہ انسان کے اندر کی شرافت، اس کے وقار، امن، انصاف، حق پرستی، انسان دوستی اور محبت جیسی اقدار اور اوصاف جو کہیں کہیں پس منظر میں ہوتی ہیں، ان کی طرف قاری کا ذہن متوجہ کراتے ہیں۔ وہ زندگی پر سے وزن ہٹانے، اس کے بھاری پن کو دور کرنے اور اسے ہلکا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کالی آندھی، دین کے محافظ، بندگلی، ابدی کھیل، پتلی تماشیہ، ذود پشیمان، دلدل، سحرِ شب اور جگ بیتی میں اسی وزن کو پیش کیا گیا ہے جس نے انسان پر وزن ڈال کر زندگی کے بوجھ کو بہت بھاری کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں سعید نقوی کی تکنیک، اسلوب اور زبان خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ جس طرح وہ ان کو بروئے کار لاتے ہیں، وہ ان کے افسانوں کو ایک ایسی فنی پختگی بخش دیتا ہے جس کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہے۔

☆

''زندگی کا عکاس''

جانوروں کی تمثیلی کہانیاں ہمیشہ سے دنیا کے ادب کا حصہ رہی ہیں۔ سعید نقوی نے بھی جانوروں کی رمزیہ کہانیاں لکھی ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے جن افسانوں کو سب تعارف نگاروں نے سراہا ہے، ان میں زیادہ تر افسانے ایسے ہی علامتی افسانے ہیں۔ ہر کامیاب افسانے میں ایک ''بات'' ہوتی ہے۔ بات کو واوین میں رکھیے۔ جب قاری سارا افسانہ بھول جاتا ہے تب بھی وہ بات اس کو یاد رہتی ہے۔ یہی اچھے افسانے کی پہچان ہے۔

سید سعید افسانوں کے موضوعات سب ہی نیک ہیں، اور ان کو نیک نیتی سے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں بالغ نظری بھی ہے اور نفسیات رموز بھی۔ یہ نفسیاتی رمز پتلی تماشہ میں بھی مزا دیتی ہے۔ مجھے ان کا یہ افسانہ بہت پسند ہے۔ اس میں تماشہ دکھانے والے کے ساتھ جو خارجی واقعات پیش آتے ہیں وہ اس کی نفسیات اور احساسات پر کیسے اثر پذیر ہوتے ہیں، ان کا بیان بہت مؤثر ہے۔ ہم جولی میں ایک لڑکی کا کرب بہت نمایاں ہے۔ جس کا نام رانو نام کی بھینس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اور اسے یہ خیال ہے کہ رانو دودھ تو دیتی ہے، میں ماں باپ کے لیے کرتی ہی کیا ہوں۔ اور آخر میں یہ احساس اور پکا ہو جاتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی قیمت بھینس کی قیمت سے سو روپے کم پڑی ہے۔ اندبی کھیل میں یہ اشارہ ہے کہ آپس کی دشمنی میں اور جنگ کرنے میں زیاں ہی زیاں ہے۔ سانپ نیولے اور ابابیل کے تمثیلی قصے میں آج کے ملکوں کے لیے یہ واضح اشارہ ہے کہ ایک دوسرے پر شبہ کرتے رہنے، مخاصمت رکھنے اور مہلک ہتھیار بناتے رہنے سے سب کے ہی مٹ جانے کا خطرہ ہے۔

لکھنے والا معاشرے کی پیداوار ضرور ہے، مگر اسے معاشرے کے وہ عیب بھی نظر آتے ہیں جو دوسرے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ لکھنے والے کی گواہی ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔ اس معیار سے بھی دیکھا جائے تو سعید نقوی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ سچی گواہی بعض اوقات اپنے اور اپنے دوستوں کے خلاف بھی دینی پڑتی ہے، جیسے سعید نقوی نے اپنے اس ہم پیشہ ڈاکٹر کے خلاف لکھا جو بیحد بے درد تھا۔

ادیب کو زندگی کا عکاس کہا جاتا ہے، مگر وہ محض کیمرہ یا آئینہ نہیں ہے، وہ باطنی آنکھ رکھنے والا کیمرہ اور سوچنے والا آئینہ ہے۔

رضیہ فصیح احمد

میرا 'فونی' دوست

گوہر تاج
(مشی گن، امریکہ)

خواتین وحضرات سب سے پہلے تو ہم اپنے اور آپ کے درمیان یہ بات صاف کر لینا چاہتے ہیں کہ اس ادبی محفل میں سعید نقوی جیسے مستند افسانہ نگار، شاعر، مترجم اور ناول نگار پر گفتگو کی جسارت اس بات کی ہرگز دلیل نہیں، کہ ہمارا ادب سے گہرا بلکہ ہلکا پھلکا سا بھی براہ راست کوئی تعلق ہے۔

ناول 'گرداب' کی تقریب رونمائی میں اس حادثاتی عزت افزائی کا سہرا آبیل مجھے مار کے مترادف خود صاحب، کتاب کے سر بندھتا بلکہ منڈھتا ہے، جنہوں نے ایک ڈیڑھ ماہ قبل اپنا تازہ ناول گرداب اس نوٹ کے ساتھ بذریعہ ڈاک بھجوایا کہ ''تاحال میری فونی دوست گوہر تاج کی خدمت میں''۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ ہم نے سعید کی سعید مندی، نیک نیتی اور اخلاص پر شک نہ کرتے ہوئے لفظ 'فونی' کو فون کا ماخذ ہی تصور کیا۔ یہ بات واقعی حقیقت ہے کہ کئی بار گفتگو کرنے کے باوجود سعید سے یہ ہماری فیس ٹو فیس، یعنی ''منہ در منہ'' پہلی ملاقات ہے۔ ہر چند کہ ہمارا شمار اگلے وقتوں کے لوگوں کی مانند ان میں ہوتا ہے جو کہ تکنیکی اعتبار سے چیلنجڈ (challenged) قرار پائے ہیں۔ تاہم ای میلز، فون اور اسکائپ جیسی ایجادات پر ہمارا ایمان پختہ ہے کہ جن کی بدولت ہم نے کچھ بہت نایاب دوستوں کا سراغ پایا۔ جن میں چند نمایاں نام عشرت آفرین، انجم خلیل، ن م دانش اور سعید نقوی وغیرہ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کو دیکھا بعد میں اور دوستی پہلے ہوئی، اور وہ بھی ایسی کہ جس پر اعتماد کے ساتھ فخر کیا جا سکے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ سعید سے 'فونی' دوستی کی ابتدا کسی اتفاقی حادثے کی دین ہے۔ لیکن بحیثیت قلم کار غالباً اس میں ہم دونوں ہی کی کچھ معصومانہ بلکہ نیم مجرمانہ خواہش کا دخل رہا ہوگا کہ کس طرح کسی دوسرے ادیب تک ہماری کتابیں پہنچیں، اور کچھ محنت سوارت ہو، یعنی ٹھکانے لگے۔ شاید اس کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ پہلے سعید نے اپنے افسانوں کی کتاب 'ٹک ٹک دیدم' اپنے اس نوٹ کے ساتھ بھیجی کہ 'انسان دوست اور حساس لکھاری، گوہر تاج کے ذوق مطالعہ کے لیے'، یہ جانے بغیر کہ ان کی قسمت میں آگے کیا لکھا ہے۔ یعنی یہ کہ ان کی بدقسمتی اور ساتھ ہی ہماری خوش قسمتی کہ عین اسی زمانے میں ہماری تین کتابیں بھی پاکستان سے نئی نویلی دلہن کی طرح، بڑے کارڈبورڈ کے ڈبوں میں خاصے اہتمام سے امریکہ وارد ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سعید کی کتاب کی وصولیابی کے بعد ہم نے بلا کسی تاخیر بلکہ منٹ کی چوتھائی میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے، یعنی ایک کتاب کے بدلے میں اپنی تین کتابوں کا پیکٹ ڈاک کے سپرد کیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کچھ دنوں کے بعد فون کر کے یہ یقین بھی کیا گیا کہ 'پیکٹ وصول بھی پایا یا نہیں؟' پھر اگلی چند فونی باتوں میں یہ بھی پوچھا کہ ان کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا یا نہیں، اگر ہاں تو کیس لگیں، اور اگر نہیں تو کیوں؟ اور اسی قسم کے متجسس سوالات۔۔۔۔

سعید کو بہر حال اپنی کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ آپس کی بات ہے کہ شاعری کے مقابلے میں، جو کہ اکثر ہمارے سر سے گزر جاتی ہے، افسانہ ہماری پسندیدہ صنف ٹھہرا۔ ہاں البتہ ناول کا معاملہ کچھ الگ سا ہے۔ نوجوانی میں اداس نسلیں، ٹیڑھی لکیر، آگ کا دریا، ماں اور جانے کتنی ہی ضخیم ناولوں کو عزت سے بھگتانے کے بعد اس پیرانہ سالی میں کچھ عرصہ سے ناولوں کو طلاق تو خیر نہیں، لیکن علیحدگی کا معاملہ کچھ ضرور چل رہا ہے۔ یونہی جیسے کچھ معمولی جھگڑے، اور کچھ یکسانیت، اور بیزاری میں بیوی روٹھ کر میکے بیٹھ جائے، اس امید پر کہ شاید ساجن منانے آ ہی جائیں، اور نہ بھی آئیں تو خیر ہی ہے۔

ہم نے سعید کے افسانوں اور بعد میں ناول کو بھی بغور ہی نہیں بلکہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھا اور کیوں کہ ہم ٹھہرے سماجیات کے طالب علم، لہٰذا سوشل ورکر کی عینک لگا کر پڑھا۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر یہ بات تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سعید نے اپنے قلم کو محض تفریحاً نہیں اٹھایا، اور نہ ہی یہ سوچ کر کہ وہ عظیم قلمکار کہلائے جائیں۔ بلکہ میری رائے کے مطابق ایک حساس اور دردمند دل رکھنے والے، باشعور فرد کی حیثیت سے جو سماج میں امن وآشتی کا طلب گار ہے۔ سعید نے قلم کا جہاد اپنی ذمہ داری سمجھا۔ بلاشبہ تخلیق کار کا قلم اٹھانا اسکی جبلت کا حصہ ٹھہرا، لیکن جو موضوعات انہوں نے منتخب کیے ہیں، وہ انتہائی اہم ہیں۔ ان کے خوبصورت، پرتاثر افسانوں میں ہمیں جو موضوعات ملتے ہیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں: معاشرتی فرسودہ روایات، طبقاتی تفریق، جنس کی بنیاد پر تفریقی رویہ، مذہب کی آڑ میں روا منافقانہ رویہ، صوبائی اور لسانی تفرقہ بازی وغیرہ۔ ان کی کہانیوں کا پس منظر بالخصوص شمالی امریکہ نقل مکانی کرنے والی جنوب ایشیائی بستیوں کے حوالے سے اہم ہے۔ ان کے بیان میں سادگی، روانی اور زبان پر عبور ہے۔

لیکن جس خوبی کا میں یہاں خاص کر ذکر کرنا چاہوں گی وہ یہ کہ انتہائی سنجیدہ اور تکلیف دہ موضوعات مثلاً مذہبی تنگ نظری، علاقائی اور لسانی تعصب اور معاشرتی بے حسی پر پوری دردمندی سے ڈوب کر لکھتے ہوئے بھی طنز ومزاح کی شگفتگی تحریر میں کچھ اس طرح جھلک جاتی ہے کہ آنکھوں میں نمی کے باوجود بھی آپ کو ہنسی پر اختیار نہیں رہتا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کبھی کبھار سورج کی تمازت اور دھوپ کے باوجود کوئی بادل کا شریر ٹکڑا اٹھکھیلیاں کر جائے، اور تھوڑی دیر کو ہی سہی آپ کے اداس وجود کو بارش کے چھینٹوں کی نمی سے سرشار کر دے۔ دیکھا جائے تو یہ رویہ انسانی اقدار کی ابتری پہ نوحہ کنی کے باوجود ایک مدافعتی عمل ٹھہرا جو غموں کی شدت سے مکمل طور پہ ٹوٹنے سے بچا لیتا ہے۔ اس اندازِ تحریر کی اعلیٰ ترین مثال ''رہزنِ ایماں'' (ایک افسانہ) میں نظر آتی ہے، جو میری

نظر میں ان کا نمائندہ افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔۔اب یہ بات اور ہے کہ ان کی تحریر کا یہ مخصوص انداز کسی نقاد کے نزدیک افسانے کے تاثر کو مجروح کرنے کے مترادف ہے،لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ان کا یہ انداز انہیں منفرد بھی بناتا ہے۔

یہاں ایک اور افسانے کا ذکر ضروری ہے، جو انہوں نے ''آٹزم'' کے حوالے سے لکھا،جس کا عنوان ہے''پرایا جرم''،جس میں انہوں نے آٹزم میں مبتلا بچوں کی زبان میں اس کی کیفیت اور محسوسات کو اس دردمندی سے لکھا ہے کہ آپ کے آنسو رواں ہو جائیں۔میرے خیال میں سعید نے یہ افسانہ لکھ کر، ہزاروں بلکہ لاکھوں ماؤں اور ان گھرانوں کے دل موہ لیے ہوں گے کہ جن کے بچے آٹزم یا کسی اور معذوری میں مبتلا ہیں۔

اب کچھ گفتگو اس کتاب، یعنی گرداب کے حوالے سے بھی کہ جس کے لیے آج یہ محفل سجائی گئی ہے:

میری نظر میں یہ ناول روایتی ناول سے بڑھ کر تاریخ پر نظر رکھنے والے اس طالب علم کا طویل تحقیقی مقالہ ہے،جس کو انہوں نے ایک ساتھ چلنے والی کہانیوں کی آرائش اور اس کے کرداروں کے زیور سے روکھی پھیکی دستاویز کے بجائے ایک دلچسپ کتاب میں تبدیل کر دیا ہے۔یہ ناول ایک خاص مقصد کے لیے بیانیہ اور سادہ انداز میں قلم بند کی گئی ہے۔کہ جس میں دانستہ طور پر ابہام اور علامتوں سے دامن چراتے ہوئے تخلیقی سفر رواں رکھا گیا ہے، تاکہ ادب کا عام قاری بھی اس سے اپنا ناطہ جوڑ سکے۔یہ بات بھی اہم ہے کہ پاکستان سے نقل مکانی کرنے والے سعید نقوی کا تہذیبی ، ثقافتی اور مذہبی ورثہ بھی ناول کے کرداروں سے مماثلت رکھتا ہے، جو ناول کو مزید پر تاثیر بنا دیتا ہے۔

ناول کا زمانی پس منظر، حالیہ دور اور اس کی بنیاد گیارہ ستمبر کا دلخراش واقعہ ہے کہ جس نے پوری دنیا کا منظر نامہ ہی بدل دیا۔ٹون ٹاورز کی مسماری سے پیدا ہونے والی دردناک لہروں کے ارتعاش کو پورے عالم میں محسوس کیا گیا۔اب یہ الگ بات ہے کہ کہیں ماتم ہوا تو کہیں مٹھائی بانٹی گئی۔بلاشبہ انسانی تاریخ اس قسم کے سفاکانہ اور دہشت ناک خونی واقعات سے پُر اور رنگین ہے، اور ان کی یاد تاریخ کی قبر پر لگے کتبہ کی طرح ہمیشہ کے لیے ایستادہ ہے۔تاہم اس واقعے کا منفی اثر جتنا اسلامی دنیا کے باشندوں اور بالخصوص امریکہ میں رہنے والے مسلمانوں پر پڑا ہے غالباً کسی اور قوم پر نہیں۔

سعید نقوی نے ایک حساس اور سوچ بچار کرنے والے ذہن کے ساتھ اس واقعے کے محرکات کے حوالے سے سوالات اور جوابات کا سلسلہ قائم کیا جو ظاہر ہے کہ ناول میں چلنے والی کہانیوں کے کرداروں کے ذریعے مکالموں کی صورت انجام پایا۔یہ سوالات عروس البلاد کراچی کے وجود کو تار تار کرنے والے عوامل سے شروع ہو کر، نیویارک شہر اور اس کے محلوں میں بسنے والے مختلف بود و باش کی معاشرت کی قوموں کے متعلق معلومات دیتے ہیں تاہم کہانی میں مرکزیت پاکستان سے نقل مکانی کرنے والوں کے سماجی،ثقافتی اور سیاسی مسائل کو حاصل ہے کہ جہاں دو مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے نوجوانوں، بزرگوں اور خواتین کو درپیش مسائل کے ناگ پھن اٹھائے کھڑے ہیں کہ آگے ان کے حل کی کیا صورت ہو؟

میں بہت تفصیل میں جائے بغیر چند موضوعات کا صرف نام لوں گی۔بالخصوص ہجرت سے وابستہ متضاد ثقافت یعنی کلچرل شاک کے حوالے سے مثلاً ڈیٹنگ، اسقاطِ حمل میڈیکل انشورنس، بزرگوں کے مسائل، مہاجر عورتوں کے مسائل وغیرہ۔اس کے علاوہ وہ مسائل کہ جن کا سامنا پوری دنیا بالخصوص مسلمانوں کو ہے۔مثلاً مذہبی تنگ نظری، نسلی فرقہ واریت، عرب اسرائیل زمینی جھگڑا۔ امریکہ کا دنیا میں جاگیردارانہ یا پولیسانہ کردار، عرب دنیا کی جہالت اور اسی طرح کے بے شمار مسائل۔سعید نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ موجودہ حالات میں درپیش ان مسائل پر گفتگو میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔انہوں نے ان سے وابستہ موضوعات کو کہانیوں کے کرداروں کے ذریعے سوالات اور جوابات کی کڑیوں کی مدد سے ابتدا سے آخر تک بڑے سلیقہ سے جوڑا ہے۔یہ سلیقگی یقیناً مصنف کے اپنے ثقافتی، مذہبی، سماجی اور منطقی استدلال کی آمیزش کا نچوڑ ہے۔اس لحاظ سے ہم اس ناول کو آپ بیتی کے زمرے میں ڈال سکتے ہیں۔جس میں براہ راست کلام کے بجائے وہ کرداروں کے ذریعے قاری سے متکلم ہیں، اور اپنی رائے دے رہے ہیں۔''گرداب'' کی صورت میں سعید نے ایک ایسا آئینہ تراشا ہے کہ جس میں مسلمان پاکستانیوں کو اپنی صورت دکھائی دیتی ہے۔وہ افراد بھی کہ جو اس وقت پاکستان میں رہ رہے ہیں اور وہ بھی جو امریکی معاشرے میں تشخص کی جنگ لڑ رہے ہیں۔اس آئینے کے پس منظر میں صوبائیت، مذہبی تعصب، فرقہ بندی اور مختلف لسانی جھگڑوں کی ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔آئینہ میں نظر آنے والی تصویریں بھیانک ہی سہی، مگر یہی تو میرے دوست کا منشا ہے کہ ذہنوں میں سوالات اور احتجاج کی روسی دوڑ جائے۔سینوں میں ایک آگ سی لگ جائے کہ جسے عقل، ادراک، رواداری، محبت اور برداشت بالآخر ایک گلزار میں تبدیل کر دے۔

بقیہ: ''انفرادی عمل''

لینے کے لیے یہاں بھی ایلوگیری کا استعمال کیا ہے۔شاید اجتماعی صورت حال کو بیان کرنے کے لیے ایلوگیری کا استعمال سب سے موثر طریقہ کار ہے۔یا کم از کم سعید نقوی کے یہاں یہی ہے۔

اسی طرح ان کا فسانہ ''صبح کا بھولا'' بھی انفرادی عمل میں اجتماعی صورت حال ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے دوغلے پن اور تضاد کا اظہار کرتا ہے۔

زندگی شعر کے کوچے میں

علی اکبر ناطق

(اسلام آباد)

مجھے اچھی نثر سے ہمیشہ رغبت رہی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں اچھی نثر ملتی ہے مَیں اُس کے لکھنے والے سے مانوس ہو جاتا ہوں۔ اگر ملاقات نہ بھی ہو لیکن یہ مانوسیت اس طرح ہوتی ہے کہ میں کبھی اُس کا نام نہیں بھولتا۔ سعید نقوی صاحب کو میں اُن کے افسانوں اور تراجم سے جانتا تھا جو 'دنیا زاد' اور 'آج' میں گاہے گاہے چھپتے رہے۔ پچھلے سال جب کراچی میں اُن سے ملاقات ہوئی اور یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں اور کئی غزلیں کہہ رکھی ہیں۔ میں اُن کی شاعری پڑھنے کا اس لیے زیادہ شائق ہوا کہ جو شخص اپنے افسانوں میں دل کے لطیف احساسات کو اتنی جاذبیت اور ہنرمندی سے نباہ لیتا ہے وہ شعر میں اِنہی احساسات کو کیسے استعمال کرتا ہوگا۔ پھر انہوں نے مجھے اپنی تمام غزلیں ای میل کر دیں۔ آج اُن کا مسودہ میرے سامنے موجود ہے اور مجھے یہ جان کر ہرگز اچنبھا نہیں ہوا کہ انہوں نے افسانے اور خواب کے درمیان کی کیفیت کو جمالیات اور جذبات کا آہنگ دے کر اپنے شعروں میں بُننے کی کوشش کی ہے۔ خیالات میں ایک لاشعوری ترتیب موجود ہے جو کسی بھی جینوئن آرٹسٹ کے نجی یا ذاتی نظریات میں پائی جاتی ہے۔

میرا شعر کے متعلق جو اپنا نظریہ ہے وہ میں کئی جگہوں پر بیان کر چکا ہوں۔ اُسے خلاصے کے طور پر دہراتا چلوں کہ شعر اپنی تخلیق میں چار بنیادی عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یعنی جو لفظ استعمال کیا گیا ہو، وہ ایک ہی وقت میں جذبے کے معنی بھی دے، رنگ بھی واضح کرے، حرکت بھی رکھتا ہو اور تصویر بھی بناتا ہو۔ اگر شعر میں استعمال شدہ لفظ یہ چاروں باتیں پوری کرے تو پھر وہ لفظ شاعرانہ اظہاریہ بنتا ہے۔ دوسری صورت میں شعر میں لفظ کا استعمال مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ذرا کم ہی ہو پاتا ہے۔ مگر ایک شاعر کو کسی حد تک اس کا پتا ضرور ہونا چاہیے۔ تب ہی وہ اس وادیِ پُرشور سے گزرنے کی کامیاب کوشش کر سکے گا۔ مجھے ڈاکٹر سعید نقوی صاحب کی شاعری سے کم از کم یہ تاثر ضرور ملا ہے کہ وہ ان حُسن کے پیرایوں سے واقف ضرور ہیں۔ رعایتِ لفظی کو بخوبی جانتے ہیں اور جذبے کی شدت میں اُسے کیسے کام میں لایا جاتا ہے یہ بھی انہیں پتا ہے۔ میں نے اُن کی جتنی غزلیں پڑھی ہیں اُن تمام غزلوں میں سعید نقوی صاحب کا مسئلہ شعر برائے قافیہ نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے اندر ایک بات ہے جو وہ شعر کے جمالیاتی پیرائے میں سامع یا قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور ہر غزل میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا نکل آتا ہے جو دل کے مقفل تختوں پر ہلکی تھاپ کی دستک دے کر آگے نکل جاتا ہے۔ اُن کے الفاظ کا چناؤ زندگی کے بالکل قریب رہتا ہے اور آواز کی سرگوشی کان کی لووں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ شعر نہیں کہتے گویا سرگوشی کرتے ہیں۔ مثلاً

آج سوچا تو بہت مشکل سے
تیری صورت کے خدوخال بنے

اور یہ سوچنے اور خدوخال بنانے کی اُن کی عادت ایک جگہ پر ہرگز تمام نہیں ہوتی۔ وہ شعری آہنگ میں زندگی کی حقیقتوں کو مسلسل سوچتے ہیں اور اُنہیں بیان کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات جو مجھے اُن کے افسانوں میں خاص کر اور کسی حد تک انتخاب شدہ تراجم میں محسوس ہوئی وہ شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے اور وہ ہے اُن کا اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ کر دلاسا نہ دینے کا رویہ۔ وہ اپنے آپ کو کسی دلاسے اور دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کا رویہ اُن کے اندر بہت زور کے ساتھ موجود ہے۔ وہ جانتے ہیں خواب تعبیر سے علاقہ نہیں رکھتے لہذا وہ اُن کا پیچھا بھی نہیں کرتے۔ اسی لیے اوپری اور سطحی ستائش کو لائق توجہ نہیں سمجھتے۔ چاہے وہ ستائش اپنے دوست ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔

تری تنقید تو دل کی زباں تھی
جو شکوہ ہے وہ تیری داد کا ہے

آرٹ کا کوئی شعبہ ہو، یہ پارٹ ٹائم کام نہیں ہے۔ آرٹسٹ کو اپنے شب و روز اس میں جھونکنے پڑتے ہیں اور جان کو دیے کی نوک پر جلانا ہوتا ہے تب کہیں ریزہءنور ہاتھ آتا ہے۔ یہی حالت سعید نقوی کی ہے وہ اپنے آپ کو نثر ہو، یا نظم، نور کی انہی بستیوں میں گوہر ڈھونڈتے ملیں گے۔ وہ زندگی کو آرٹ سمجھتے ہیں اور آرٹ کے لیے جذبوں، خوابوں، رنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے آرٹسٹ زندگی کے سفر میں اپنے ہی ساتھ چلنے کی بجائے کسی یادستان کی شاخوں کا سہارا لیتا ہے۔ سعید نقوی کا بھی یہی روگ ہے جو اُسے زندگی کی وادی وادی میں لیے پھرتا ہے۔ وہ اپنے جذبوں کو اسی لیے کھل کر کہتا ہے۔

میں اپنے ساتھ بھی چلتا کہاں تک
ہر اک رستہ تمھاری یاد کا ہے

مجھے سعید نقوی کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ پتا نہیں ہے اور نہ اُن ذرائع کو جانتا ہوں جو اُسے ادب کی خارزار وادیوں میں کھینچ لائے، مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے جہاں بھی ہوش کی آنکھ کھولی تو کہیں نہ کہیں زندگی کو بے رنگ اور بے لطف ضرور پایا اور اُس کے لیے وہ کرب میں مبتلا بھی ہوئے۔ اسی لیے وہ اپنے افسانوں اور شاعری میں اُن بے رنگ خاکوں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ضرور نظر آتے ہیں یا اگر رنگ نہیں بھر سکتے تو بے رنگ خاکوں پر نوحہ خوانی کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اندرونی طور پر وہ ایک مکمل سوز و گداز اور جمالیات کے انسان ہیں۔ مگر کیا کیجیے کہ نوحہ خوانی درد کو کم نہیں کر سکتی اور دکھوں کو راحتوں میں

بدل نہیں سکتی۔ یہ سب اُن کو پتا بھی ہے ۔وہ جانتے ہیں کہ ہر طرف ابہام ،دھندلاہٹ اور نسیان کا غلبہ ہے جس کی تہوں میں کہیں حقیقی خدوخال چھپے ہوئے ہیں ۔اُن کو واضح اور صاف کرنا ایک آرٹسٹ کا کام ہے مگر وہ کتنا کر سکتا ؟ چنانچہ اُسے کہنا پڑتا ہے اور کتنے احسن طریقے سے کہتا ہے۔

یہ کیسا رنگِ نسیاں ہے کہ جس میں
بہت خاکے ہیں لیکن رنگ غائب

شعر کی جمالیاتی پرتوں کے بارے میں سعید نقوی کتنا واقف ہیں اور کیا کچھ جانتے ہیں؟ یہ سوال ہر قاری اپنے تخلیق کار سے ایک غیر اعلانیہ طرز کی خموشی کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ اُس قاری کا حق بھی ہے کیونکہ آرٹ کی طرف رجوع اُسی وقت کرتا ہے جب اُسے حظ اور سرخوشی درکار ہوتی ہے۔اور زندگی کے اکتا دینے والے معمولات سے گریز کرنا ہوتا ہے۔اگر آرٹ زندگی ہی کی طرح ٹھوس اور جامد ہو تو اُسے مایوسی ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اُسے رعایت لفظی اور اور شعری آہنگ کا اتنا احساس ضرور ہے کہ شعر اپنے تمام تلازمات کے ساتھ قاری کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ مجھے اس وقت شعر کے معنی و مفہوم پر لیکچر نہیں دینا نہ اس مضمون میں اتنی گنجائش ہے مگر اُس کے ایک شعر سے میں اُن تمام جہتوں کا احاطہ کر سکتا ہوں جو روایت کو جدید ادبی معیارات سے جوڑتی ہے اور پردیس میں بیٹھا ہوا سعید نقوی ہی اس طرح اپنی روایت کو جدید وقعت کے دائرے میں لا کر اس طرح کہہ سکتا تھا۔

تری یادوں کے جالے صاف کر کے
بہت بے وزن ہو کے گھر گیا میں

اور اب میں سعید نقوی کی اس غزل پر اپنی بات ختم کرتا ہوں جسے میں جب بھی پڑھتا ہوں مجھے ایک گونہ نشاط حاصل ہوتا ہے اور میں یہ غزل کئی بار پڑھ چکا ہوں۔آپ بھی پڑھیے اور حظ اُٹھایے۔

تمھارے زعم و تفاخر پہ کچھ نکھار آیا
میں جتنی بار گیا اور میں جتنی بار آیا
یہ پیش قدمی ہوا کی ذرا رُکی تو ہمیں
کچھ اپنے گھر کے چراغوں پہ اعتبار آیا
مرے حساب میں جتنے اُدھار تھے تیرے
انہیں اُتارنے آیا تو خود کو ہار آیا
ترا جمال مرے ذوق کا ہے آئنہ
نظر کے سامنے دیکھا تو خود پہ پیار آیا
تمھارا حسنِ نظر لوٹنے نہیں دیتا
خود اپنی آنکھ سے دیکھا تو اعتبار آیا

سعید صاحب جیتے رہیے اور ہمیں اسی طرح کی شاعری سناتے رہیے۔

''نفیس افسانے''

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانوی مجموعے سے پہلے ہی ان کی افسانہ نگاری سے تعارف ہوا۔ پہلے کچھ خیال نہیں کہ ان کو پڑھا تھا کہ نہیں۔مگر یہ ''دوسرا رخ'' پڑھ کر تو مزا آ گیا،خصوصاً اس مجموعے کے پہلے افسانے ''آٹو ورکشاپ'' کا چودھری افتخار جس طرح نیویارک کے ایک گوشے میں اپنی پاک آٹو ورکشاپ کو یوں چلا رہا ہے گویا پاکستان کے ایک گوشے لالو کھیت میں بیٹھا، اپنی زبان، اپنے روز مرہ اور محاورے کا دھڑلے سے استعمال کر کے دیارِ غیر کے اجنبی ماحول اور تناظر کو خالص پاکستان بنانے پر مُصر ہے۔اس افسانے کو پڑھ کر احساس ہوا کہ بات زمان و مکان یا کسی ماحول یا تناظر میں نہیں ہوتی۔اصل بات تو کردار کی ہوتی ہے، وہ جہاں چاہے اور جس ماحول میں بیٹھے وہاں اپنا ماحول اور تناظر تیار کر لیتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے دوسرے افسانوں میں جو سچائی اور حقیقت نگاری ہے وہ کسی تلخ یا زہرناگی کی بجائے خندہ جبینی اور ہمدردی کے ساتھ سچ کو ہم تک پہنچاتے ہیں۔

اچھا خیر وہ تو چلتے چلتے ایک بات رواداری میں لکھ گئی ورنہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ اتنے نفیس نرم و نازک افسانوں پر اپنی رائے پہنچاؤں۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر سید سعید نقوی اردو ادب کے لیے ایسا مفید اضافہ ثابت ہوں گے جس سے اردو زبان و ادب مغرب میں اپنی پہچان اور شناخت کو بہتر بنا پائیں گے۔

الطاف فاطمہ

☆

''معرکہ ذات''

(انتخابِ اختصار)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

رت جگوں کو کبھی عادت نہیں بننے دیتے
کشتہ شب اسے لذت نہیں بننے دیتے

جانے کیا سوچ کے پتھر وہ لیے پھرتے ہیں
سطح آب پہ صورت نہیں بننے دیتے

ہم نے ہر زخم کو جرات سے سوا رکھا ہے
ڈھال کی تیغ سے نسبت نہیں بننے دیتے

گاہے گاہے ترے چہرے پہ نظر کرتے ہیں
چشمِ حیراں تجھے حسرت نہیں بننے دیتے

رخ چراغوں کا بدلتے ہیں ہوا کے ڈر سے
گردِ ایام کو زحمت نہیں بننے دیتے

مان لیتے ہیں ہر اک بات ضروری اپنی
معرکہ ذات کا، وحشت نہیں بننے دیتے

چاکِ دامن کو بہ ہر طور سیا کرتے ہیں
دل کے آزار کو تہمت نہیں بننے دیتے

روز کرتے ہیں طوافِ رخِ زیبا تو سعیدؔ
اس کو آنکھوں کی ضرورت نہیں بننے دیتے

..... ○ .....

باہر کا کچھ رنگ نیا ہے کھڑکی میں
دستک دیتی آئی ہوا ہے کھڑکی میں

جس کی خاطر یہ فصیلِ ذات اٹھی تھی
آج وہی پھر شخص کھڑا ہے کھڑکی میں

اندر کے سب چہرے دیکھے بھالے ہیں
باہر کا کچھ رنگ نیا ہے کھڑکی میں

چاند یہاں تک آ کر واپس لوٹ گیا
جانے کیا منظر دیکھا تھا کھڑکی میں

خود کو باہر دیکھ کے میں یہ حیراں ہوں
آج یہ کیوں پردہ سا پڑا ہے کھڑکی میں

جب بھی اس نے تنہا دیکھا ہے مجھ کو
دل نے جلایا ایک دیا ہے کھڑکی میں

دل میں جو آئے پناہوں کے بہانے آئے
کوئی تو ہو جو نشیمن کو جلانے آئے

اپنی تصویر لگانی تھی نمایاں ان کو
مری بنیاد پہ دیوار اٹھانے آئے

وحشتوں میں کئی ایسے بھی زمانے آئے
تجھ کو ہم بھول گئے خود کو منانے آئے

آئنے لائے ہیں شفاف بہت صاف بہت
نئے انداز سے وہ دل کو دکھانے آئے

چاک دامان کی کیا بخیہ گری سیکھ گئے؟
مدتوں بعد مرے دوست بلانے آئے

کچھ نئے پھول سجائے نئے موسم رکھے
پھر بھی دل میں وہی مہمان پرانے آئے

دوستوں کے واسطے بکتا رہا میں ہر قدم
نرخ کچھ گرتا گیا، گھٹتا رہا میں ہر قدم

یہ خبر رکھی کہ میرے دائیں بائیں کون ہے
بس خیالِ بے خودی رکھتا رہا میں ہر قدم

تھی سفر کی رات اور کچھ خواب تھے زادِ سفر
ایک دشتِ نارساچلتا رہا میں ہر قدم

اس مکاں سے لا مکاں رکھا نظر کے سامنے
درمیانِ دو جہاں چلتا رہا میں ہر قدم

بر مزارِ آدمی میں فاتحہ کو بھول کر
ان کے کتبوں پر لکھا پڑھتا رہا میں ہر قدم

اک جہاں کی آنکھ میں جھونکی ہے میں نے دھول پر
آپ اپنا سامنا کرتا رہا میں ہر قدم

بدگمانی کی ہوائیں سب اڑا کر لے گئیں
دوستی کے بیج جو بوتا رہا میں ہر قدم

آسماں سے داستاں پر داستاں آتی رہی
آدمی کی سادگی لکھتارہا میں ہر قدم

موج آتی ہی رہی ساحل پہ اپنے کام سے
دامنِ امید تر کرتا رہا میں ہر قدم

..... ○ .....

☆

مٹی کی یہ دیوار کوئی در نہ رہے گا
بارش جو رکے گی تو یہ منظر نہ رہے گا

اس چاک پہ وحشت کی یہ گردش نہ رکے گی
پتھر نہ رہے گا یا مرا سر نہ رہے گا

اب خواب لپیٹیں گے تو تعبیر کی خاطر
تاروں کی گھنی چھاؤں میں بستر نہ رہے گا

جو پیچھے کھڑے تھے وہ سبھی ہار گئے ہیں
اب سامنے والوں کا کوئی ڈر نہ رہے گا

کچھ دیر اگر اور اسی شہر میں ٹھہرے
وحشت تو رہے گی کوئی پتھر نہ رہے گا

بارش یہاں نفرت کی اگر ہوتی رہے گی
پھر لوگ تو ہوں گے مگر یہ گھر نہ رہے گا

○

☆

اگر مدار بھی بدلا ہے مہ و اختر کا
میں راستہ نہیں بھولا مگر کبھی گھر کا

ہمارے پاؤں سے مٹی وطن کی لپٹی رہی
ہزاروں میل سفر کر لیا سمندر کا

بنا کے چھوڑ دیے جو گھروندے بچپن میں
سجا رہا ہوں اب اطراف ان کے باہر کا

جہاں میں مصلحت اوڑھے خموش رہ جاتا
وہیں پہ بول اٹھا شخص میرے اندر کا

جو آگئے تھے بھٹک کے مقامِ فرصت میں
سفر وہیں پہ ختم ہو گیا تھا اکثر کا

اداس نسل کی بے خواب رات کا عالم
سعیدؔ چھوڑ دیا ہے خیال بستر کا

○

زندگی کا قرینہ

یہ جو اپنے آنگن میں
اک درخت کہنہ ہے
اس درخت کہنہ کی
اک عجیب فطرت ہے
موسمِ خزاں میں یہ
یاس اوڑھ لیتا ہے
اس کا ایک، اک پتا
اس سے روٹھ جاتا ہے
جب بہار آتی ہے
اس کی ساری شاخوں پر
کونپلیں نکلتی ہیں
سبز منظروں کی رت
شاخ پر اترتی ہے
نخلِ سبز قامت پر
چاندنی برستی ہے

یہ روایتِ کہنہ
آج بھی حقیقت ہے
اس شجر کو مت کاٹو
انتظار باقی ہے
پھر بہار آئے گی
کونپلیں بھی پھوٹیں گی
پھول بھی کھلے ہوں گے
سایہ بامرادی کا
صحن میں بھرا ہوگا
شاخ پر نشیمن ہوں
چہچہے پرندوں کے
سبز گود میں جھولا
پینگ لیتی دوشیزہ
گیت ہوں امنگوں کے
سبز منظروں کی رت
پھر زمیں پہ اترے گی

پکاسو کا مشورہ

میں نے کل پکاسو کی
یہ مصوری دیکھی
ہونٹ جس میں کالے تھے
اور جس کے سینے پر
آنکھ بھی بنی دیکھی
شاید اک مصور کو
یہ پیام دینا تھا:
''آدمی بنانے میں
احتیاط لازم ہے!''

سرخ انار

جب بھی تو سامنے آیا تھا مرے
دل میں چھوٹے تھے کئی سرخ انار
سرمگیں شام کے چومے ہوئے وہ سرخ انار
ان اناروں میں ہی دیکھا ترے رخسار کا رنگ
جب بھی ہونٹوں نے کبھی پایا ہے وہ لمسِ انار
لب پہ اس شامِ گزشتہ کی نمی لوٹ آئی
قید رکھا ہے یوں ہی خانوں میں ہر دانے کو
جیسے تصویریں سجا رکھی تھیں تیری دل نے
ساعتِ چند کا مہمان ہے وہ رنگِ انار
کاش یہ بات تجھے پہلے بتا سکتا میں

کالاموتیا

آج ایک کالے کو
مرسڈیز میں دیکھا
دل میں وسوسے جاگے
ڈرگز کا یہ پیسہ ہے؟
عورتوں کی دلالی؟
یا ہے بینک کا ڈاکو؟
ہو نہ ہو یہ گاڑی بھی
پار کر کے لایا ہے!
اس دھیان میں میرا
پاؤں اس طرح الجھا
مرسڈیز سر پر تھی
موت سامنے رقصاں
میرا سر بچانے کو
مرسڈیز والے نے
اپنی گاڑی دے ماری
راستے کے کھمبے سے
سر مرا سلامت تھا
مرسڈیز چکنا چور
کالے نے سلاست سے
میری خیریت پوچھی
میرے منہ سے یہ نکلا
میری آنکھوں میں، بھائی!
موتیا ہے کالا سا

○

اجنبی زمانے میں

میں کیا کر رہا ہوں یہاں
جس زمانے میں تو نے اتارا مجھے
یہ اس زمانے کا موسم نہیں
یاں بادِ صبا میں تو تخریب ہے
گئے وقتوں کی الجھن کی تکرار ہے
خود سے انساں یہاں محوِ پیکار ہے
بے یقینی کے سورج سرِ آسماں
تمازت سے جن کی پگھلتے رہے
سب ہی بندھن محبت کے پہچان کے
جیسے خوں سے نہیں
ہوں بنے موم سے
اب تو ایمان وایقاں کی اس دھوپ میں
اجالے محبت کے تاریک ہیں
تیرے وعدے بہاروں کے، وعدے رہے
صدی در صدی بھیجے افلاک سے
جو صحیفے محبت کی تلقین کے
کیا وہ ضایع گئے
یاں فضا میں مروج وہی سب تو ہے
ارزانی لہو کی ہے اب بھی وہی
دخترانِ حرم کا مقدر وہی
زمیں بھی وہی آسماں بھی وہی
تو بھی وہی اور بشر بھی وہی
کیا یہ ممکن ہے خلاق فطرت تری
اس سے پہلے نئی مہم جوئی کرے
ہو بشر کا کوئی تجزیہ کیمیائی

○

گرداب

سید سعید نقوی

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دو ٹاور نیویارک کے علاقے مین ہٹن کے مغربی ساحل پر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ مین ہٹن خود بھی ایک جزیرہ ہے، اس کے مشرقی ساحل پر دریائے ہڈسن اسے نیویارک کے علاقے کوئنز، اور مغربی کنارے کا دریا اسے ایک اور ریاست نیوجرسی سے علیحدہ کرتا ہے۔ بقیہ نیویارک اور نیوجرسی سے روزانہ لاکھوں لوگ روزگار کی خاطر مین ہٹن کا سفر کرتے ہیں۔ اس وقت مین ہٹن ساری دنیا کا معاشی دارالخلافہ تھا۔ دنیا بھر کی لین دین کی سانس کی ڈوری مین ہٹن کی صحت سے بندھی تھی۔ اس میں واقع وال اسٹریٹ کے اسٹاک ایکسچینج میں روزانہ کے حصص کی خرید فروخت کئی ترقی یافتہ ملکوں کے سالانہ بجٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر، مین ہٹن کی ناک تھے۔ اس کی وجاہت کا باعث تھے۔ یہ اپنی ذات میں خود ایک دنیا تھی، جس میں دفاتر، ریسٹورانٹ، شاپنگ سب ہی تو شامل تھا۔ یہاں ہزاروں لوگ ملازمت کرتے۔ اور اس سے بھی بڑی تعداد میں سیّاح اس کے سائے میں اپنی تصویر اتار کے ان چند ساعتوں کو محفوظ کر لیتے۔ ان میں ہر رنگ و نسل، ہر زبان کے بولنے والے اور ہر خدا کے سامنے جھکنے والے شامل تھے۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارتوں کے انہدام نے قیامتِ صغریٰ پیدا کر دی۔ ہر سمت دھواں ہی دھواں تھا۔ فضا میں اتنی مٹی اور گرد و غبار تھا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ ہر طرف جلنے کی بو تھی، فضا میں گوشت کی چراند گھل رہی تھی۔ دونوں سرو قامت عمارتوں کے آس پاس کی کئی عمارتیں بھی ان کے اثر سے یا تو زمیں بوس ہوئیں یا اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار کہ انہیں منہدم کرنا پڑا۔ عمارتوں کے انہدام سے پہلے ہی نچلی منزلیں آتشزدگی کا شکار تھیں۔ ٹی وی پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارتوں کی کھڑکیوں سے لوگوں کو زندہ چھلانگ لگا کر موت کے منہ میں جاتے دیکھا گیا۔ عمارتیں کیا تھیں جیسے آگ کا ایک گولہ تھا جس کی ناقابلِ برداشت حدت ہر چیز کو پگھلائے دے رہی تھی۔ ایسی صورت میں عمارت میں پھنس جانے والے افراد جل کر مرنے کی بجائے عمارتوں سے کود کر یکدم موت کو ترجیح دے رہے تھے۔

عمارتوں کا ملبہ کئی میل کے رقبے پر بکھر گیا تھا۔ دور دور تک جسمانی اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ زخمیوں کی کراہوں سے فضا گونج رہی تھی۔ آلودگی کے سبب چند انچ سے زیادہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ امریکی یہ مناظر ٹی وی پر دیکھ کر بے بسی سے کھول رہے تھے اور خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ مین ہٹن سے آمد و رفت کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے تھے۔ ہزاروں لوگ جو روز ملازمت کے لئے یہاں آتے ہیں ان کی واپسی کے سب راستے مسدود ہو گئے۔ زیرِ زمین دوڑتی ریلیں اپنی پٹریوں پر جم گئیں۔ لاکھوں لوگوں کا ایک جمِ غفیر اپنے جوتے ہاتھوں میں اٹھائے میلوں کا سفر پیدل طے کر کے کسی ایسے مقام کی تلاش میں تھا جہاں سے انہیں کوئی سواری مل سکے۔

ٹی وی پر اب تفصیلات آنا شروع ہو گئی تھیں۔ افواہیں، خبریں، بیانات۔ مصدقہ اور غیر مصدقہ۔ دنیا، دم سادھے ان عمارتوں کے ملبے سے اٹھنے والے ہنگامے کی منتظر تھی۔ اطلاعات نشر ہو رہی تھیں کہ کُل ملا کے انیس دہشت گردوں نے چار جہازوں کو اغوا کر لیا تھا۔ دانستہ بڑے حجم کے جہازوں کو چنا گیا تھا، جو امریکہ کے شمال ترین ہوائی اڈوں بوسٹن، نیوجرسی اور واشنگٹن سے پرواز کر کے مغربی ترین اڈوں یعنی لاس اینجلس کی جانب عازمِ پرواز تھے۔ مشرقی ساحل سے امریکہ کے مغربی ساحل کے لئے تقریباً چھ گھنٹے کی پرواز کے لئے بڑے جہاز اڑتے ہیں جن میں ایندھن کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یوں زیادہ سے زیادہ تباہ کاری کو یقینی بنایا گیا تھا۔

واقعات کی تفصیل ایک تسلسل سے ٹی وی پر دہرائی جا رہی تھی۔ پہلا جہاز صبح آٹھ بج کر چھیالیس منٹ پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرایا۔ سترہ منٹ بعد یونائیٹڈ کی پرواز ۱۷۵ جنوبی ٹاور سے ٹکرائی۔ جب کہ نو بج کر سینتیس منٹ پر امریکی ایرلائن کی پرواز پینٹاگون کی عمارت میں جا گھسی۔

چوتھی پرواز، یونائیٹڈ ایرلائن کی پرواز نمبر ۹۳، دس بج کر تین منٹ پر پٹس برگ کے جنوب مشرقی حصے میں گر کر تباہ ہوئی۔ ٹی وی پر مبصرین شبہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ پرواز غالباً وائٹ ہاؤس کی سمت لے جائی جا رہی تھی۔ لیکن کیوں کہ اس پرواز کے مسافروں کو فون کے ذریعے دوسرے جہازوں کی بربادی کا علم ہو گیا تھا۔ کچھ مسافروں نے باہمی مشورے کے بعد اغوا کنندگان پر یلغار کی اور اس کش مکش میں یہ طیارہ اپنے ہدف سے پہلے ہی تباہ ہو گیا۔ امریکی شہریوں نے جان کی قربانی دے کر امریکی پایہ تخت کو ممکنہ تباہی سے بچا لیا۔ وائٹ ہاؤس کی تباہی یقیناً امریکی برتری پر ایک علامتی داغ ہوتی۔ دکھ، خوف اور وسوسے میں گرفتار امریکی قوم کو پرواز نمبر ۹۳ کے مسافروں کے روپ میں وہ ہیرو مل گئے جن کے سہارے یہ قوم اپنے آپ کو اس دلدل سے نکال سکتی۔

مین ہٹن میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے اطراف قیامت برپا تھی۔ درمیانی منزلیں، جہاں جہاز ٹکرائے تھے، آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔ ٹاور کی نچلی منزلوں کے لوگ بھاگ کر باہر نکلنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو کچلے دے رہے تھے۔ آگ کی عفریت کی گرفت میں آئی منزلوں سے اوپر کی منزلوں کے لوگوں کے لئے نیچے اترنے کے راستے مسدود تھے۔ لوگ کھڑکیاں کھول کر بے چارگی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ ان کے لئے آگ سے جل کر موت یقینی تھی۔ ساری دنیا اس سانحے میں ٹی وی کے ذریعے شریک تھی۔

فوادا سکول بند ہونے کی وجہ سے شدید بوریت کا شکار تھا۔ دس ستمبر کی

رات وہ اپنے دوست کی سالگرہ کے بعد اس کے گھر ہی رک گیا۔صبح اپنے دوست کی تجویز پر وہ بھی اس کے ساتھ مین ہٹن آ گیا تھا۔مین ہٹن آ کر بھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر نہ دیکھنا تو کفرانِ نعمت ہوتا۔جب پہلا جہاز ٹکرایا تو دونوں دوست اس کی چھت پر لگی دوربینوں سے اپنا گھر تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی دونوں دوست اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن جب تک وہ کوئی فیصلہ کرتے، اس میں کئی قیمتی منٹ ضائع ہو گئے۔فواد نے اپنے دوست کا ہاتھ تھاما اور نزدیک ترین لفٹ کا رخ کیا۔لفٹ میں گنجائش سے اتنے زیادہ لوگ سوار تھے کہ دروازہ بند نہ ہو پایا۔لوگ ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔زندہ رہنے کی جبلت انسانیت پر حاوی ہو رہی تھی۔لفٹ کے اندر موجود لوگوں نے دھکے دے کر سامنے موجود لوگوں کو باہر کیا اور دروازہ بند ہوا تو سب نے سکون کا سانس لیا۔لفٹ شاید سرکی ہی تھی کہ اچانک بتیاں گل ہو گئیں اور لفٹ ایک جھٹکے سے رک گئی۔لفٹ میں گھپ اندھیرا تھا، تازہ ہوا تیزی سے معدوم ہو رہی تھی۔خواتین نے رونا اور چیخنا کیا شروع کیا، سب ہی اس میں شامل ہو گئے۔کیا مرد کیا عورت، لوگ دعائیں پڑھ رہے تھے، رو رہے تھے، آئندہ راہ راست پر چلنے کے ارادے کر رہے تھے۔فواد کو بہت ڈر لگ رہا تھا، اس نے اپنے دوست کے شانے پر سر رکھا اور رونے لگا۔

لفٹ میں اچانک درجہ حرارت اتنا بڑھ گیا جیسے کسی نے تنور کا منہ کھول دیا ہو۔آگ کا ایک لپکا سا اٹھا اور سب کچھ خاکستر ہو گیا۔فواد کے ذہن میں جو آخری شکل ابھری وہ شکیلہ کی تصویر تھی۔

زندگی اپنا راستہ آگ میں سے بھی نکال لیتی ہے۔کچھ لوگ اس آگ کے دریا سے بھی باہر نکل آئے، ان کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی، تکلیف کی شدت سے منہ سے چیخیں جاری تھیں۔فائر مین انہیں زمین پر گرا کر ان پر جھاگ کا نلکا کھول دیتے۔وقت کم تھا اور جانوں کا زیاں زیادہ۔ایسے میں نظم و ضبط کی امید رکھنا دیوانگی تھی۔دنیا بھر کے ٹی وی سیٹ گویا آتشزدگی کا شکار تھے۔کیمرے نے اٹھترویں منزل سے جھانکتے ایک شخص کو دیکھا تو کیمرہ اس پر مرکوز کر دیا۔دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔اس کا جسم تیزی سے زمین کی طرف آیا اور ایک بس کی چھت سے ٹکرا کر، پتھریلی زمین پر آ گرا۔سر میں سے خون اور دماغ کا ملا جلا مواد بہہ کر اطراف کے فرش کو رنگین کر گیا۔جسم کا بقیہ بھی ایک گوشت کے لوتھڑے کی مانند بے شکل ہو گیا۔غیر ارادی طور پر ایک فائر مین اس کی سمت بڑھا، لیکن ٹھٹک کر چند قدم پہلے ہی رک گیا۔اس کا ہاتھ اپنے منہ تک بلند ہوا اور اس نے کھڑے قدم سے قے کر دی۔زندگی بھر انسان اس خوف میں جیتا ہے کہ اختتام کیسے ہوگا، آنکھ آخری رنگ کیا دیکھے گی، کس کی صدا گوش بر انداز ہوگی۔اس دن ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے باسیوں کے لئے آخری رنگ آتشی تھا اور آخری آواز چیخ و پکار، آہ وزاری، پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں سے اٹھنے والے سائرنوں کی چیخ تھی۔ایک شخص نے بلندی سے چھلانگ کیا لگائی، جیسے کئی بالائی منزلوں پر موجود بے بسی مورتیوں کو ایک فوری اور یقینی موت کی راہ سجھا گئی۔دھڑا دھڑ لوگوں نے اسی، نوے اور سو سے زیادہ بلندی کی منزلوں سے چھلانگ لگا کر موت کی وادیوں میں عافیت تلاش کی۔شاید بعض حالات میں مرگ، حیات کے بعینہٖ لمحات پر فوقیت لے جاتی ہے۔ابھی چشم اس منظر کے صدمے سے بحال بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک ٹاور اپنی پوری شان و شکوہ، بلندی اور عظمتوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔گرد و غبار کا وہ عظیم غبار اٹھا کہ فاصلے تاریکیوں میں ڈوب گئے۔اس ٹاور کے گرنے سے ہوا کا ایک ایسا دباؤ پیدا ہوا کہ گرد و غبار دور دور تک پھیل گیا۔اس غبار میں انسانی جسم کے اعضا بھی شامل تھے۔کہیں کہنی سے نیچے کٹا ہوا ہاتھ، تو کہیں موزے جوتے سمیت ران کے جوڑ سے کٹی ٹانگ ہوا میں گھومتی زمین پر آ گری۔ہوا کے اس دباؤ میں آس پاس کھڑی گاڑیاں، کیمرے، گلی میں رکھے کوڑے کے ڈرم سب ہی تو زد میں آ گئے۔

ابھی یہ قیامت ذہنوں سے اتری بھی نہیں تھی کہ دوسرا ٹاور بھی زمیں بوس ہو گیا۔جو عمارتیں کئی سال، سینکڑوں ٹن سریا، سیمنٹ اور انسانی ذہن کے کمالِ فن سے تعمیر ہوئی تھیں وہ چشمِ زدن میں مٹی ہو گئیں۔دوسرے ٹاور کے گرنے سے جیسے اس قیامت کو تقویت مل گئی۔لوگ چیخ پکار رہے تھے، لیکن فضا میں جیسے ایک تکلیف دہ سناٹے کا راج تھا۔امدادی عملے نے اطراف کی عمارتوں کو خالی کرانا شروع کر دیا، سربلندی سے ہمسائیگی انہیں مہنگی پڑی تھی۔یہ حملہ امریکہ کی سائیکی میں غیر موجود تھا، ان کا پہلا ردِعمل حیرانی تھا۔لیکن ناممکن نہ صرف ممکن ہو گیا تھا بلکہ چشمِ وا نے اسے دیکھا بھی تھا۔

(ناول کا ایک باب)

☆

''عقلِ ناتمام''

○☆○

یہ ازل ہے کیا، یہ ابد ہے کیا، یہ زمیں ہے کیا، یہ زماں ہے کیا
اِسی مخمصے کا شکار ہوں، یہ جہاں ہے کیا، وہ جہاں ہے کیا
مرا علم ہے بس ایک آبجو، ترا علم ہے یمِ بیکراں
مجھے کیا خبر، مجھے کیا سمجھ، کہ یہاں ہے کیا یا وہاں ہے کیا

حافظ محمد احمد
(راولپنڈی)

عید قرباں سے پہلے ہی

(غیر مطبوعہ کہانی)

سید سعید نقوی

''اوئے خانہ خرابی، ابی تم نیچے آجاؤ'' صادق خان نے اپنے بیٹے دلیر خان کو پیار سے ڈانٹا، جو چوتھی بار ہاتھ جھولے پر چکر لگا رہا تھا۔ بچہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں جسمانی قلابازیاں لطف دیتی ہیں۔ دونوں باپ بیٹے ابھی عید کی نماز ادا کر کے نکلے تھے۔ عید گاہ کے نزدیک مختلف بازی گر، پھول فروش، عطر فروش خوانچے والے جمع تھے۔ عید کا دن فرقہ وارانہ تفریق سے پاک، سب ہی کے لیے خوشی کا دن تھا۔ سب ہی چہروں پر مسکراہٹ سجی تھی۔ نئے لباس میں ملبوس بشاش چہرے۔ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے، مبارک باد دے رہے تھے۔ کچھ لوگ تو اپنی سواریوں میں بیٹھ کر گھر کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

سورج نے اپنی روشنی سے تاریکی کو تو شکست دے دی تھی، لیکن ابھی اپنے تنور کا ڈھکنا نہیں کھولا تھا۔ ہوا بھی زمین سے کچھ اوپر ایسی احتیاط سے چل رہی تھی کہ مبادہ مٹی بھی اس کے ساتھ نہ اڑنے لگے۔ دائیں ہاتھ پر ایک مداری کے ہاتھ میں ڈگڈگی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لوگوں نے ایک دائرہ بنا کر اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی جس کے دوسرے سرے پر ایک بندریا تھرک رہی تھی۔ بندریا کی کمر پر اسکرٹ نما جھالر نے معنی خیز مماثلت پیدا کر دی تھی جس سے مردانہ حسِ مزاح اور تیز ہو گئی تھی۔ سگریٹ فروش، ایک اخبار کا ہاکر سب ہی تو جمع تھے۔

''دلیر خان، بچے، تو نے نماز سے پہلے بھی ایک پھیرا لیا تھا۔ ادھر تمارا ماں سویاں بنا کے بیٹھا ہے، اب تم نیچے اتر آؤ''۔ صادق خان جو عام دنوں میں اس وقت تک غصے میں آپے سے باہر ہوتا، اس نے آج صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ آج کوئی عام دن تو نہ تھا، آج تو عید کا دن تھا!

''بابا، بس ایک چکر اور'' نو برس کے دلیر خان کو اس عمر میں بھی یہ تو معلوم تھا کہ آج کے دن اسے مار نہیں پڑنی۔ عید کے دن کوئی ایک دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ وہ اسی رعایت سے فائدہ اٹھا کر چار دفعہ ہاتھ جھولے پر بیٹھ چکا تھا۔ کن انکھیوں سے باپ کو دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ لیکن اسے صادق خان کے لہجے کا تجربہ تھا اور زبانی و جسمانی تنبیہ کے درمیان لہجے میں فرق پیدا ہوا کرتا تھا وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ لکڑی کے خوش رنگ ڈنڈے اس جھولے کا بنیادی ڈھانچہ تھے۔ اس میں مخالف سمتوں میں چار ہنڈولے ٹنگے تھے، یوں کہ جب جھولے والے اوپر کے ہنڈولے کو نیچے کی جانب دھکیلتا تو نیچے کا ہنڈولہ آپ ہی آپ اوپر چلا تھا۔ چاروں ہنڈولوں میں بیٹھے سواریوں کی اوسط عمر دس برس رہی ہوگی۔ جھولا اوپر جائے یا نیچے ان کے لطف میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔

''خان صاحب، ایک چکر اور لینے دو، بچہ ہے، پھر آج عید کا دن ہے۔ یہ تو بچوں کی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ میں اس آخری چکر کے پیسے نہیں لوں گا۔'' جھولے والا ہاتھ روکے بغیر بولا۔ صادق خان جو روزگار کی تلاش میں 'وطن' چھوڑ کر کراچی چلا آیا تھا، اب تک صبح سے کوئی پانچ چھ بار مختلف حیلوں بہانوں سے یہ جملہ سن چکا تھا کہ ''بھئی آج تو عید کا دن ہے''۔ اس فقرے کے صدقے لوگ کئی ایسی باتوں کو درگزر کر دیتے جو عام دنوں میں ممکن نہ ہوتیں۔ پانچواں چکر مکمل کر کے دلیر خان جھولے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے چہرے کی خوشی دیدنی تھی۔ بچے کو اتنا خوش دیکھ کر صادق خان کا دل بھی مسرت سے بھر گیا۔ اس نے کرتے کی اوپر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیس روپے نکالے اور جھولے والے کی پھیلی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ دلیر خان نے نسوار رنگ کی شلوار قمیض پر کالی کوٹی پہن رکھی تھی، جس پر رنگین دھاگوں سے چھوٹے چھوٹے گول شیشے جڑے تھے۔ اس کے پاؤں میں چھوٹی سی پشاوری چپل تھی اور بال بنا مانگ نکالے سامنے کے رخ ماتھے پر پڑے ہوئے تھے۔ خود صادق خان بھی شلوار قمیض اور کوٹی میں ہی ملبوس تھا، لیکن اس کی واسکٹ بنا کسی ستاروں کے بنی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے دلیر خان کو اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ دلیر خان نے گرنے کے خوف سے دونوں ہاتھوں سے اپنے باپ کے سر کو تھام لیا۔ اس اونچائی پر آ کے وہ باقی سب سے بلند ہو گیا تھا۔ اسے اپنے باپ پر بہت دلار آیا تو اس نے اس کے سر کو اور زیادہ سختی سے جکڑ لیا۔ دونوں باپ بیٹے صادق خان کے رکشے کی سمت چل دیے۔

کراچی جو قیامِ پاکستان کے وقت مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی، ادھر پینسٹھ برسوں میں دو کروڑ نفوس کا ایک عظیم الشان شہر بن چکا تھا۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں آتے، اور پھر اس گرداب سے نکل نہ پاتے۔ اب یہاں ہر علاقے اور ہر فرقے کے لوگ شانہ بہ شانہ زندگی کی الجھنوں کو سلجھاتے نظر آتے۔ اشکوں اور مسکراہٹوں کے نگینے ایک ہی انگوٹھی میں جڑے نظر آتے۔۔۔ بے ہنگم اور بے ترتیب پھیلاؤ شہر کا وسط بدلتا رہا۔ مختلف لسانی اور علاقائی گروہ شہر کے مخصوص علاقوں میں ترجیحی بنیادوں پر رہنے لگے۔ شمالی رخ پر اس شہر کا پھیلاؤ ایک پہاڑی سلسلے نے روک دیا تھا، جو قدرت نے اپنی برتری کے ثبوت کے لیے یہاں رکھ دیا تھا۔ یہ پہاڑی سلسلہ حدِ شہر سے ذرا دور ہے، یہاں تک پکی سڑک آتی ہے نہ پبلک ٹرانسپورٹ۔ شہر کے رخ سے تو پہاڑی کے عقبی موسم کی ادا بھی نہیں دیکھی جا سکتی۔

پہاڑی کے عقبی دامن میں چند کچے پکے مکانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان کی چھتوں پر کھپریل اور سبز بانسوں کا ایسا امتزاج ہے کہ آسمان پر اڑنے والی گاڑیاں بھی ایک سرسری نظر میں انہیں نہ دیکھ سکیں۔ ان میں وسطی عمارت دوسری عمارتوں سے خاصی بڑی ہے۔ اسی عمارت کے دالان میں چارپائیاں بچھی ہیں۔ تین چارپائیوں پر چارخانوں والے کھیس پڑے ہیں، دوادھر بائیں دیوار سے سر ٹیکے کھڑی

ہیں۔ایک نواڑ سے بنی ہوئی اور دوسری میں بان سے ایک نمک پارے کا ڈیزائن بنایا گیا ہے۔کچھ لوگ شلوار قمیض میں ملبوس دیکھے جاسکتے ہیں۔سب نے شلوار قمیض پہن رکھی ہے، کچھ کے سروں پر پگڑی بیٹھی ہے، تقریباً سب ہی چہروں پر داڑھی، مونچھوں کی کھیتی اگی ہے۔تقریباً ہر عمر کے لوگ دیکھے جاسکتے ہیں۔آٹھ برس کی عمر سے ساٹھ برس تک کے کوئی اکیس افراد اس وقت دالان میں موجود ہیں۔جو ذرا عمر رسیدہ ہیں ان کے چہروں پر موسم کی سختی کی کہانیاں جلی حروف میں درج ہیں۔

''روزہ کھلنے میں بس چند ہی منٹ باقی ہیں۔دلیر خان تم سخاوت کو ساتھ لے کر دریاں بچھاؤ، نماز میں دیر نہ ہو۔آج چوہدری شہباز اور جمعہ خان افطار تقسیم کریں گے'' ادھیڑ عمر کا باریش حسام بن طاہر، اس نے ایک عربی جبہ زیب تن کر رکھا تھا، اس کے ہاتھ میں تسبیح کے دانے تیزی سے جگہ بدل رہے تھے۔اس کی آواز اور تحکمانہ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اسے اس گروہ میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔اس کا لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ یہ اس کی مادری زبان نہیں ہے۔دیواروں سے لگے نلکوں سے جو لوگ وضو کر رہے تھے وہ صف بندی کرنے لگے۔قریبی مسجد سے اذان کی آواز ابھری تو سب نے ہاتھ بلند کر دیے ''اللہ اکبر''۔

یہ خوش کن منظر اس وقت کراچی کے ہر گلی کوچے میں دہرایا جا رہا تھا، لیکن ایک استثنا کے ساتھ۔اس عمارت کے سب ہی افراد نماز میں شریک نہیں ہوئے تھے۔عمارت کی چھت اور دروازے پر موجود چند افراد نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ان کے ہاتھوں میں جدید طرز کی بندوقیں تھیں۔دالان میں دیواروں کے ساتھ بھی کلاشنکوف اور اسی نسل کی دوسری بندوقیں سر ٹیکے کھڑی تھیں، ان کے منہ کو انسانی خون لگ چکا تھا۔ان کی خوبی یہی تھی کہ فی منٹ کتنے خدا کے بندوں کو ان کے آخری سفر پہ روانہ کر سکتی ہیں۔انسان اپنے ہم نفسوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں تہہ وتیغ کرنے کے لیے زیادہ قیمت پر بھی یہ ہتھیار خریدنے کو تیار تھا۔یہ غالباً انہی لوگوں کے ہتھیار تھے جو صف بہ صف اس وقت رکوع میں جھکے اپنی مغفرت کے طالب تھے۔یہ تضاد جنگل سے تو آیا نہ ہوگا، کہ جنگل میں صرف پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے شکار کی روایت تھی، یہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کا شاخسانہ تھا کہ اب اگلے ہاتھ ہتھیار برداری کے لیے آزاد تھے۔

افطار سے فارغ ہو کر حسام بن طاہر نے اس گروہ کو ہدایات جاری کیں ''رات تین بجے سحر سے پہلے مشقیں ہوں گی۔کون سی مشق کس عمارت میں ہوگی اس کا پرچہ شہباز نے اندر کمرے میں لگا دیا ہے۔آج برادر تمیری بھی آیا ہوا ہے، لہذا جن لوگوں کو بم بنانے کی مشق کرنی ہے وہ ان کی عمارت میں جائیں گے۔عمومی جسمانی ورزش معمول کے مطابق باہر کھلے میدان میں ہوگی۔نقشہ پڑھنے کی آج کلاس نہ ہو سکے گی۔فی الحال آپ اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔جو یہیں رہتے ہیں وہ بھی چارپائیاں ڈال لیں۔بس دلیر خان اور چوہدری شہباز یہاں میرے پاس ٹھہر جائیں باقی سب جا سکتے ہیں۔آپ سب کو بہت مبارک ہو۔رمضان کریم میں بس دو روزے باقی ہیں۔پھر انشاء اللہ جمعرات کے روز یہیں صبح سات بجے نمازِ عید ادا کریں گے۔اگر چاند نہ نظر آیا تو عید جمعہ کو ہوگی۔جمعہ کو ہونا تو خوش خبری ہوگی کہ یہ سامراج کی آلہ کار حکومت جلد فارغ ہوگی۔خدا آپ کی نیکیوں کو قبول کرے، فی امان اللہ۔''

قاتلوں، راہزنوں اور دہشت گروں کے اس گروہ کو اللہ کی امان میں دے کر حسام دلیر کی جانب مڑا۔''دلیر بیٹا تم ادھر نزدیک آجاؤ میرے پاس۔میں نہیں چاہتا کہ میری بات زیادہ کانوں تک پہنچے۔کم از کم ابھی دو روز اور نہیں۔شہباز تو ادھر میرے دائیں ہاتھ پر آجا'' حسام بولا۔

''دلیر خان تُو کتنے دن سے بے چین تھا، یا محمد اب وقت آ گیا ہے۔عید کے روز تُو شہادت کے مرتبے پر فائز ہوگا۔عیدگاہ منافقین سے بھری ہوگی۔یہ تو غیر مسلموں سے زیادہ خطرناک لوگ ہیں۔اس روز تیری بارودی جیکٹ اس زمین کو بہت سے منافقین سے پاک کرے گی۔'' حسام، دلیر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔اس نے اپنا بایاں ہاتھ دلیر خان کے شانے پر پھیلا دیا تھا۔اب دالان میں ان تینوں کے سوا کوئی باقی نہیں تھا۔جو پیچھے رہ گئے تھے وہ بھی شہباز کی آنکھ کا اشارہ دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔

''اللہ تعالیٰ تیری قربانی سے بہت خوش ہوگا میرے رفیق۔اس پاک پروردگار نے اپنے شہیدوں کے لیے جنت میں ہمیشہ کی زندگی کا وعدہ کیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے برادر حسام'' دلیر خان ذرا جوش سے بولا۔''میں تو کب سے اس جہاد میں عملاً شریک ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔میری جان جانے سے اگر خدا کے دین کو فائدہ ہوتا ہے، تو میری خون کا ہر قطرہ لے لو۔''

''تجھے عیدگاہ میں بم جیکٹ چلانے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟ حسام کا غیر ملکی لہجہ اتنے برسوں اس علاقے میں رہنے کے بعد مقامی تلفظ اور لہجے میں رنگ گیا تھا۔''ابھی مشقیں شروع ہوں گی، لیکن دلیر خان تم اپنا منہ بند رکھنا۔اور تم بھی چوہدری شہباز۔کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔کل شام افطار کے بعد دلیر خان کا وڈیو بناؤ۔نئے لڑکوں کی تربیت اور رہ نمائی میں کام آتا ہے۔شاباش دلیر، کاش تیری جگہ میں ہو سکتا۔مگر یہ سعادت تو اللہ کی طرف سے آتی ہے، وہ جس کو چن لے۔لیکن ہم بھی تیرے فوراً بعد تجھے جنت میں دوبارہ ملیں گے۔میں اور شہباز تیرے ساتھ جائیں گے عیدگاہ۔ہم باہر ٹھہریں گے اور تیری جیکٹ پھٹنے کے دس منٹ بعد ہم دوسرا بم پھاڑیں گے۔اس سے جو لوگ ان منافقین کی مدد کو جمع ہوں گے، ان سے بھی نجات ملے گی۔بس عید کے روز صبح چھ بجے نکل جائیں گے۔مرکزی عیدگاہ میں نماز سات بجے شروع ہوگی۔اسی میں منافقین کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔تو بم جیکٹ پہن کر اندر جائے گا۔میں اور شہباز پجیرو میں باہر انتظار کریں گے۔اب تم کسی سے فون پر بھی رابطہ نہیں کرنا۔صدیق خان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔اور تمھاری ماں بھی پچھلے برس زلزلے میں مر گئی تھی۔اور کوئی رشتہ دار ہے جسے خدا حافظ کہنا ہے؟ نہیں تو اب جاؤ تھوڑی دیر سو کر رات تین بجے مشقوں کے لیے باہر آجاؤ'' حسام نے شہباز کو رکنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں حسام مجھے کس کو فون کرنا ہے، میں سب کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اگر تمھیں فون کی ضرورت نہیں ہے، تو لاؤ مجھے دے دو۔ وہ جو کل نیا نوجوان آیا ہے اس کے پاس فون نہیں ہے'' حسام نے شانے سے ہاتھ ہٹا کر اسے دلیر خان کے سامنے پھیلا دیا۔ دلیر خان نے کرتے کی جیب سے سیل فون نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھا اور اٹھ کر اندر ایک حجرے کی جانب چل دیا۔

''شہباز اب سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا، مگر اسے احساس نہ ہو۔ بس آج اس کی آخری ورزش ہے۔ کل اور پرسوں اسے ضرور معجون ملتی رہے۔ چاند رات کو معجون میں اضافہ کر دینا۔ بہت آزمودہ نسخہ ہے۔ اس سے آدمی کی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو جاتی ہے۔ خودکش بمبار کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ اور ہاں خیال رہے اب اس کا کسی سے رابطہ نہ ہو!''

''فکر نہ کرو حسام، ایسا ہی ہوگا'' شہباز نے اسے یقین دلایا ''حسام کیا میں فون کر کے اپنی ماں کو خدا حافظ کہہ سکتا ہوں؟''

''تم کیوں خدا حافظ کہو گے؟'' حسام حیران رہ گیا۔

''ہم دس منٹ بعد دوسرا بم چلائیں گے۔ میں بس اپنی ماں کو آخری روز فون کرنا چاہتا ہوں''

''اتنے عرصے میں کیا سیکھا ہے تُو نے شہباز۔ میرا ابھی مرنے کا کوئی ارادہ نہیں، جاؤ اب یہاں سے'' حسام نے مسکرا کے کہا تو شہباز ہنستا ہوا اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

شہر کے حاشیوں میں بسی ان چہار دیواریوں میں شدت پسندی منطق پر غالب آ گئی تھی۔ اور اب اس شدت پسندی کی تاریکی کے سائے بڑھ کر وسطِ شہر کی سپیدی کو چاٹ رہے تھے۔ اب اس شہر میں ہی کیا پورے ملک میں انتہا پسندی کا سورج سوا نیزے پر کھڑا تھا، جس کی شدت سے شہری جھلس رہے تھے، مر رہے تھے۔ دور تک کوئی مساوات یا برداشت کا درخت نہیں تھا کہ چھاؤں فراہم کر سکے، نہ کوئی ایسا نیزہ کہ اس سورج کو دھکہ دے کر واپس اس کی جگہ پر پہنچا دے۔

کتنی ہی دہائیاں گزر گئی تھیں لیکن عید کی ہما ہمی میں فرق نہیں تھا۔ گرچہ دلوں میں خوف کے سائے جاگزیں ہو گئے تھے، مگر عید تو سب مسلمانوں کی خوشی و مسرت کی میراث تھی۔ روایت یہی تھی کہ عید بقرعید پر خلوص و محبت کی برسات سے خون کے پرانے دھبے بھی دھل جاتے ہیں۔ آج پھر عید کا دن ہے۔ چاند رات کا سفر عید کی صبح کے سورج نے آ کر تمام کیا۔ ستارے جو تمام رات خموش مسکرا مسکرا کے تھک گئے تھے سو گئے، شوال کا باریک خمدار چاند بھی محض اپنی موجودگی سے نویدِ مسرت دے کر کسی جگنو کی مانند سورج کی آمد پر شرما کے چھپ گیا۔ عیدگاہ میں تو شبِ معراج سے ہی چراغاں شروع ہو گیا تھا۔ رنگ برنگے قمقمے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے تھے۔ تکونے رنگین کاغذ، تتلی سے لٹکے رنگوں کی بہار میں اضافہ کر رہے تھے۔ یہ شہر کی مرکزی عیدگاہ تھی۔ اس میں ہزاروں شہری ایک ساتھ نماز ادا کر سکتے تھے۔ مسجد کے صحن میں دریاں ایک دوسرے سے سر جوڑے بچھی ہوئی تھیں۔ وضو کی سہولت کے لیے اضافی ٹنکیاں لگائی گئی تھیں۔ عید گاہ کے باہر کچی زمین پر گزشتہ دو دنوں سے مسلسل پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔

عیدگاہ کی طرف آنے کے صرف تین راستے مختص کیے گئے تھے، باقی راستے حفاظتی تدبیر کے طور پر بند کر دیے گئے تھے۔ ان تینوں راستوں پر پولیس کی نفری ہر آنے والے پر نظر رکھ رہی تھی۔ کسی کے پاس کوئی تھیلا ہوتا تو اسے کھول کر اطمینان کیا جاتا، پھر اسے جانے دیا جاتا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مذہب سے لگاؤ خوف کے جن پر غالب آ گیا تھا۔

عیدگاہ کے اطراف خوانچہ فروشوں کے ساتھ بچوں کے لیے تفریحی امکانات مہیا تھے۔ انہیں جانچ پڑتال کے بعد دو روز پہلے ہی شناختی کاغذ جاری کیے گئے تھے، یوں حکومت نے کوشش کی تھی کہ عید کی خوشیوں کو معمول کے مطابق منایا جا سکے۔ حسبِ معمول جہاں پان سگریٹ کے خوانچے لگے تھے، وہیں ایک ریڑھی پر بھنے ہوئے چھولے، کہیں گنڈیریاں تو کہیں قلفی سب ہی کچھ مہیا تھا۔ ان کی عید دو وقت کی روٹی سے وابستہ تھی۔ تو جہاں دوسرے تعطیل منا رہے تھے، یہ اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر اتنا فروخت کر دینا چاہتے تھے کہ آئندہ چند ہفتوں کی کسر نکل سکے۔ ویسے بھی رمضان کے مہینے میں ان خوانچہ فروشوں کی بکری نہ ہونے کے برابر تھی۔ عیدگاہ کے برابر بڑے میدان میں گاڑیوں کی پارکنگ کا انتظام تھا۔ ایک حصے میں کوئی سرکس والا بچوں کے لیے جھولے بھی لے آیا تھا۔ دائرے کی شکل میں گھومتے جھولے۔ جس میں مرکزی مستول سے لکڑی کے بانس یوں نکلے تھے جیسے سائیکل کے پہیے میں تیلیاں۔ ہر بانس کے سرے پر لکڑی کا گھوڑا تھا کہیں چھوٹی سی نشست، تو کہیں ہاتھی۔ یہ اوپر نیچے ہوتے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کے تعاقب میں گول گھومتے تو ان پر بیٹھے بچے خوشی سے کلکاریاں مارتے۔

جوق در جوق لوگ اب عیدگاہ کی طرف آ رہے تھے۔ کچھ اپنی کاروں میں تو کوئی رکشے اور تانگے میں۔ نزدیکی لوگوں کے لیے پیدل آنا ہی بہتر ہے کہ پارکنگ کی زحمت سے بچیں گے۔ سب نے شفاف کپڑے پہن رہے تھے، جو نیا خرید سکا اس نے نیا لباس زیبِ تن کر لیا تھا۔ لیکن سب ہی کے چہروں پر خوشی نمایاں ہے، روزہ دار بھی اور روزہ خوار بھی، عید کی خوشیاں منانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے رہے تھے۔ بہت سے لوگ جازم ساتھ لائے تھے۔ خوش رنگ دھاگے یا ریشم سے بنے ڈیزائن کے جازم ایک دوسرے کے ساتھ بچھے فرشِ نماز پر عجب بہار دکھا رہے تھے۔ ابھی نماز شروع ہونے میں ذرا وقت باقی تھا۔

شمالی پہاڑی کی سمت سے ایک جیپ تیزی سے عیدگاہ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ سامنے کی سیٹ پر شہباز اور دلیر خان بیٹھے ہیں، خود حسام پچھلی نشست پر بیٹھا ہے۔ حسام نے بھی بوجوہ اپنا عربی چوغہ اتار کے شلوار قمیض پہنی ہوئی ہے۔ وہ بھی مقامی رنگ میں ایسا رنگ گیا ہے کہ اگر وہ بات نہ کرے تو کسی کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہ مقامی نہیں ہے۔ حسام نے اپنا ہاتھ دلیر خان کے کندھے پر رکھا ہوا ہے، جیسے اسے اندیشہ ہو کہ دلیر خان ابھی کود کے کہیں بھاگ جائے گا۔ دلیر خان غیر معمولی

طور پر خاموش ہے۔ صبح اٹھ کر وہ فجر کی نماز پڑھ کے فارغ ہوا تو حسام نے شہباز کی مدد سے اس کے جسم پر بارود سے بھری جیکٹ باندھی۔ اس کے اوپر بنیان، کرتا اور واسکٹ پہن کر وہ بھی بالکل ان ہی جیسا لگ رہا تھا۔ دور سے دیکھنے میں تو شک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کرتے کے نیچے موت باندھ رکھی ہے۔ دلیر خان بہت پر سکون تھا۔ نہ جانے یہ اس معجون کا اثر تھا جو حسام کی ہدایت پر شہباز اسے روز رات میں دے رہا تھا یا اسے اس امر پہ پختہ یقین تھا کہ وہ جو کرنے جا رہا ہے اسی میں نوعِ انساں کی بھلائی ہے۔ گزشتہ تین سال سے اسے مدرسے میں اسی لمحے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ صدیق خان کی زندگی میں دلیر خان ایک عام سا لڑکا تھا۔ پھر صدیق خان رکشے کے حادثے میں مارا گیا۔ اس کے دو سال بعد ہی اس کی ماں بھی زلزلے کا شکار ہوگئی۔ چودہ برس کا یہ نوجوان اس جذباتی کش مکش اور تنہائی کے زمانے میں اس جماعت کی نظر میں آ گیا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اس جماعت کا حصہ بن گیا۔ ایمان وایقاں، موت وحیات کے اب اس کے اپنے فلسفے تھے۔ کتابِ ہدایت سے اس نے اپنی مرضی کے معنی مستعار لیے تھے، اور یہ سب مدرسے والوں کی رہنمائی سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں ایک اہم سبق یہ بھی تھا کہ اس زمین پر زندہ رہنے کا حق صرف ہماری سوچ، فکر اور عقیدے کے لوگوں کے لیے ہے۔

''دلیر خان، تم اپنے نام کی طرح دلیر ہو۔ گھبرانا نہیں۔ خدا تمھاری مدد کرے گا۔ جنت میں حوریں تمھاری منتظر ہیں۔ خبردار! چہرے سے گھبراہٹ نہ ظاہر ہو۔ زیادہ تیز نہ چلنا۔ بس نظر سیدھی رہے، دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کوشش کرنا کہ عیدگاہ میں جتنا اندر جا سکو چلے جاؤ۔ پھر نماز شروع ہونے کے بعد جب سب کی توجہ نماز پر ہو اس وقت تمھاری شلوار کی جیب میں جو ٹائمر رکھا ہے اس کا بٹن دبا دینا۔ کل رات تم نے جو وڈیو بنایا ہے، آج رات وہ ساری دنیا دیکھے گی، تمھارے ساتھی تمھاری بہادری کے چرچے کریں گے۔'' حسام اسے اکسا رہا تھا، اسے ارتکاز کا سبق دے رہا تھا۔ دلیر خان کے لیے یہ پہلا موقع تھا، مگر حسام کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔

جیپ پارکنگ لاٹ میں آ کر رک گئی۔ دلیر خان نے شہباز اور حسام سے گلے لگ کے اپنی منزل کی جانب قدم بڑھایا۔ جانے سے پہلے حسام نے پھر وہی سبق دہرایا جو وہ گزشتہ چند دنوں میں درجنوں بار دے چکا تھا، دائیں بائیں نہ دیکھنا، ارتکازِ فکر لازم ہے، گھبراہٹ چہرے پہ نظر نہ آئے۔ دلیر خان چھوٹے قدم اٹھاتا عیدگاہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کی سانس معمول سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ اس نے شلوار کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹائمر کی موجودگی کا پھر اطمینان کیا۔ ابھی صبح کا سات ہی بجا تھا۔ ہوا کے نرم جھونکے سورج کی تمازت کا مقابلہ کر رہے تھے، مگر اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں تھیں۔ اس نے دیکھا کہ صدر دروازے کے پاس پولیس والے ہر شخص کے کپڑوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے رخ بدل کر عیدگاہ کی دائیں جانب چل پڑا۔ اسے حسام اور شہباز کی نظریں اپنی پیٹھ پر محسوس ہو رہی تھیں۔ انہوں نے چند دنوں میں کئی بار عیدگاہ کے اطراف چکر کاٹا تھا، اور پارکنگ کی برابر والی گلی سے ایک داخلہ بھی دیکھ لیا تھا، جو غالباً اس گلی کے مکینوں نے اپنی سہولت کے لیے بنایا ہوگا، اور باہر سے آنے والوں کی نظر سے پوشیدہ تھا۔ اس کے لیے اسی پارکنگ کے اس چھوٹے حصے سے گزر کے جانا تھا جہاں خوانچہ فروش اور دوسرے ہاکر کھڑے تھے۔ اس کی نظریں بالکل سیدھ میں گڑی تھیں۔ جیسے کوئی گھوڑا اپنی منزل کی جانب سرپٹ دوڑ رہا ہو، اور اس کے چہرے کے گرد پردے اسے دائیں بائیں دیکھنے سے معذور کر رہے ہوں۔

''ابو، ابو بس ایک بار اور، بس ایک بار اور'' اس بچے کے لہجے میں کوئی ایسے بات تھی کہ دلیر خان ان کی طرف دیکھنے پر مجبور سا ہوگیا۔

کوئی سات آٹھ سال کا بچہ، گول جھولے پر بیٹھا باپ کی منت کر رہا تھا کہ اسے ایک بار اور جھولنے دیا جائے۔

''نہیں بیٹا، تم چار بار بیٹھ چکے ہو، نماز نکل جائے گی۔ ہمیں اب بھی شاید باہر ہی جگہ ملے'' اس بچے کے باپ نے اسے زبردستی جھولے سے نکالا اور اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ اس سے بچے کی ناراضگی کسی قدر کم ہوگئی اور اس نے اپنے ہاتھ سختی سے باپ کے سر کے گرد حائل کر دیے۔ دلیر خان کی یادوں کے جھروکے سے کسی گم گشتہ یاد نے سر نکالا۔ وہ باپ اپنے بیٹے کو سر پر بٹھائے اب تیز قدموں سے عیدگاہ کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس کے اور دلیر خان کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔ دونوں باپ بیٹوں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ بیٹا باپ کے شانوں پر دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اور مڑ مڑ کے جھولے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ یک بہ یک اس کی نظر دلیر خان پر پڑی تو بچہ مسکرا دیا۔ اس نے باپ کے کانوں میں کچھ کہا، باپ کے قدم سست ہوگئے، اس نے مڑ کے دلیر خان کی طرف دیکھا۔ دلیر خان کے سامنے صدیق خان کھڑا تھا۔ صدیق خان نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا لیکن اس کے الفاظ دلیر خان تک پہنچنے سے پہلے ہی فضا میں دم توڑ گئے۔ دلیر خان کو لگا جیسے صدیق خان نے شہادت کی انگلی سے اسے منع کیا ہو، جیسے وہ ہمیشہ دلیر خان کو کوئی غلط کام کرنے پر ٹوکتا تھا۔ صدیق خان پھر واپس مڑا اور دلیر خان کو کندھے پر بٹھائے تیزی سے عیدگاہ کی جانب چل دیا۔

دلیر خان کے اعصاب میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اس کے جسم سے کسلمندی اور سکون رخصت ہوگئے۔ اسے اپنے جسم میں ایک نئی روشنی ایک نئی آگہی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے واپس مڑا اور یکلخت جیپ کی جانب واپس دوڑنے لگا۔ اسے واپس آتا دیکھ کر حسام جیپ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے شہباز کو جیپ اسٹارٹ رکھنے کی ہدایت کی۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے دلیر خان کو عیدگاہ کی جانب جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ دلیر خان کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی پھولی سانسوں میں بات صاف سمجھ نہیں آ رہی تھی، لیکن حسام کو لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو: وہ بابا، وہ بابا۔۔۔

دلیر خان قریب آیا تو حسام نے اس کے شانوں کو گرفت میں لے کر چاہا کہ درشتگی سے کچھ کہے، لیکن اس سے پہلے ہی دلیر خان نے کہا کہ کراچی والوں کے لیے یہ میری عیدی ہے، اور شلوار کی جیب میں رکھا ٹائمر کا بٹن دبا دیا۔

''عظمت کی اذاں''

حمدِ ربِ تعالیٰ

مُمکن ہی نہیں حمد و ثنا اَور کسی کی
اللہ تعالیٰ کے سِوا اَور کسی کی
توصیف کے قابل تو' ہواللہ احدٌ ہے
ہوسکتی ہے توصیف بھلا اَور کسی کی؟
حقدار ہے اللہ کی وحدانیت اِس کی
ہر گز نہیں تحمید رَوا اَور کسی کی
معمور ہے یوں ذکرِ الٰہی سے مِرا دِل
اب دل میں نہیں کوئی جگہ اَور کسی کی
ہونے نہیں دیتا مِرے دامن کو وُہ خالی
درکار نہیں جود و سخا اَور کسی کی
وُہ جو ہے مِرے عیب سبھی ڈھانپنے والا!
کیوں ہو مِرے شانوں پہ رِدا اَور کسی کی
مطلوب مجھے ہے تو فقط اُس کی رضا ہے
ہر گز نہیں مطلوب رضا اور کسی کی
موجود وہی ایک ازل سے ہے ابد تک
اب بات کرے کوئی بھی کیا اور کسی کی
اللہ کے منکر کو یہ چیلنج ہے میرا
لاؤ تو یہاں آب و ہَوا اَور کسی کی !
اللہ کی عظمت کی اذاں دل میں جو گونجے
گونجے یہاں پھر کیسے صدا اور کسی کی
تحمید نسیم اَور کسی کی بھی کروں مَیں؟
ممکن ہی نہیں ہے بخدا اَور کسی کی

نسیم سحر
(راولپنڈی)

نعتِ رسول ﷺ

اُس کا بیان کیسے ہو اور کس زبان سے
ہستی جو ماورا ہے زمان و مکان سے

اک ذاتؐ جو سنوار گئی خاک کا نصیب
اک نور جو برستا رہا آسمان سے

کانوں میں آ رہی ہے ابھی تک وہی صدا
گونجی کبھی جو کوہِ صفا کی چٹان سے

اللہ کے حبیبؐ تھے لیکن زمین پر
گزرے بشر کے روپ میں ہر امتحان سے

تاریخ کو وہ راہ دکھائی کہ حشر تک
تہذیب کرتی جائے سفر آن بان سے

کامل یقیں کے ساتھ بچایا ہے آپؐ نے
انسان کی حیات کو ہر اِک گمان سے

قول و عمل میں اُنؐ کے نہیں تھا کوئی تضاد
وہ سب کیا جو کہتے رہے تھے زبان سے

عرفانؔ زندگی کے تقاضوں میں آپؐ کا
پیہم سلوک و ربط رہا لا مکان سے

غالب عرفان
(کراچی)

ناشکرے

حسن منظر
(کراچی)

میں نے بائیس سال کے عمر میں دنیا کے اُن علاقوں کی سیاحت اختیار کی تھی جن کے بارے میں پڑھتا، بلکہ تھوڑا بہت لڑکپن سے سنتا آیا تھا کہ کہاں کہاں کے رہنے والوں کا زندگی گزارنے کا ڈھب کیسا حیران کن ہے اور ہر ایک کا انوکھا۔

ان میں بحرالکاہل کے جزیروں کے لوگ بھی تھے۔ ہندوستان کے انتہائی شمال اور انتہائی جنوب کے بسنے والے، افریقہ کے گھنے جنگلوں کے باسی اور الاسکا سے سائبیریا تک کے خانہ بدوش۔

پڑھتا آیا تھا کہیں جنگیں لڑنے کا کام عورتیں کرتی ہیں۔۔۔ منہ سے نہیں، ہاتھوں پیروں اور ہتھیاروں سے اور خیالی گھوڑے دوڑاتا تھا کہ مرد گھر میں بیٹھے شام کو ان کے لوٹنے کا انتظار کرتے ہوں گے۔

کہیں مارگریٹ میڈ Margaret Mead اور اس کی ٹیم کو اُن جزیروں میں ایک عمر کھپانے کے بعد پتہ چلا کہ جہاں عورتیں جنگجو ہیں، ہر وقت کمر بستہ، وہاں مرد بچوں کو پالنے کا کام کرتے ہیں۔ کس حد تک یہ معلوم نہیں ہوسکا۔

کہیں مرنے والے کے جسم کو گھر والے سوراخ کرتے ہیں، کہیں گِدھ اور سیار۔ ایکیموز میں قریب المرگ ہستی کے لیے وہ جو بھی ہو کتنا ہی قریبی رشتے دار، گھرانے کا بڑا اپنے ٹھکانے سے دور برف کے چوکور بڑے بڑے ٹکڑوں Blocks کا اِگلو بناتا ہے اور وہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا مرحوم یا مرحومہ کا جیتی سانس لیتی دنیا میں تھا۔ اس میں اسے بالوں والی کسی بھی جانور کی کھال پر لٹا کر، گھُسنے کے راستے کو برف کے رڑوں سے پاٹ کر خود اپنے اگلوز کے ٹھاؤں کو لوٹ جاتا ہے۔ پھر ایک مقررہ دن جب کامل یقین ہو جاتا ہے چل بسنے والے کی جان اس کے جسم کو چھوڑ گئی ہوگی تو خبر لینے کو لوٹتا ہے۔ سیاحت کے مستقل ایڑ لگائے رہنے والے میرے تجسّس کے پیچھے ایسی چھوٹی تفصیلیں بھی تھیں جنہیں سیاح اور بشریات کے ماہر anthropologists نوٹ کرنا بھول گئے تھے۔ مثلاً یہی ایک کہ چاروں طرف سے بند برف کے گنبد میں، تنہائی میں آخری سانسوں کے بعد اس مرنے والی/ والے کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ لاش خود کھانے کھلانے کے کام آتی ہے یا رسومات کے بعد اس کا کچھ ہمارے یہاں کی طرح کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ ریچھ بھیڑیوں کی غذا بنتا ہے یا جہاں برف کی کئی فٹ موٹی تہہ کے نیچے سمندر ہو چھید کر کے اس میں سے مرحوم یا مرحومہ کو سیل Seals وغیرہ کے لیے پانی میں اتار دیا جاتا ہے کہ کھائیں اور روح سمیت کھائیں تاکہ وہ بھٹکتی نہ پھرے۔

کہیں کسی قسم کے گوشت کو، چاہے وہ ٹڈی ہی کا ہو ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا ہے اور دنیا میں وہ جگہیں بھی ہیں جہاں میں نے ہر گوشت کو بڑے چاؤ سے کھائے جاتے دیکھا اور ہر قسم کے بندر کو بڑے اہتمام سے۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب میں خود سیاح بن چکا تھا۔ خیر جب یہ ذکر آ ہی گیا تو اسے پورا کرتا چلوں۔ پہلے ایک لوہے کے ڈرم میں جس میں کھولتا ہوا پانی ہوتا ہے۔ بندر کو ڈبکیاں دے دے کر بغدے جیسے چھرے کی کُند طرف سے اس کا شیو کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اُسے سرخ مرچ اور افریقی مصالحوں کے ساتھ پکنا نصیب ہوتا ہے۔ اگلی منزل اس کے کھانے والوں کے بیچ میں اُسے جانے کی ہے۔ مردہ جسم سے بھاپ اُٹھ رہی ہوتی ہے اور ہر نظر اس نعمت پر ہوتی ہے لیکن اس کی طرف ہاتھ کوئی نہیں بڑھاتا ہے۔ کب تک؟ جب تک کہ کنبے کا بڑا اس کے کپال کو پھوڑ کر جتنا جی چاہے اس کا مغز کھالے۔ اس پر صرف اس کا حق ہوتا ہے۔ یعنی وہاں کی تہذیب میں بھی دماغ کا وہی مرتبہ ہے جو ان ملکوں میں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسکن ہیں۔

اس کے بعد اُبلے ہوئے چاول یا یام کی گاڑی (بُھرتا) اور بندر کے گوشت پر سب پل پڑتے ہیں یہاں تک کہ جب یہ ضیافت ختم ہوتی ہے اور بڑے اور چھوٹے، مرد اور عورتیں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہاں گوشت تو گوشت کھال کا ٹکڑا بھی دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔

ہمارے یہاں کی طرح وہاں رزق کی ریدا بیدی نہیں ہے۔

جنگلی چوہے سادگی اور قناعت سے کھائے جاتے ہیں، اژدھا (پائی تھن) یا کوئی بھی تندرست سانپ زیادہ چاؤ سے۔ ایک جنگلی چوہا چاول یا کساوا کی گاڑی کے ساتھ دو یا تین کو کافی ہوتا ہے اور اکثر سلگتی آگ پر بھونے جاتے جاتے اس کی دم غائب ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں۔

دنیا کی یہ بوقلمونیت تھی جو مجھے دنیا دیکھنے پر اُکسا رہی تھی۔ گو اُس دور میں اپنے اس میلان کے لیے یہ الفاظ ذہن میں نہ آتے۔ آگے چل کر قلعے، محل، گرجا گھر، مندر، پگوڈے، مقبرے اور آسمان کو چھو لینے والی عمارتوں کی دنیا نہیں، نہ تھیٹر نہ قیمتی سامان سے پٹی ہوئی، بجلی کی روشنی میں نہائی حیران کرنے والی دکانیں مجھے لبھاتی تھیں۔ اور وہ تنگ سڑکوں والے بازار تو بالکل بھی نہیں جن میں اوپر کی منزل کی بالکنی میں سرِشام لپی پتی عورتیں آ بیٹھتی ہیں۔ ان سب میں مجھے کبھی دلچسپی تھی نہ ہے۔ میرے لیے آج بھی گاؤں گرام والی میت یا مسجد۔۔۔ اُسے جو بھی کہیں بادشاہوں کی بنوائی ہوئی مَرمَر اور سرخ پتھر کی عبادت گاہوں سے زیادہ کشش رکھتی ہے۔

بہت پہلے میں جن دنوں اپنی پسند کی کتابوں میں ڈوبا رہتا تھا اور انسانی زندگی ہو کہ کہاں کیسی ہے حیران ہوتا تھا ساتھ ساتھ کوئی اور بے چینی مجھے ایڑ

لگاتی رہتی تھی۔اُسے میں تب صحیح طرح نہیں پہنچاتا تھا۔

تبت میں برہم پتر ہمالیہ کی شاید ہزار، دو ہزار فٹ گہری کھائی میں بہتا ہے۔اس وادی کی دونوں طرف کی چڑھانوں پر لوگوں نے چٹانوں میں گھر بنا رکھے ہیں۔ گپھاؤں میں اور ان سے باہر بھی ایک چٹان سے لگے جیسے ہوا میں معلق ہوں۔ان میں وہ کیسے گزر بسر کرتے ہیں؟ وہاں شادی بیاہ، مرنا جینا سب کچھ ہوتا ہوگا۔میرا دماغ کہتا یہ کیسے ممکن ہے!اس سب کو میں خود جا کر دیکھنا چاہتا تھا۔لفظ سیاحت سے واقف نہ تھا۔

تھوڑا بڑا ہوا تو دماغ تنبیہہ کرنے لگا: اس پھیر میں پڑ گئے تو زندگی گنواؤ گے۔شادی کرو اور گھر والے بن جاؤ۔۔۔باعزت زندگی۔ہوسکتا ہے ایک دن سیاست میں پہنچ جاؤ۔آخیر کو ایک اچھے بڑے زمیندار گھرانے کا ابھرتا ہوا سورج تھا!

مگر جس سے محبت تھی اور جس نے مجھے کریدنے میں پہل کی، پھر خود اپنی محبت کا اقرار کیا تھا یہ نہیں کہوں گا اس نے مجھے دھوکا دیا۔دونوں تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ہوا یہ کہ وہ مجھ سے پہلے بڑی ہوگئی اور سسرال سدھاری، کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے۔روتی دھوتی؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔میں نے اُن چند دنوں کے لیے خود کو وہاں سے غائب کر دیا تھا۔نہ اس نے کبھی پلٹ کر پوچھا کیسے ہو؟ کبھی مجھے یاد کرتے ہو؟

اس کے بعد زندگی کسی اور کے ساتھ گزارنے کو دل تیار نہیں ہوا۔

ہاں حُسن کا ایک نیا بازار میرے سامنے کھُل گیا اور کھلتا چلا گیا۔لوگوں کی عقیدت کے ہزار رنگوں کا واہموں خوف اور نڈری کا، رسومات کا جو قدرت کا پر چانے کرنے کے لیے تھیں اور کبھی کبھی بدفعلی کر گزرنے پر گاؤں کے پیچوں بیچ بنائے ہوئے جُوJu Ju پر جا کر بکی چڑھانے کا۔۔۔بدفعلی دن دہاڑے کی ہو تو مینڈھا ،رات کو ہوئی ہو تو مرغا۔بہت سے کام ہیں جو رات میں اتنے بُرے نہیں ہیں جتنے دن میں۔یہ قدرت کا انسان کو کنسیشن ہے۔۔۔رعائیت۔

ایک واقعہ مجھے بہت پہلے بیان کر دینا چاہیے تھا۔مگر بھول گیا۔تھا تو جب بہت چھوٹا، اتنا کہ ماں کے ساتھ سوتا تھا، لیکن عورتوں میں جو باتیں ہوتی تھیں انہیں بڑی دلچسپی سے سنتا تھا۔

ایک رات جب اماں ابا میں نارمل آواز میں گفتگو ہو رہی تھی میں نے ایک عورت کے بارے میں عجیب کہانی سُنی۔اُسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، نہ اُن دونوں نے دیکھا ہوگا کیوں کہ اس میں ''فلاں کی ماں'' کہہ کر اس کا ذکر آ رہا تھا، نہ ''فلاں کی بہو''۔ہمارے یہاں کی نہیں کہیں اور کی ہوگی۔مگر جو اس نے کیا تھا اس کا سب جگہ ڈنکا پٹ رہا تھا۔اس کے بچہ نہیں ہوا تھا جو میرے لیے تعجب کی بات نہیں تھی۔بہت سیوں کے تھا، بہت سیوں کے نہیں۔لیکن تجسّس سے جب بھی میرا دماغ پٹا ہوا تھا۔ایک دن اماں سے کئی عورتوں کی موجودگی میں پوچھ چکا تھا یہ کیسی بات ہے جن کے میاں ہیں ان کے بچہ ہے، جن کے نہیں ہیں ان کے نہیں۔منگنی، مایوں، مانجھا، شادی اس کے بعد بچہ ہونا۔آئے دن میاں بیوی میں لڑائی، ہر وقت کی تھیم تھی جسے انگریزی میں کہیں گے کہ ''ہوا میں تھی''۔

اماں بتا رہی تھیں اُس عورت نے بچے کے لیے کوئی جتن نہیں چھوڑا۔۔۔ڈاکٹر، مزار، تعویز اور قرآن کی پڑھوائی۔ان کم عمر عورتوں سے جن کی شادی کو سال پورا نہیں ہوا تھا کہ بچہ ہوگیا۔اور سب سے بڑھ کر مکے کی مسجد سے صحن کا وہ دانا منگایا جو دن بھر لوگ کبوتروں کو ڈالتے ہیں اور وہ صبح شام دھول مٹی کی طرح جھاڑو میں آ جاتا ہے۔

ابّا بتا رہے تھے جب وہ دانا آ گیا تو اُسے پیس کر اس کے آٹے کی روٹی اس نے دس دن کھائی۔اُس کا میاں اُسے پیٹتا بہت تھا اور کبھی کبھی رات کو گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر لیتا تھا۔

میں یہ بات سن کر رو پڑا اور خوف زدہ بھی ہوا۔بے چاری رات میں سڑک پر اکیلی کھڑی کتنا ڈر رہی ہوگی۔کتے اُسے گھیرے بھونک رہے ہوں گے جیسا کہ ایک دفعہ میرے ساتھ ہو چکا تھا اور دو، تین راہ چلتوں نے رک کر مجھے چھڑایا تھا۔

''ایک دن جب میاں گھر پر نہیں تھا وہ بالٹیوں پانی سے نہائی اور بغیر جسم پونچھے، ننگ دھڑنگ جا کر تو بہ تو بہ اس پر بیٹھ گئی۔یعنی اس نے وہ کیا جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ابّا کی بات کے ساتھ امّاں کہہ رہی تھیں استغفار، استغفر اللہ، استغفر اللہ۔جسے سن کر مجھے اور بھی ڈر لگ رہا تھا۔''

''بے چاری کو یہ شیطانی عمل کسی نے بتایا ہوگا۔''

شام کو جب اس کا میاں گھر آیا تو اُسے دیر تک دروازہ پیٹنا پڑا۔ دروازہ توڑ کر اندر گیا کیوں کہ وہ دروازہ کھول ہی نہیں رہی تھی۔اندر کوئی نہیں تھا۔ لیکن جب وہ کمرے میں پہنچا تو ایک طرف ایک ڈری ہوئی سُوریا کھڑی اسے دیکھ رہی تھی جسے اس نے شُو شُو کر کے ڈرایا اور وہ اس کے دروازے سے ہٹتے ہی باہر بھاگ گئی۔کسی کے ہاتھ نہیں آئی۔امّاں روتی جا رہی تھیں اور کہے جا رہی تھیں ''اللہ معاف کرنے والا ہے۔وہ بے گناہ تھی، کمرے میں بس بھیگا ہوا۔۔۔چوکی پر رکھا تھا۔''

امّاں کہہ رہی تھیں ''بس آگے مت بتایئے خدا کے لیے'' میرا خیال ہے اس رات میں امّاں سے کچھ زیادہ ہی چمٹ کر سویا ہوں گا اور اپنے اس خیال کو سالوں دماغ سے نہیں نکال سکا کہ ہر سورَ یا جو بھنگیوں کے محلے میں نظر آتی ہے پہلے کوئی عورت تھی۔

بحرالکاہل کے جزیرے میرے تخیل میں عجوبات سے پٹے پڑے تھے۔جہاں جاؤ وہاں انسان ایک نئی شکل میں ملے گا۔میرے خیال میں وہاں کے جانور بھی اس طرح رستے بستے اور کھاتے پیتے ہوں گے کہ دیکھیں تو ہمارے گلداروں، بندروں، ریچھوں اور مکڑ بگھوں کی سٹی گم ہو جائے۔

جم کوربیٹ Jim Corbet نے جس کی زندگی کا بڑا حصہ ہمالیہ کی

''چہارسُو''

ترائی کے جنگلوں میں گزرا تھا اور اُنہی جنگلوں سے متعلق اس نے کتابیں لکھیں۔ کسی ایک میں ایک ایسے قبیلے کا ذکر کیا ہے جس کے رہنے سہنے کا انداز دنیا سے نرالا تھا۔ تفصیل مجھے اب یاد نہیں لیکن ان کی خاص بات یہ تھی کہ مرد کھیتوں اور باغیچوں میں کام کرنے والے تھے، عورتیں گھر سنبھالتی تھیں۔ مرد پتھریلی زمین کو کھیتی باڑی کے لائق بناتا تھا۔ اس میں ہل چلاتا، کیاریاں بناتا، ان میں بیج بکھیرتا اور فصل کو پانی دیتا تھا۔ گھر بھی پانی پہنچاتا ہوگا۔ جلانے کے لیے درخت کے گدّے کاٹتا اور پھر ان کی چھپٹیاں بنا کر گھر پہنچانا بھی اس کے کام میں داخل تھا۔ وقت ہو جانے پر کھیت میں آ کر عورت کے بتانے پر کہ آ کر کھانا لے لے وہ بدقسمت مرد دو برتن لے کر دروازے پر جا کھڑا ہوتا۔ اور یہی کام وہ اس وقت کرتا جب گھر کے گھر میں ہو اور عورت کہے ''کھانا لے لے'' وہ ڈلیا، کنڈیلی جو کچھ بھی ہو لے کر دروازے باہر جا کھڑا ہوتا۔

عورت ان دو برتنوں میں کھانا ڈالتی، اور وہ وہیں دہلیز پر بیٹھ کر کھاتا، کلاّ (کلّی) کرتا، پانی پیتا جو بیوی ذرا اوپر سے اس کے پانی پینے کے برتن میں انڈیلتی ہوگی کہ دونوں برتن چھو نہ جائیں۔ کھانے پینے کے آداب دونوں وقت کے لیے ایک ہی تھے۔۔۔ شاید آسمان میں کڑک کر گزر جانے والی بھی اور موسلا دھار بارش میں بھی۔

کھانے کے بعد وہ کام پر لوٹ جاتا یا وقت ساتھ دے تو گھر میں آ کر کھٹیا پر کمر سیدھی کر لیتا۔ اُسے گھر والا کہنا ایسی ہی مورکھتا ہے جیسے ہرا ندھے بھکاری کو سورداس کہنا۔ رات کو عورت اُسے اپنی بغل میں پا کر حیران نہیں ہوتی ہوگی نہ وہ عورت کو اپنی کھٹیا پر پا کے۔

کوربیٹ نے ایک دو وقت تو اس عجیب طرز زندگی کو برداشت کیا ہوگا پھر پوچھ بیٹھا: آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں تم بیوی اور بچوں کے سنگ کھانا کھاتے؟ یہ کیا کہ بیوی گھر میں کھائے اور تم دروازے کے باہر زمین پر بیٹھے بھکاری یا نوکر کی طرح۔

''بھکاری اور نوکر تو ہم ہیں ہی'' کسی نے کہا۔

تب کسی سیانے مرد نے سینے کا راز اگلا کہ اس کے پیچھے کہانی کیا ہے۔

''پشتوں پہلے ایک لڑائی میں یہاں کے مرد۔۔۔ ایکوں ایک۔۔۔ مارے گئے تھے۔ رہ گئیں عورتیں گھروں میں۔ اُن سے جاتی باہر دوسرے بنش والے وِواہ کرتے۔ گھر میں ڈال لینے کو سب تیار ہو جاتے۔ تب ان بے چاریوں کو اپنے کھیتی ہروں سے وِواہ سنبدھ جوڑنا پڑا۔ اُسے بھی انہوں نے مالکن کا حکم سمجھا، بجالائے۔ اب سے یہاں کے مرد، مجھ سمیت سب نیچی جات والے ہیں اور پکارے جانے پر دوار پر آ کر مالکن سے بھوجن لیتے ہیں۔ ہاں رات کو گھر میں بسرام کی اجازت ہوتی ہے۔

اُن دنوں مارگریٹ میڈ، Ford and Beach، کپلنگ، کوربیٹ، اینڈرسن سب مجھے اکساتے تھے گھر سے نکل کھڑا ہو اور دنیا دیکھ۔ جا کر خود چیک کر جو انہوں نے لکھا ہے یوں ہے بھی یا نہیں۔ یہ کیا کہ ایک ہی جگہ جمے جا رہے ہیں۔ سدا ایک سی بیاہ اور موت کی رسمیں اور مذہبی تیوہار۔۔۔ ایسے جیسے کوئی پرانی فلم ہر سال چند دن کے لیے ریلیز کر دی جاتی ہے۔ ایک ایک سین سو دفعہ کا دیکھا ہوا جس کا کلائمکس فساد سے پر ہوتا ہے یا پچھتاوے کے ساتھ گلے ملنا۔

کھانے میں وہی روز کے چھوٹے بڑے کا گوشت، سبزی یا دال، روٹی یا چاول۔ دل دماغ نوپنا مانگتے تھے۔ میرے دماغ کے پاس زردوزی کو بھلانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بس گھر سے نکل پڑوں، نجانے کتنے قبیلے مجھے ملیں جن کی مارگریٹ میڈ اور کوربیٹ کو بُو بھی نہ ملی ہو۔۔۔ اور نو پنا مجھے ملی۔

قدم قدم پر نہ سہی، کئی کئی سو میل چلنے اور سمندر میں چھوٹی بڑی کشتیوں میں آسمان کو چھوتی ہوئی لہروں کی اچھال پھاند کو جھیل کر۔

وہ جگہ میری آنکھوں کے سامنے ہے جہاں ایک پروہت کو پجاری ایک چوکور اندھے کنوئیں میں کھڑا کر کے نمک میں گاڑھ رہے تھے۔ یعنی اس کے چاروں طرف نمک کی بوریوں کی بوریاں الٹی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ گڑھا پٹ گیا۔

پوچھنے پر لوگوں نے بتایا مردوں کو ہم ندی میں بہا دیتے ہیں۔ میں نے کہا ''جلاتے نہیں؟''

اس نے کہا ''جلانے کو یہاں لکڑی کہاں، سوکھی گھاس پتوں پر کھانا پکتا ہے۔''

میرا سوال، سوال ہی رہا کہ اُسے نمک میں کیوں گاڑھ رہے تھے؟ اس کے لیے نمک کہاں سے آ جاتا ہے؟ جیسے مارگریٹ میڈ کی ٹیم جو الکاہل کے اُن جزیروں میں کام کر رہی تھی جہاں میدان جنگ عورت کی زندگی ہے یہ بتانے سے چُوک گئی کہ جب جنگ نہیں ہو رہی ہوتی ہے تو عورت کیا کرتی ہے۔۔۔ وہ عورت بن جاتی ہے یا مرد ہی رہتی ہے۔

اب مثلاً نیوگنی کے بعض قبیلوں کے بارے میں میرے پڑھنے میں آیا جب لڑکے کی وہ عمر آتی ہے جب سب کو اس کے اوپر کے ہونٹ پر سرمئی سا پالا نظر آنے لگتا ہے یعنی کشورتا جھلکنے لگتی ہے تو ایک مرد اُسے جنس سے انٹروڈیوس کرانے کے لیے اس کے ساتھ جو فعل عورت کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کے فضلہ نکلنے کے راستے کر کے دکھاتا ہے۔ مردوں سے چھپے چوری نہیں لیکن سمجھا یہی جاتا ہے عورتوں کو اس گھڑی کے نوجوانی میں داخل ہوتے ہوئے لڑکے پر آنے کا علم نہیں ہے۔

یہ طریقۂ تعلیم شاید سال بھر برتا جاتا ہے۔ زندگی کے اس پہلو کو نورمل سمجھا جاتا ہے اس یقین کے ساتھ کہ اس سے لڑکا مضبوط ہوتا ہے۔

اس رسم سے ایک اور رسم بھی وابستہ ہے۔ یہ خوف کہ نوسیکھیا کہیں اُمید سے نہ ہو جائے وقفے وقفے سے اسے لیموں کھلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے

جواُسے حامل ہونے سے بچاتی ہے، حاملہ نہیں۔

سال بھر میں وہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ نئے چھوٹوں کو بڑا کرے اور یہ تب تک کہ خود عورت والا ہو جائے۔

نہ سوسائٹی اس پر متاسف ہوتی ہے نہ باوجود سب کچھ جاننے کے عورتیں اس پر اعتراض کرتی ہیں۔ مگر میں عادت کے مطابق اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں کی عورتوں کے بارے میں جسے انگلش محاورے میں ذمے دار عمر کو پہنچنا Coming of age کہتے ہیں Anthropologists کیوں خاموش ہیں۔ یا جو انہوں نے لکھا ہے میری نظر سے نہیں گزرا کہ پوری عورت بننے سے پہلے ایک لڑکی پر کیا گزرتی ہے؟ راضی خوشی یا مارے باندھے؟ ممکن ہے اُن جزیروں کے بعض قبیلوں میں لڑکے کی پہلی واقف کاری کی رسم کی طرح لڑکی کی واقف کاری کو مردوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہو اور وہ اُسے پوری طرح جانتے ہوں۔ میرے خیال میں اسے لیموں کھلانے کی جگہ ضرورت پڑنے پر التاس کھلانا بہتر ہوگا۔ میری دلچسپی اس کے دوسرے رُخ میں باقی رہی۔

میں ٹین کی چادر کے چپٹے تلے کی ناؤ میں اس جگہ بھی گیا جہاں شام کو ایک عورت دن بھر کی جنگ کے بعد رات کو اپنے گھر لوٹ کر آنے والے بیٹے کے لیے کھانا پکاتی ہے اور وہ باہر چوراہے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ کھانا سدا اُبالے چاول اور کھجور کا ہوتا ہے۔ وہ آبادی چاروں طرف سے ایسی اُتھلی ندیوں سے گھری ہوئی ہے جو جس رخ جی چاہتا ہے بہتی ہیں اور اپنی تلی میں یہاں وہاں مٹی اور پتھروں کے چوٹیاں چھپائے رکھتی ہیں۔

اس علاقے کے سارے نوجوان، جوان اور بوڑھے سو، سوا سو سال پہلے اپنی لمبی نالوں والی بندوقوں سے جن میں چوکور سے چھرّے اور بارود بھرے جاتے ہیں، انگریزی فوج کی کارتوس والی بندوقوں اور توپوں سے آخری دم تک لڑتے تھے۔۔۔ انہیں اپنا یہ علاقہ اتنا عزیز تھا۔۔۔ اور جب چلانے کو ایک پتھرا بھی نہ رہا نہ چٹکی بھر بارود۔۔۔ اور دست بدست لڑائی کے لیے دشمن دور تھا جو جو بچے تھے وہ قبلہ رو سجدے میں چلے گئے۔

کون عورت وہ کھانا پکاتی ہے کوئی نہیں بتا سکا۔ میں نے پوچھا ''اُسے کتّے اور کوّے نہیں کھا جاتے؟''

سب نے نہیں میں سر ہلایا۔ وہ سب میرے ساتھ ساتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے انہیں مجھ سے کچھ حاصل ہونے کی امید ہے۔ عورتیں دروازوں سے جھانک رہی تھیں۔ میں شاید وہاں پہلا اجنبی تھا۔

ایک ٹوٹی ہوئی مسجد کے پاس جہاں چند بیٹھی ہوئی اور ترچھی پڑھی ہوئی قبریں بھی تھیں ایک چبوترے پر ایک کونڈا رکھا نظر آیا۔ میں نے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے والے نوجوان سے پوچھا ''یہ ہے وہ برتن جس میں لوٹ کر آنے والے سپاہی کے لیے کھانا رکھا جاتا ہے؟''

اُس نے ہاتھوں اور سر کے اشارے سے ظاہر کیا ہو سکتا ہے۔

درختوں پر بیٹھے کوّے بھی خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کونڈا خالی نہیں ہے لیکن وہ اس سے بے اعتنائی نہیں برت رہے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے میں سن چکا تھا لڑائی والے دن اُن آخری سپاہیوں کے سجدے میں چلے جانے کے ساتھ ہی وہاں سے پیڑوں پر بیٹھے ہوئے گدھ کہیں رخصت ہو گئے تھے اور پھر کبھی اس علاقے میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

خود میں اس کہانی کو ادھورا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پھر وہ کھانا کہاں جاتا ہے؟ اس کا کیا ہوتا ہے؟ شاید انہیں امید تھی میں وہ کھانا کھالوں گا اور میں وہ سپاہی ہوں جو اُس شام لڑائی سے نہیں لوٹا تھا۔ اُس کا آجانا اُن سب کا آجانا ہوتا۔

اور بہت کچھ دیکھا۔ چلی اور ارجنٹینا گیا، کونگو کا بیسن Basin، ایراوری کے کنارے کے گھنے جنگل، انڈمان اور الکاہل کے کتنے ہی جزیروں کو چھان مارا۔ جہاں جہاں پونچی لے جا سکتی تھی اور ہمت اور جوانی، گیا۔ ہر جگہ کی ہر انوکھی رِیت ذہن نے محفوظ رکھی اور آج تک ہے۔ سوائے ایک علاقے کے جس کو میں بھلا دینا چاہتا ہوں اور جس نے میرے مزید دنیا دیکھنے کے شوق کو ہمیشہ کے لیے دفنا دیا۔

وہ علاقہ بہت وسیع تھا۔ ایک طرح سے قدرت کا ریگستان سے چھینا ہوا کیوں کہ اس کے وسط سے ایک چوڑا دریا گزرتا ہے جس کی شاخوں نے میلہا میل جنگل اگائے تھے۔ بارش اور سیلاب اپنے پیچھے جھیلیں چھوڑ جاتے تھے جو مچھلیوں اور اندھی جل پریوں سے پٹی پڑی تھیں۔ چھوٹی آبادیوں جمگھٹوں کی شکل میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔۔۔ ایک دوسری سے قبیلوں کے رشتے میں بندھی۔ بڑی آبادیوں کے قصبے تھے مگر میری دلچسپی جیسا کہ کہہ چکا ہوں دیہاتوں میں تھی یا اُن جنگلی باسیوں میں جن کی ہر جگہ اپنی زبان تھی۔ لگتا تھا ہر دس بیس کوس پر زبان بدل جاتی ہے اور رسم و رواج یا تو ہیں ہی نہیں یا وہ بھی بدل جاتے ہیں۔

ایک قبیلے میں جا گھسا جن کو نہ کھیتی باڑی سے مطلب تھا نہ کسی قسم کے جانور پالنے سے۔ ایسا لگتا تھا زمین پر نہیں فردوس میں رہ رہے ہیں جہاں کھانا از خود ان کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ لوگ نہ جھگڑالو تھے نہ جنگجو۔ سارے دن بیٹھے رہنے والے۔۔۔ جیسے نیوگنی کے ارا پیش Arapesh۔ مرد، عورت سب خاموش، بس یہاں وہاں پڑے رہنے والے۔ لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، بچوں پر مہربان، اور اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو اُسے کندھوں پر لاد کر میلوں دور کے شہر لے جاتے تھے۔

لیکن ایک اور قبیلے کی بسی ہوئی زندگی کچھ اور ہی طرح سے تھی۔ چھوٹی آبادی کا قبیلہ تھا، کافی بڑے علاقے میں پھیلا ہوا۔ سب ایک ذات والے تھے۔ اُسی چوڑے دریا کے بیسن میں ہونے کی وجہ سے پانی وافر تھا لیکن کھیتی باڑی خود کم زیادہ اپنے نوکروں سے کراتے تھے۔ وہ بھی اُن ہی کی ذات کے تھے۔ زمین اپجاؤ تھی، اس لیے ان کا کہنا تھا کام بہت کم مانگتی ہے۔

وہ لوگ عبادت گاہیں بھی رکھتے تھے اور مرے ہوؤں کے لیے جو مقدّرت رکھتے ہوں، یا وہ جن کا خدا سے ڈائریکٹ لِنک سمجھا جاتا تھا مرقد کی شکل کی خاصی نمایاں عمارتیں تیار کرتے تھے۔۔۔صرف مردوں کو یہ اعزاز تھا۔اور وہی بات احرام کی طرح یہ سلوک ہر مرنے والے کے ساتھ نہیں ہوتا ہوگا۔

وہاں کے لوگ ملنسار بھی تھے لیکن آپس میں ایک قبیلے اور ذات کے ہوتے ہوئے بھی بُری طرح خاندانوں میں تقسیم۔مجال ہے ایک خاندان کی لڑکی دوسرے خاندان کے نوجوان کا دل لے لے، یا اپنا دل اُسے دے دے۔اور لڑکا جسے دوسرے گاؤں کا سمجھا جاتا تھا اگر لڑکی کے گھر کے آس پاس منڈلاتا نظر آجائے تو یوں سمجھو اس پر آسمان سے قہر نازل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔یہ لوگ خود کو تمام دنیا جہان سے افضل سمجھتے تھے اور ان کا دنیا جہان ایک طرف کی بے آب و گیاہ بنجر زمین اور دوسری طرف دریا تک محدود تھی۔محبت کی ڈفلی بجاتے تھے لیکن ہر وقت ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کو تیار۔۔۔کچھ کچھ مارگریٹ میڈ کے مُنڈو گامُر Mondugamur اور وہ جن کا ذکر رچرڈ برٹن نے کیا ہے۔لیکن موخرالذکر زنخے تھے۔''آغا''

ان قبیلوں میں ہوتے ہوئے میرا گزر ایک آبادی سے ہوا جس کے بارے میں دوسری آبادیوں اور خاص طور سے شہروں والے یا تو بہت کم جانتے تھے یا جانتے تھے تو بتانے سے کتراتے تھے۔ایک طرح سے وہ لوگ دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔میرے پوچھنے پر صرف ایک دکاندار جواب دینے پر راضی ہوا کہ وہاں والوں نے ساری دنیا کو ایک غلط سبق سکھایا ہے، لیکن میرے کیا؟ کہنے پر وہ بے رُخی سے دوسرے گاہک سے تمباکو کے نرخ پر بات کرنے لگا۔جیسے میں وہاں تھا ہی نہیں۔

وہاں مرد کھیتی باڑی اور سیدھی سادی گھر سے باہر کی زندگی کے کام کرتے تھے۔لڑائی چھڑ جائے تو خود لڑتے تھے یہ نہیں کہ ان کی عورتیں گھروں سے بندوق اور تلواریں لے کر نکل آئیں۔کوئی اور بات بھی ان کی چوکنا کرنے والی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہاں عورتیں گھروں میں رہتی ہیں اور مردوں کو گھر سے دور رکھتی ہیں جنگل میں۔۔۔جنگل سے مراد کھیت، باغ، جھاڑ جھنکاڑ سب ہی تھے جہاں مرد رہتے تھے، سوتے تھے اور سارے وہ کام کرتے تھے جو مرد کے کرنے کے ہیں۔یعنی یہ وہ آبادی تھی جس میں عورتیں لڑکا پیدا ہونے پر اُسے گھر سے دُور رکھ کر پالتی تھیں۔یہ کوئی ٹوٹکا نہیں تھا۔اس کا پلنا بڑھنا، شادی کرنا سب جنگل میں ہوتا تھا۔اس خبر نے میرے اندر سمائی ہوئی anthropologist کی روح کو بھڑکا دیا۔

میرا خیال تھا جہاں پکی عمارتیں، دکانیں، چائے گھر ہوں گے وہاں کوئی نہ کوئی ہوٹل بھی ضرور ہوگا لیکن یہ لفظ وہ صرف چائے گھر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ایک چھپر یا ٹین کی چھت کا بے دروازے کا چھوٹا سا کمرہ جس میں اینٹوں کے چبوترے جیسے چولہے پر کیتلی اور دودھ کی پتیلی کھول رہے ہوتے تھے اور سامنے بینچوں پر چائے پینے والے خاموش بیٹھے ہوتے تھے یا لن ترانیوں میں مصروف۔

اگر ٹھہرنے کی جگہ ملے تو میرا ارادہ وہاں ہفتہ بھر رکنے کا تھا۔دوسرے مردوں کی طرح جنگل میں نہیں۔توبہ توبہ مچھر اور ڈانس اور پتّو رات بھر میں مجھے ڈھانچا کر دیتے۔پھر وہاں کے سانپ الامان۔میں نے ٹھیرنے کی جگہ ہونے نہ ہونے کے بارے میں کسی سے سوال نہیں کیا اور گھر سے باہر چلتی پھرتی چند عورتوں میں سے کوئی مجھے اپنے گھر میں ٹھہرانے پر راضی نہیں ہوئی۔

یہ سب کیا تھا؟ آبادی کے بڑھنے کو روکنے کی منصوبہ بندی؟

اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے ایک جگہ میں نے درجن بھر مردوں کو پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھے دیکھا۔سب نے گھٹنے موڑ کر اپنی کمر اور ٹانگوں کو ایک رسّی کے حصار میں لے رکھا تھا جو بعد میں میری سمجھ میں آیا اُن کی بل دی ہوئی چادر ہے۔سب زمین پر چوتڑوں کے بل بیٹھے تھے اور جج، وکیل، حوالات قسم کے لفظ ان کی زبانوں پر تھے۔جیسے سب مقدمہ بازی میں پھنسے تھے۔

سب سے ہاتھ ملا کر میں بھی اُسی دائرے میں زمین پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔جواب میں اُن میں سے کسی نے سگریٹ، کسی نے بیڑی کا بنڈل۔میں برما کا چُرٹ اور ویسٹ انڈیز کا سگار پی چکا تھا، بیڑی قبول کرنے میں مجھے کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔لیکن پہلے ہی کش پر وہ دھکا اُٹھا کہ سینے کا سارا بلغم منہ میں آ گیا جسے میں نے جیب سے رومال نکال کر اس میں تھوکا۔وہ لوگ منہ موڑ کر اپنے پیچھے تھوکتے جاتے تھے اور دو ایک اپنے سامنے ہی۔

ان لوگوں کو مجھ میں دلچسپی تھی، مجھے اُن میں۔وہ جاننا چاہتے تھے کون ہوں، یہاں کیسے آ گیا۔اور سب سے بڑھ کر کیوں؟ کیونکہ اپنی ضرورتوں کے لیے وہ دور کے گاؤں اور شہروں میں جاتے ہوں گے۔اِدھر کوئی مجھ جیسا بھولا بھٹکا ہی آ جاتا ہوگا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے سوال پیش کیے جن کا لب لباب یہی تھا کہ اور سب قبیلوں سے ان کی زندگی مختلف کیوں تھی؟ اور کب سے؟

وہ میری بات پر ہنسے اور دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔میں اپنی جگہ پر بیٹھا جُز بُز ہو رہا تھا کہ یہ کیا پوچھ بیٹھا۔اگر وہ سب بت بنے نہ بیٹھے ہوتے تو میں سمجھتا ابھی اٹھ کر مجھ پر پل پڑیں گے۔

میرے دوبارہ سگرٹ کے پیکٹ کو ان کی طرف بڑھانے پر ایک گھاگ قسم کے آدمی نے بغیر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کہا ''بابا یہ تیرے سمجھنے کی بات نہیں ہے کیوں کہ کوئی بات ہے ہی نہیں جسے تو سمجھے۔جسے تو جنگل سمجھ رہا ہے وہ گھر ہے اور جسے گھر کہتا ہے وہ جنگل ہے۔'' پھر اس نے ناگواری سے کہا ''عورتوں کا جنگل''۔

دوسرے نے پہلو بدل کر کہا سب ایک ہے۔جو جہاں پیدا ہوا وہیں

رہتا ہے۔ ہم جنگل میں پیدا ہوئے وہیں ہمیشہ سے ہیں، عورتوں نے گھر میں آنکھ کھولی وہیں رہتی ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا ہم انہیں جنگل میں آنے سے نہیں روکتے لیکن وہ ہمیں گھر کی چوکھٹ پھاندنے نہیں دیتیں۔

''رات کو ہمیں عورت کی ضرورت پڑ جائے تو ہم وہاں نہیں جاسکتے۔ ایک جواں مرد نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا''لیکن عورت کو مرد کی ضرورت پڑ جائے تو بڑے شوق سے چلی آتی ہے اور اپنے مرد کے پاس آ کر لیٹ جاتی ہے۔۔۔ اوٹ میں، سب کے سامنے نہیں''بس یہ ہے ہماری لڑائی کی جڑ۔''

''وہ مردوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں ان کی مرضی''بوڑھے گھاگ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی باقی سب کپڑے جھاڑتے ہوئے آس پاس کے کھیتوں کی طرف چل دیئے۔

میرے لیے اس کا ایک ہی مطلب تھا اس نوعیت کی باتیں ان کے لیے دلچسپی سے خالی تھیں، یا تکلیف دہ۔

میرے ساتھ آگ پر سینکے ہوئے آلو تھے اور جیبوں میں چنے اور پرمل۔ میرا دماغ میری مرضی کے خلاف کام کیے جا رہا تھا یہ سب کیا ہے؟ میں کہاں آ گیا ہوں جہاں عورتوں سے مرد ڈرتے ہیں؟ دور کھیتوں میں مرد کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک آدمی پیڑ پر چڑھا اس کا گدّا کاٹ رہا تھا۔ نیچے دو آدمی چری ہوئی لکڑی سے استعمال کی چیزیں بنانے میں مصروف تھے۔ ایک جگہ ٹھٹھیرا آگ جلائے اس پر اوندھائی ہوئی دیگ کی ٹھوکا پیٹی کر رہا تھا۔ ایک چھپر تلے ایک ادھیڑ عمر کھاٹ پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ لیکن سب بنے ہوئے علاقے سے کچھ فاصلے پر تھے جیسے اچھوت ہوں اور مجھ میں کسی کو حتیٰ کہ اِکا دُکا راہ چلنے والے کو بھی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے ایک پتلی سی ندی کے کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ پیر دھوئے، شیشی سے نمک چھڑک کر آلو کھائے اور سوچ رہا تھا اس آبادی سے شام پڑنے سے پہلے نکل جانا چاہیے اور یہاں کی پہیلی کو ذہن میں دفن کر دینا ہی بہتر رہے گا ورنہ رات کے لیے صرف چنے اور پرمل ہیں اور ساتھ دینے کے لیے چھٹانک چھٹانک بھر کے مچھر۔

اچانک جیسے قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی۔ میں گھاس پر لیٹا اونگھ رہا تھا کہ ایک سات آٹھ سال کی لڑکی کو دھندلائی نظر سے اپنے پہلو میں کھڑا دیکھا جو مجھے جگا رہی تھی۔

''بابا تجھے ماں بلاتی ہے''جس سے مراد کوئی بھی سن رسیدہ عورت ہو سکتی تھی۔

''مجھے؟ تیری ماں؟''اس نے دونوں بار ہاں کہا۔

میں اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ اندر سے خوش تو شاید نہیں تھا، ڈر ضرور رہا تھا کہ وہ عورت مجھ پر کوئی آفت نازل کرے گی۔ مجھے اس قبیلے کی ساری عورتیں نیوگی کی ان عورتوں کے رشتے میں کچھ لگیں جو مردوں کو گھر میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ کر خود بانس کے نیزے اور لوہے کے ہنسیا جیسے پرانگ Prang سنبھال کر دشمن سے جنگ کرنے جاتی ہیں۔ کہیں یہ ماں جس کا ذکر تھا مجھے بھی بچہ گیری پر نہ لگا دے! جی کہتا اس سے تو بہتر ہوگا کہ گھر کی چوکھٹ کے باہر کھڑے رہنے کا حکم دے کر کہے بھوجن لے لے۔

پہلی نظر میں وہ عورت مجھے خاصی عمر کی لگی لیکن جلد میری رائے بدل گئی اور اندر کی آواز نے کہا''بے عمر ہے۔''

دروازہ کھول کر وہیں کی ایک بانس کی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں مکان کی دو سیڑھیاں نیچے دھوپ میں کھڑا تھا۔ جو لڑکی مجھے بلانے گئی تھی اُس عجوزہ کے پیچھے کھڑی ہوگئی جو اس کی ماں، نانی، دادی کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اِدھر اُدھر عورتیں تھیں۔۔۔ دروازوں میں، کھڑکیوں میں، میرے پاس سے گزرتی ہوئی لیکن انہیں مجھ سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے طلب کرنے والی نے مجھے نہ اندر آنے کے لیے کہا نہ پوچھا کچھ کھاؤ گے، پیو گے۔

ہماری بات چیت جیسے ڈائریکٹ اس موضوع پر پہنچ گئی جس کے لیے میں یہاں آیا تھا۔ اُسے نہ میرے بیوی بچوں میں دلچسپی تھی کہ ہیں بھی یا نہیں، نہ میرے کام کاج میں۔ تھی تو اس میں کہ کیا دیکھنے آئے ہو؟ کس نے یہاں آنے کے لیے کہا تھا؟ یہاں تو کوئی نہیں آتا ہے۔

میں نے جی کڑا کر کے کہا''اس عجیب دنیا کو دیکھنے آیا ہوں جہاں عورتیں گھر میں رہتی ہیں مرد جنگل میں۔ رہا یہ کہ کس نے کہا تھا میرے عجیب باتوں کی کھوج میں رہنے والے اس نے (میں نے سیدھے ہاتھ کی ایک انگلی سے کنپٹی کو ٹھوکا دے کر کہا) اور پرے کے شہروں والوں سے سن سن کر کہ یہاں ایک قبیلہ ایسا بھی ہے۔۔۔''

''جہاں عورتیں مردوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی ہیں'' اس نے میری بات پوری کر دی۔''ایسا ہمیشہ سے نہیں ہے''اس نے آنکھیں بند کرتے سر ہلاتے ہوئے کہا۔۔۔ اس کے چہرے سے عمر رسیدگی جھلک رہی تھی۔ پھر اپنی زبان میں اپنی بیٹی، پوتی، نواسی سے، یا وہ جو بھی تھی کچھ کہا جس پر وہ میرے لیے شربت کی قسم کا کوئی ڈرنک لائی جسے میں ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اس وقت وہ مجھے سدا ایک ہی عمر کی رہنے والی جوان عورت نظر آئی۔

''اپنا سوال دہراؤ''اس نے کہا۔

میں مؤدب کھڑا بتا تا رہا میری دلچسپی ملکوں ملکوں گھوم کر وہاں کے لوگوں کے زندگی بسر کرنے کے طریقوں کو دیکھنے میں ہے کہ وہ کیسے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

''ہوں''اس نے اس لفظ کو گنجائش سے زیادہ لمبا کر کے کہا۔ پھر اس نے گود میں رکھے ہوئے پیکٹ کو اچکا کر آدھا کھولا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے تھینک یو کہا اور اپنا پورا پیکٹ''Keep it'' کہہ کر اسے سونپ دیا۔

سگریٹ سلگا کر وہ جیسے پھٹ پڑی۔ آواز کا دھیما پن ختم ہو گیا، چہرے سے ملاحت رخصت ہوگئی اور اس کی جگہ چہرے کی جھریوں سے جھانکتی ہوئی نفرت نے لے لی۔لڑکی اس کی ہر بات پر سر ہلا رہی تھی اور وہ عورتیں بھی جو اتنی دیر میں اندر آ کر اس کے اردگرد جمع ہوگئی تھیں۔

اس لیے کہ ہم ان سے نفرت کرتے ہیں۔ بوڑھوں، جوانوں نوجوانوں سب سے، چھوٹے بڑے لڑکوں تک سے، بچہ جنتی ہیں لیکن اُسے دیکھنا ایسے جیسے سنپولیا ہے، ہمارا دھرم ایمان ہے۔

''دودھ پیتے بچے تو گھر میں رہتے ہوں گے؟''

''دودھ پیتے بچوں سے بھی۔ چسگ سال سے (میں سمجھ نہیں سکا اس نے کتنے کہا) ایک بھی بالک ہمارے قبیلے کی کسی عورت نے گھر میں نہیں جنمہ ہے۔ پھر اس کے گھر میں رہنے کا کیا سوال ہے۔ آخری بات اس نے جیسے عدالت میں فیصلہ سناتے ہوئے کہی۔

میں جو کہنا چاہ رہا تھا اس کے لیے الفاظ کو ذہن میں ترتیب نہیں دے پا رہا تھا۔''اور بالکاہ؟'' ڈرتے ڈرتے میں نے کہا۔اس کے اس انٹرویو کو ایک دم میں ختم کرنے کا امکان مجھے ستا رہا تھا۔

''بالکا کے پیدا ہونے پر اس کی ماں اُسے سورج کو دکھا کر اسی وقت گھر لے آتی ہے یا وہ جب بھی نکلے بالک کو وہیں چھوڑ آتی ہے چاہے کوئی ناگ یا بچھو۔۔۔''

''جنم دینے کی جگہ ہر طرف سے بند ہوتی ہے اور اسی میں وہ پلتا ہے۔''

''اور اس کی ضرورتیں؟''

''دودھ پلانا، نہگنا، موتنا، نہلانا، دھلانا کپڑے بدلوانا سب ماں وہیں جا کر کرتی ہے، اُسے گھر میں لا کر نہیں۔''

ایک بے تکی خاموشی کے بعد میں نے دبی سی مسکراہٹ سے سوال کیا مگر عورت، مرد میں کھچاوٹ؟ اس کا کیا بنتا ہے؟

عورت سمیت سب لڑکیوں عورتوں نے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کی۔

''وہ رات کو، یا دن میں بھی، اپنے آدمی کے پاس جا سکتی ہیں۔''

''اپنے آدمی کے؟''

''وہاں وہ صرف ایک آدمی رکھتی ہے''

میں کہنا چاہتا تھا: یُوں نہیں کہہ سکتے وہ صرف ایک عورت رکھتا ہے، لیکن یہ پھول پر بیٹھی ہوئی شہد کی مکھی کو ہاتھ سے اڑانا ہوتا اس لیے میں نے اپنے خیال کو ٹال کر پوچھا''ہمیشہ سے ایسا ہے؟''

''نہیں''

''پھر ایسا کیوں ہوا کس نے کیا؟''

سب عورتیں اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ دیکھیں اس کے منہ سے کیا نکلتا ہے۔ عجوزہ نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کا بازو پکڑ کر اس کا رخ میری طرف کیا: اُس کی جوان بیٹی کو اس کے باپ نے شوٹ کیا تھا (کیوں؟ میں نے درمیان میں کہا) اس لیے کہ وہ اپنی پسند کی شادی پر اڑی ہوئی تھی اور باپ اُسے خود اپنے سے بڑی عمر کے دوست کو دے چکا تھا۔ گھر کے خالی گملے کی طرح، کہ اِس میں تجھ میں دم ہے تو جو پودا چاہے لگا لے اور جا کر پولیس آفیسر کے سامنے میز پر بندوق کو رکھ کر تن کر بولا''میں نے اپنی بیٹی کو شوٹ کیا ہے کیونکہ وہ بدچلن ہو گئی تھی۔۔۔ بے شرمی سے کہہ رہی تھی دل سے کس کی ہو چکی ہے'' پولیس آفیسر بھی اسی مٹی کا بنا تھا اس نے اُسے عزت سے کرسی پر بٹھایا۔ جب وہ ہاتھ میں بندوق تھامے گھر لوٹا تو سب مرد اور لڑکے اُسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی ہیرو جنگ سے لوٹا ہے۔

مرنے والی کے لیے بڑے اور اُن کی دیکھا دیکھی بچے بھی پوچھ رہے تھے''کوّی کا کیا ہوگا؟ کب اُسے گاڑھنے لے جائیں گے؟'' گھر میں صرف مرنے والی کی ماں اور بہنیں رو رہی تھیں، مردوں سے چھپ کر۔ صرف اس کی دادی بول اٹھی ہمیشہ سے ایسے ہی ہے۔ روؤ چاہے جان دے دو۔

پھر اس نے ایک جوان عورت کو نام سے پکار کر سامنے آنے کو کہا، سامنے آنے پر ناگہاں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ عورتوں میں سے دو نے ایک ساتھ کہا''ارے یہ تو رونا کب کا بھول چکی تھی۔''

عجوزہ نے پیش کی جانے والی گواہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا''اس کی بوڑھی ساس کو جو کب کی سوکھی خشک عورت تھی اُس کے بیٹے یعنی اس کے میاں نے جو شراب کا لتّی تھا اور اس کے سارے گہنے جوئے اور شراب میں لُٹا چکا تھا خود شوٹ کیا تھا کیونکہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا اور وہ نادان اُسے سنبھل جانے کو کہہ رہی تھی کہ مرنے کے بعد خدا کو کیا جواب دے گا۔''

اور وہ کہہ رہا تھا''میری طرف سے جواب تُو دے گی''

جب وہ مر کر گری تو بینے کے منہ سے نکلا چار پیسے کما کر دینے کے کام بھی نہیں رہی تھی اور جی کر کیا کرتی، یہ سن کر جوان عورت نے ہچکیوں کے ساتھ کہا''میں اُسے بچا بھی نہیں سکی'' اور روتی ہوئی عورتوں کی لائن کو چیرتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اس کے گاؤں سے اسے یہاں لایا گیا، ایک بڑی عمر کی عورت نے کہا۔

لگ رہا تھا ایک ایک کر کے گواہ عدالت میں پیش کیے جا رہے ہیں جو صرف ایک فرد پر مشتمل تھی۔ اُس عورت پر جو بانس کی آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہی وکیل فوجداری تھی، وہی وکیل دفاع، وہی منصف اور وہی سزا کو بجا لانے والی، جلاّد۔ اس کی عمر کا اندازہ لگانا میرے لیے دشوار تھا۔ ایک عجیب چیز جو میں نے اس کے چہرے میں دیکھی وہ دو متضاد جذبات کا بیک وقت اظہار تھا۔ ممتا اور زخم خوردگی یعنی محبت اور حقارت دونوں ساتھ ساتھ نمایاں تھے۔ وہ عذرا بھی تھی اور

عجوزہ بھی۔ میں اس کے لیے عجوزہ استعمال کر رہا ہوں۔۔۔ بڑھیا۔

''اس کی بیٹی، تین بچوں کی ماں جن میں سے ایک چھاتی پر تھا کو شوہر نے اپنے بھائی سے شوٹ کرایا تھا۔ بھائی سے اس لیے کہ اس کے بارے میں مشہور تھا اس کے دماغ میں اونٹ بیٹھا ہے (میں چونک پڑا) اور اس آدھ مغز نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر گاؤں کے بڑوں کی کونسل میں کہا کہ اس نے اپنے بھائی کی عورت کو کسی دوسرے قبیلے کے مرد کے ساتھ سورج مکھی کی کھڑی فصل میں دیکھا تھا۔

''کیا کرتے دیکھا تھا؟''

''دودھ پلاتے''۔ اس پر جج سمیت سب مرد دل کھول کر ہنسے۔ عورت وہاں ایک بھی نہیں تھی۔

''اپنے بچے کو؟'' جج نے پوچھا۔

''نہیں اُس مرد کو''۔ ایک بار پھر پوری عدالت ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگی۔

آخر کو جب سب کا ہنسنا تھما تو جج نے پوچھا ''اس مرد کو کیوں نہیں مارا؟''

اس نے کہا ''اس کے لیے بھائی نے نہیں کہا تھا''

''وہ تھا وہیں'' جج نے پوچھا۔

ادھ مغز نے سوچ کر کہا ''میرا خیال ہے نہیں تھا''

''بھاگ گیا ہوگا'' صفائی کے وکیل نے کہا اور جج نے تسلیم کر لیا۔

''اصل بات کسی نے نہیں پوچھی کہ ماری جانے والی کا جرم کیا تھا؟''

''حقیقت میں بس اتنا کہ اس کا شوہر کسی خانے بند نہیں تھا۔ اس کی جانگھ میں گلٹیاں بنیں اور پھٹتی گئیں جن میں سے پیپ بہتی تھی، پیشاب کی نالی میں بھی سوراخ ہو گئے ان سے بھی پیپ نکلتی تھی اور کوئی عورت پاس پھٹکنے نہیں دیتی تھی کہ اُسے گندی بیماری ہے۔ بات کے کھلنے پر الزام بیوی پر دھر دیا کہ وہ بدچلن ہے، اس سے لگی ہے، سب نے کہا ''تو اسے مار کیوں نہیں دیتا''

تو بیوی کو مارنا اس کی عزت کا سوال بن گیا۔ جس عورت کا بازو عجوزہ نے پکڑ رکھا تھا کہا اُس کی بیٹی کے کان میں جب یہ خبر پڑی تو وہ سہم کر رہ گئی۔ صرف اس کے پوچھنے پر کہ چپ کیوں ہے؟ اس نے کہا: امّاں میرے دن پورے ہو گئے۔ کئی عورتوں نے کہا ''بھاگ کیوں نہیں جاتی؟ بھاگ جا جلدی کر۔''

''کس کے ساتھ؟ کہاں؟ میرا تو کوئی جاننے والا بھی یہاں سے باہر نہیں ہے۔''

عورتوں نے کہا ''کہیں بھی''

''جہاں عورت کو مارنے کا سوال آ جاتا ہے مرد اپنی بات کے پکے اترتے ہیں۔ بغیر پوری کیے پیچھے نہیں ہٹتے۔ پنچ اور عدالت عزت کے سوال کو دشمنا گی میں کسی کی کھڑی فصل کو آگ لگا دینے سے بڑا جرم سمجھتے ہیں۔ فصل کا کیا ہے پھر اُگا لو لیکن گئی عزت کا پودا پھر نہیں پھوٹتا ہے۔

تو پھر خود تو نہیں اس نے اپنے اس بھائی سے یہ کام کرایا جس کے دماغ میں اونٹ بیٹھا ہے۔ بھائی نے اس سے یہ کام کرنے کو کہا۔ اس نے کہا ''ابھی لو'' پہلے ہی سے اس کے خلاف بھرا بیٹھا تھا کیوں کہ وہ اکیلے میں اس کے حد سے بڑھنے کو ٹھکرا چکی تھی۔ مرنے والی کے پیچھے پیچھے گیا اور وہ جہاں بھی تھی ''ایک شوٹ میں اُسے گرا دیا'' اس نے آ کر بھائی سے فتح مندانہ انداز سے کہا۔

''پھر؟''

''مرنے والی کو جیسا کہ وہاں کا دستور تھا، یہ یہاں کا نہیں ہے'' عجوزہ نے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی عورت کے سر کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا ''سب کوّی کہنے لگے''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

ایک عورت نے جواب دیا ''جس نے اپنے آدمی کی عزت کو کالک لگائی ہو''

دوسری بڑی عمر کی عورت بولی ''جس کی قضا باپ، چچا، بھائی یا بیٹے کے ہاتھوں آتی ہے اس کا ذکر کوّی کہہ کر بات چیت میں آتا ہے۔ پوچھو کون تھی؟ جواب دینے والا کہے گا ''کوّی''۔ جیسے عقیقے پر اس کا نام یہی رکھا گیا تھا۔

میں نے جھلاہٹ میں کہا ''کہنا چاہیے: کالے کوّے کی جورو''

''وہ کون؟'' عجوزہ نے پوچھا۔

''کوئل۔ جس کی آواز میٹھی ہوتی ہے۔''

ہر چہرے پر رونق آ گئی۔

جس نے عقیقے کا نام والی بات کہی تھی وہ اپنی رو میں بولتی رہی ''نہ اس کے جنازے کی نماز ہوتی ہے، نہ قبر بنتی ہے، ترس کھانے والے گاڑھ کر چلے آتے ہیں اور انہیں بھی لوگ اچھا نہیں سمجھتے ہیں۔ کوئی گھر والا اسی لیے شرم کے مارے کوّی کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔''

''بزدل کہیں کے'' میں نے کہا ''مگر بالکوں کو کیوں نہیں گھر میں رکھتیں؟ ان معصوموں نے کیا جرم کیا ہوتا ہے؟''

عجوزہ نے ایک جوان لڑکی کو پیار سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ''جب اس کی ماں بیوہ ہوئی تھی تو مرنے والے کے بھائی نہ اُسے گھر میں جگہ دینے کے روادار تھے نہ اُسے اور اُس کے بچوں کو پالنے کے۔ وہ ذات کے باہر کی تھی۔۔۔ آگے بتا۔

''سوائے بیٹے کے جسے اس کے دادا نے زبردستی رکھ لیا کہ ہمارا خون ہے کہاں بھٹکنے دیں۔ دو چھوٹی بہنیں چھٹپن میں مر گئیں۔ پھر ماں نے میرے باپ سے شادی کر لی، چھپ کے، جو ریلوے لائن بچھانے والوں میں مزدور تھا، بہن جوا کیلی رہتی تو اُسے دوسرے مردوں سے پناہ کہاں ملتی۔

''میرا باپ تھا دوسری زبان بولنے والا لیکن محنتی اور نمازی۔ اُس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ دونوں میں بات چیت وہیں لائن پر کام کرتے ہوئے

ہوئی تھی۔ وہ لائن کے سلیپروں میں میخیں ٹھونکتا تھا، ماں دوسری عورتوں کی طرح پتھر بچھانے کی مزدوری کرتی تھی۔''

''دونوں ایک دوسرے سے دل جان سے محبت کرتے تھے۔ اُسے کتے کی سی وفاداری کہنا غلط ہوگا'' عجوزہ نے کہا ''اور وہاں سے یہاں چلے آئے۔''

''جب بارہ برس کی تھی اور میرا چھوٹا بھائی دس کا تو اماں کا پہلا بیٹا اُسے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا۔ ماں بہت خوش ہوئی اتنے دن بعد بیٹے کو دیکھ کر اور اُنہیں دعائیں دیتی رہی جنہوں نے پلا پلایا بیٹا اُسے دوبارہ دیا تھا۔ ابّا بھی خوش تھا، ہم دونوں بچے بھی۔

''ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ اماں نے مجھے روٹی بھی نہیں ڈالنے دی کہ میں اپنے بیٹے کے لیے خود روٹی ڈالوں گی۔ مجھے یاد ہے اس دن ماں نے کچنال کی کلیوں کی ترکاری بنائی تھی اور روٹیوں پر گھی بھی لگایا تھا۔ کھا پی کر اس نے کہا ''اماں مگر تو نے مجھے بہت پھرایا۔ دنیا بھر میں تجھے ڈھونڈتا پھرا ہوں۔''

''میں بھی تجھے ہر روز یاد کرتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے دعاؤں میں تیرا نام ضرور آتا تھا کہ اللہ تجھے ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ یہ کہہ کر وہ اُسے سینے سے لگانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے اس تک پہنچی۔ اس نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''میں یہاں ایک قرضہ چکانے آیا ہوں اور جب تک وہ قرضہ نہیں چکا لوں گا۔۔۔ اٹھائیس کا ہو گیا ہوں۔۔۔ کوئی اپنی بیٹی دینے کو تیار نہیں ہے کہ بے شرم کوّی کی اولاد ہے۔۔۔

ماں اس لفظ کو سُن کر چونکی جیسے پہلی بار سُنا ہو۔

''۔۔۔ جب تک اپنی ذات اپنے قبیلے کی عزت نہیں چکا دیتا ہے جائے رنڈیوں میں ہم سے کوئی مطلب نہیں۔''

عجوزہ نے بیچ میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے دھیرے کہا اُن میں سے کسی سے شادی نہیں کرتا لیکن جس بازار والی سے دل لگا بیٹھتا اس سے وفاداری چاہتا کہ دوسرا مرد اُسے نہ چھوئے۔ اور جو وہ ایسا نہ کر پاتی تو اس کے چہرے پر تیزاب پھینکتا اور پوچھنے پر کہتا عزت کا سوال تھا۔ کچھ دیر تک سب خاموش رہے۔۔۔ پھر عجوزہ نے کہا ''آگے بتا بیٹی''

ماں اُس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی جیسے خطرے کو اس نے بھانپ لیا تھا میں اٹھارہ سال کی عمر سے چپ چاپ یہی سنتا آیا تھا۔ دادا مر چکا تھا۔ چچا کہتے ہم کیا کریں۔ ان کے بیٹیاں تھیں مگر مجھے کوئی دینے کو تیار نہیں تھا۔ میرے پوچھنے پر کہ کیا کروں ایک دن سب سے بڑے چچا نے کہا ''جا کے اس کوّی کو ڈھونڈ اور مار اور اُسے بھی جس سے اس نے منہ کالا کیا ہے پھر میری جون سی پوتی، نواسی جی چاہے لے لے'' تب سے میں تیری کھوج میں تھا۔

ماں ہواس باختہ ہو کر اس کی پکڑ سے نکل جانے پر باہر دروازے کی طرف بھاگی اور باپ، میرا باپ اٹھ کر کونے میں کھڑے ہوئے بانس کو لینے کو دوڑا جس میں بکری کے لیے پتے جھاڑنے کی درانتی لگی تھی لیکن اتنی دیر میں اس جلاّد نے میں میری ماں، اپنی ماں کو گرایا، دوسرے میں باپ کو۔ میرے باپ کو۔ پہلے تو وہ پستول ہمیں اس کے جسم پر نظر نہیں آیا تھا نجانے کہاں سے آ گیا۔ میری اور بھائی کی باری آتی لیکن پڑوسی کے کوارٹروں والے آ گئے اور وہ ان پر فائر کرتا ہوا بھاگ گیا۔ اونچی آواز میں روتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا ''مل گئی ہو گی اُسے اپنی عورت''۔ عجوزہ نے کہا ''سن لیا؟ سنپولیے کو دودھ پلا کر بڑا کرنا اگر کارِ خیر ہے تو اس کو خود سے دور نہ رکھنا مورکھتا۔''

''سدا دور رکھنا؟ میں نے کہا'' کیا کبھی اُسے گھر کے اندر آنا نصیب نہیں ہوتا ہے؟ ایک بوڑھی عورت نے عجوزہ کے سر کی جنبش کے اشارے پر کہا ''ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد''

''وہ کیسے؟''

''دفن یا کریا کرم کے لیے اسے تیار جنگل میں کرتے ہیں۔ اس کے بعد اُسے گھر میں لایا جاتا ہے، عورتوں کے کندھوں پر، کہ اُسے پتہ پڑ جائے پہلے یہ میرے رہنے کی جگہ تھی جہاں سے نکالا گیا ہوں۔''

عجوزہ اور میں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

اندر بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اب عورتیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں جن کے صحنوں اور چھپروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جاتی ہوئی عورتوں کی زبانوں سے پتہ چلتا تھا اب خود کھانے بلکہ کھانے سے پہلے مردوں کو کھانا پہنچانے کا وقت آ گیا ہے۔ اتنا نتیجہ میرا تھکا ہوا دماغ بھی نکال سکتا تھا وہ کھانا لینے اور دہلیز کے باہر بیٹھ کر کھانے یہاں نہیں آئیں گے۔ بچیاں اور بوڑھی عورتیں اُسے کھیت کی سیما تک پہنچانے جائیں گی، وہاں سے وہ لے لیں گے۔

بوڑھے مرد اور لڑکے میں دیکھتا رہا تھا گھروں کے باہر کٹی ہوئی جلانے کی لکڑی اور کھیت کی اُپج اس وقت ڈال کر جا رہے تھے جب عجوزہ میرے سامنے مظلوموں کو ایک ایک کر کے پیش کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا ''کبھی عورت بیٹے سے اپنے باپ کو گولی مار دینے کے لیے نہیں کہتی ہے؟''

''وہ تو اس کا سہاگ ہوتا ہے۔ اُسے مروا کے تو اس کے کھڑے کھیت کا کھلیان ہو جائے گا۔ اس کی دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔''

''بیوی کو مروا کے آدمی کے سہاگ کا کھلیان نہیں ہو جاتا ہے؟''

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو تمہاری عمر کتنی ہے؟ پھر بولی ''مرد کا کوئی سہاگ نہیں ہوتا ہے۔ اس کی صرف شادی ہوتی ہے۔''

شام ہو رہی تھی اور میرا پیٹ قُل ھو اللّٰہ پڑھ رہا تھا۔ دور آسمان جہاں زمین سے ملتا تھا اس میں ابھی اتنی سرخی تھی کہ مجھے یقین ہوا کہ اگر اٹھ کھڑا ہوں اور چل پڑوں تو کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤں گا جہاں عورتیں مرد ساتھ رہتے ہوں اور عورتوں کو بن بات کی بات مارے جانے کا دھڑکا نہ رہتا ہو کہ ابھی رات

میں پورے جسم کو پیار کر رہا تھا، کل صبح ہو گی اور نجانے اس پر کیا بھوت سوار ہو جائے کہ اسی جسم کو بندوق کی گولی سے داغ دے۔

نہ وہ خوف بچے کو اپنا دودھ پلاتے وقت ماں کو ہوتا ہو آج میری بانہوں میں ہے کل ہو سکتا ہے ان ہی ہاتھوں سے جنہیں میں چوم رہی ہوں مجھے گولی کا نشانہ بنا دے اور دفنانے بھی نہ جائے۔

اور جوان ہوتی ہوئی بہن کا دھڑکا کہ آج جس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہے کل بھائی کی جگہ کچھ اور تو نہیں بن جائے گا!

میرے دماغ میں بے ترتیب خیالات اس طرح اڑتے پھر رہے تھے جس طرح چھن کر آنے والی دھوپ کی شعاعوں میں روئیں۔ دماغ بڑبڑایا جدھر جاؤ مادہ خود کو اپنے نر سے محفوظ نہیں سمجھتی ہے۔ جیسے بلّے سے بچے پیدا کرنے کے بعد بلّی۔

میں بچپن سے بچوں کی حفاظت میں جنگ کے بعد رات رات بھر بلّی کا رونا سنتا آیا تھا۔

بچوں کی وجہ سے؟ اس قبیلے میں دوسری وجہ سے۔ اور اُسے رونے کا موقع کہاں ملتا ہے۔ دوسری اُسے روتی ہیں۔

عجوزہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی مجھے گمان ہوا تھک گئی ہے، چلنا چاہیے۔ کپڑوں سے مٹی جھاڑتا ہوا میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہتھیلیوں کو بجا کر ہاتھ صاف کیے اور جیب میں سے چنے اور پرمل نکال کر کھانے والا تھا کہ خیال آیا اس بانس کی آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی بے عمر عورت کی بھی دعوت ہو جائے جس نے اتنے روتے ہوئے چہرے مجھے دکھائے۔ اُس نے مجھے آگے بڑھنے سے روکا۔ اٹھ کر دہلیز پر آ کر مُرمرے اور چنے لیے۔ میں نے بھی پھنکا مارا اور کہا:

''ایک آخری سوال؟''

اس نے کہا: ''پوچھنا چاہتے ہو اُن سے اِن سب نے نجات کیسے پائی؟''

''تب اُن کی بندوقیں، کلہاڑیاں کہاں تھیں جن سے جوان لڑکیاں کیا نانی، دادی تک پناہ مانگتی تھیں کہ زندگی اُس وقت تک ہے جب گھرانے کی عزت پر بٹّا لگانے کا الزام نہیں لگتا ہے'' میں نے کہا۔

''ہا'' وہ غبارے کی طرح پھٹی: ''میرا باپ جہالت اور ایسے رواجوں کا دشمن تھا۔ وقت نے سب کو اس کا دشمن بنا دیا۔ زندگی کے باقی دن دریا پار جنگلوں میں چھپ کر گزار رہا تھا لیکن وہاں بھی اس کی جان کو خطرہ رہتا تھا۔ اور ایک پل کو سو نہ سکتا اگر میری ماں بندوق ہاتھ میں لیے ساری رات اس کے ڈیرے کا پہرہ نہ دیا کرتی۔ وہ پہاڑن تھی۔ اور سب مرد پیتے بھی ہیں، ہر طرح کی شراب۔ کھجور، جوجوار، گنّے کی اور اگر ملے تو آدمی کے خون کی۔ جب زیادہ تھکے ہوں تو زیادہ پیتے ہیں۔۔۔ بندوقیں، کلہاڑیاں، تلوار دیواروں پہ ٹانگ کر۔''

اُس رات اُن عورتوں نے جن کی یہ اولادیں ہیں جی میں ٹھان کر کہ بہت دن خوف میں جی لیے اور زیادہ کی برداشت نے انہیں ڈنک نکلا ہوا بچھو بنا دیا۔

اور جب وہ نشے میں ڈوبے سوتے سے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے تو اُن سے کہا: ''آج سے تم کوّے ہو۔ عورت کوّی ووّی نہیں ہوتی۔ تمہاری دنیا وہ ہے ہماری یہ۔'' کہنے والی نے پہلے جنگل کی طرف اشارے سے کہا، پھر گھروں کی طرف۔ اور تم شاید جانتے ہو گے ایک بار پالی ہارا ہوا بٹیر دوبارہ ہرانے والے کا سامنا نہیں کرتا ہے۔

میرا سر شرم سے جھک گیا۔ خود کو ہنسانے کے لیے میں نے دل میں کہا: خوش قسمت ہو یہاں پیدا نہیں ہوئے ورنہ آج رات کیا ساری راتیں مچھروں پسّوؤں میں گزارنی پڑتیں۔

عجوزہ کہہ رہی تھی: مرد نے اپنی ماں کی محنت، قربانی، پیٹ میں رکھنے، درد سہہ کر جننے، دودھ پلانے، گُو موت سے دن رات نمٹنے کا نہ کبھی اعتراف کیا، نہ اس کا صلہ دیا۔ کوئی Crisis کٹھن لمحہ ہو اس کی فکر ہی نہیں بدل جاتی ہے۔۔۔ دماغ جیسے جذبات کھو بیٹھتا ہے۔ چھن بھر میں جیسے ایکا ایکی کسی کا سارا خون بہہ جائے۔ اس لمحے میں نہ ماں ماں رہتی ہے، نہ بیٹی بیٹی، نہ بہن بہن۔ اور چند دن بعد پھر وہ وہی کا وہی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ باپ اگر ایک بیوی کو کوّی بنا کر مار ڈالے اور دوسری اس کی جگہ لے آئے تو بیٹا اُسے بھی اماں کہنے لگتا ہے۔ اور خود مارنے والا سب کا پیارا بن جاتا ہے۔

''جس نے ایک بیوی کا خون کیا ہے اُسے ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو اپنی بیٹی دینے کو تیار ہوں'' میں نے کہا۔

عجوزہ نے ہاں میں سر ہلایا۔ میرے سوال نما تعجب نے اس میں وہی نفرت بیدار کی جو مجھ میں بھڑک اٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے ازراہ تفنن کہا: ''اور پھر سے جب اس کا مستک پھرتا ہے تو اُسے ہر عورت بدچلن لگتی ہے جس کا علاج اس کے پاس ایک ہوتا ہے: ''شوٹ''۔

محبت کی یادگار

بھارت کے شہر آگرہ میں واقع محبت کی علامت تاج محل کا سفید سنگِ مرمر فضائی آلودگی کے سبب دھندلا رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل فرانسیسی ماہرین یہ تجویز کر رہے ہیں کہ اگر نو سال تک ملتانی مٹی کا لیپ کیا جائے تو محبت کی یہ یادگار، اس کے چار میناروں اور مرکزی گنبد کے سفید پتھر کو پیلے دھبّوں سے نجات مل سکتی ہے۔ یاد رہے کہ بھارتی حکومت نے تاج محل کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے اُس کے اردگرد ہر طرح کی چھوٹی بڑی صنعت قائم کرنے یا پہلے سے قائم صنعت کو وہاں سے منتقل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

''فرار''

محمد سعید شیخ
(لاہور)

وہ کسی جانور کی طرح غرّاتا ہے۔ جب کبھی میں اس کی آواز سنتا ہوں تڑپ جاتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ جانور نہیں ہے انسان ہے۔ اللہ نے اُسے انسان کے روپ میں پیدا کیا تھا۔ اُحسن تقویم وہ بھی تھا لیکن یہ کیا ہوا کہ جانور کی طرح غُرّانا سیکھ گیا۔ اُسے یہی زبان آتی ہے۔ بڑا عجیب معاملہ ہے مجھے سمجھ نہیں آتی۔

مجھ سے زیادہ اس کا باپ اس کی اس پیدائش پر حیران ہے جس کے نطفہ سے اس نے زندگی پائی ہے۔

''مجھے نہیں پتا کہ یہ عیب میرے جینز میں تھا یا پھر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ لیکن فرض کر لیں اگر یہ میرے گناہوں کی سزا ہے تو اُسے جو نامکمل اور عیب دار زندگی ملی ہے وہ اس کے کس جرم کی سزا ہے؟ یہ تو ناانصافی ہوئی ناں۔۔۔!''

جب میری اس کے باپ چوہدری مشتاق سے کچھ بے تکلفی ہوئی تب اس نے ایک دن مجھ سے یہ بات کی تھی وگرنہ تو وہ اکثر اپنے گھر کے سامنے کھڑا ملتا۔ آتے جاتے اس سے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ سفید دھوتی اور سفید لمبا کھلے بازوؤں والا کُرتا اس کا مخصوص لباس تھا۔ چلتے ہوئے وہ اپنے دونوں بازو اپنے پہلوؤں سے ملا کر نہیں چلتا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے وہ ایک بینک میں ملازم تھا اور اکثر اس کی یونین کے کرتے دھرتوں میں گِنا جاتا تھا۔ اس کے وفاداروں کا اپنا ایک گروپ تھا جیسے وہ سب اپنا لیڈر اور بڑا مانتے تھے۔ ہینڈ شیک میں اُسے جو رقم ملی تھی اس سے اس نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی اور بڑے بیٹے کو کینیڈا بھجوانے کا بندوبست کیا تھا۔ اب بھی وہ اپنے طور طریقوں میں چوہدریوں کی شان ظاہر کرتا تھا۔ وہ کم ہی کسی پر ظاہر کرتا تھا کہ اس کا ایک بیٹا معذور بھی ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی سالوں سے وہ اپنے بیٹے کی معذوری کا دُکھ سہہ رہا تھا۔ شکایت اس کے دل میں آتی تھی مگر وہ کہہ نہیں پاتا تھا۔ جب تک کہ اس نے مجھے اپنا ہمدرد نہیں سمجھ لیا اور اپنی چوہدراہٹ کے خول سے باہر مجھ سے بے تکلف نہیں ہو گیا لیکن اب بھی شاید اپنی ساری باتیں مجھ سے کہہ نہیں پایا تھا کہ اس کی ہمت اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ اسے کسی غمگسار کی ضرورت تھی۔

اس روز جب شام کو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ مجھے پارک میں جاگنگ ٹریک کے کنارے پتھر کے بنچ پر بیٹھا مل گیا۔

میں اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ ''کیوں چوہدری صاحب! آج اکیلے ہی سیر کرنے آ گئے۔''

''کبھی کبھی موقع مل جاتا ہے جب سلمان سویا ہوتا ہے اور مجھے پتا ہوتا ہے وہ دو گھنٹے سے پہلے اُٹھے گا نہیں تو گھر سے نکل آتا ہوں۔ سوچا آج سیر کر کے دیکھتا ہوں۔ آخر اس دنیا پر میرا بھی تو کوئی حق ہے!'' چوہدری صاحب اچھے موڈ میں تھے یا پھر سرمئی بادلوں کے بہت نیچے جھک آنے کا اثر تھا۔

''کیسا ہے سلمان؟ اس کا کوئی علاج وغیرہ بھی کرا رہے ہیں یا نہیں؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اسے کوئی بیماری نہیں ہے جس کا علاج ممکن ہو۔ وہ پیدائشی ایسا ہے۔ ایسا ہی رہے گا جب تک وہ مر نہیں جاتا۔''

چوہدری کا لہجہ درد بھرا تھا۔ میرے سامنے، میرے ساتھ وہ چوہدری مشتاق نہیں تھا جو باہیں پھیلا کر گلی میں چلتا تھا، ایک بے نصیب بیٹے کا باپ تھا۔

''اس کی ماں خود کو الزام دیتی ہے۔ مجھ سے معافیاں مانگتی رہتی ہے حالانکہ میں اسے کوئی الزام نہیں دیتا۔ اس نے تو بڑے شوق سے اس بچے کو جنم دیا تھا۔ سال بھر کا ہوا تھا جب ہمیں احساس ہوا کہ اس کی خلقت میں کوئی نقص تھا جس تک ہماری نگاہ نہیں پہنچی تھی۔'' وہ بتائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہو۔

کبھی کبھی میں اتنا تھکا ماندہ محسوس کرتا ہوں کہ ساری ساری رات سو نہیں پاتا۔ سوچتا ہوں میرے اس بیٹے کی اس وقت کیا حالت ہو گی جس کی جسمانی قوتوں کو اس کی دماغی معذوری نے جکڑ رکھا ہے۔ اس کا جسم جو سُوکھی لکڑیوں کا گٹھا بن چکا ہے جو کسی بھی چنگاری سے بھڑک سکتا ہے۔ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے میں اسے تسلّی دے سکوں۔ میں صرف ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ سکا۔ کوئی بھی لفظ اس موقع کی مطابقت کے لیے کافی نہیں تھا۔ یہ ایک دُکھی دل کی آواز تھی۔

مجھے یاد آیا کہ جب میری بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور مجھ تک یہ خبر پہنچی تھی کہ میں ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہوں تو میں نے خبر دینے والی نرس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھماتے ہوئے، لرزتے لہجے میں پوچھا تھا کیا میری بیٹی صحیح سلامت ہے۔ اس کے تمام اعضا مکمل ہیں۔ کہیں کوئی کمی تو نہیں۔ ''ماشاء اللہ۔ بالکل صحت منداور بہت خوبصورت ہے۔ دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔''

کسی معذور بچے کا باپ ہونا کس قدر کربناک ہو سکتا ہے۔ یہ میں چوہدری مشتاق کی باتوں سے اندازہ کر سکتا ہوں۔ وہ اپنے بیٹے کی بات کرتے ہوئے اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے پڑوسی کے سامنے وہ کمزور نہیں دکھنا چاہتا تھا۔ اور میں اسے حوصلہ دینے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔

اگلی ملاقات تک کچھ دن گزر گئے۔ یہ نہیں تھا کہ اس دوران وہ مجھے

نظر نہیں آیا تھا۔ گلی میں چلتا ہوا، وہ یوں دکھائی دے جاتا تھا جیسے خواب میں چل رہا تھا۔ اسے اکثر جلدی گھر لوٹنے کی ضرورت ہوتی تھی کہ کہیں اس کا معذور بیٹا پریشان نہ ہو جائے اور غرّانہ شروع کر دے۔ وہ اپنے اس معذور بچے کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

ایک آدھ دفعہ میں نے اس کے بیٹے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے اداس لہجے میں کہا۔

نہیں شیخ صاحب۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے زخموں کو دیکھے۔ ویسے بھی دنیا اس کے لیے اجنبی ہے اور کسی بھی اجنبی کو دیکھ کر وہ بدک جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل جانور بن جاتا ہے۔ پتا نہیں اس نے کیسے اپنے جسم کو قابو میں کر کے رکھا ہوا ہے۔ وہ چوبیس سال کا بڑا تنومند انسان بن چکا ہے۔ بظاہر انسان۔

اب اکثر میری اُس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ گلی میں جب علیک سلیک ہوتی تھی تو وہ ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو تب ہوتی تھی جب وہ مجھ سے بلا تذبذب مل سکتا تھا۔

اسی طرح ایک اور ملاقات شام کے وقت اس سے پارک میں ہوئی جب وہ اکیلا اُدھر سیر کے لیے آیا۔

کیسا ہے آپ کا بیٹا؟

میرا اس سے بات کرنے کا یہی موضوع تھا۔ میں بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس صورت حال سے جس میں کہ وہ تھا، کیسے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ ''مجھے پتا ہے کہ یہ ایک آزمائش ہے۔ یہ ختم ہوگی جب وہ مر جائے یا پھر۔۔۔ میں مر جاؤں۔ اس کا مرنا تو شاید اس کے اور اللہ کا معاملہ ہے۔ جہاں تک میرے مرنے کا تعلق ہے تو کبھی کبھی مجھے لگتا ہے یہ میرے بس میں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ''اللہ دیکھتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور جو ہمارے دلوں میں ہے۔ اُسے پتا ہوگا کہ میں کیا سوچتا ہوں یا سوچ سکتا ہوں۔ کیا وہ مجھے روک لے گا؟ یا مجھے اپنی جان لینے دے گا۔''

''لگتا ہے چوہدری صاحب آج کل آپ بہت پریشان ہیں۔'' میں اس کی باتوں سے ڈر سا گیا۔

''آخر تو مجھے اس صورتِ حال کی سنگینی سے نجات پانا ہے۔ کوئی راہ تو ڈھونڈنی ہے۔'' وہ جیسے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر بولا۔ پھر وہ اچانک اُٹھ کر بھاری قدموں سے چلتا ہوا پارک سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا۔ ''اس کے جاگنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

اگلے کئی روز وہ مجھ سے ملنے سے کتراتا رہا چھپتا رہا۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً گھر کے اندر داخل ہو جاتا وگرنہ وہ اکثر اپنے گھر کے باہر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ پوچھنا چاہتا ہو کیا تم جانتے ہو میں کن حالات سے گزر رہا ہوں؟ کیا ان حالات کو بدلنے میں تم میری کوئی مدد کر سکتے ہو؟

اس نے پارک آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ میرا سامنا کرنے سے گھبرانے لگ گیا تھا۔ نہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ بیمار تھا۔ اسے دمہ کے مرض نے بے حال کر رکھا تھا یہاں تک کہ اُسے ہسپتال داخل کرانا پڑا جہاں اس کا بھتیجا اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

میں بھی اسے دیکھنے گیا۔ چوہدری صاحب مجھے دیکھ کر مسکرائے۔

''آپ یہاں بھی آ گئے؟''

نہیں۔ سوچا کہ آپ کی مزاج پُرسی کر آؤں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں نے رسمی سا فقرہ بولا۔

''آپ کی مہربانی ہے۔''

''کیا تکلیف ہو گئی ہے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

بس میرے پھیپھڑے کالے سیاہ ہو چکے ہیں۔ شاید میرے سگریٹ پینے کا اثر ہے۔ ہو سکتا ہے دل بھی کالا ہو گیا ہو، اندر بدبو پھیل گئی ہو۔ آخر سوچیں۔ بُری سوچیں بھی دلوں میں سیاہیاں پھیلا دیتی ہیں۔

''آپ کا بیٹا آجکل راتوں کو بہت غُرّاتا ہے۔'' میں نے جیسے شکایت کر دی۔

''ہاں وہ میرے وہاں نہ ہونے پر پریشان ہو جاتا ہے۔ میں کوشش کروں گا جلدی گھر لوٹ آؤں۔ اُسے میں ہی سنبھال سکتا ہوں۔ عجیب بات ہے میری پریشانی ختم ہی نہیں ہو پاتی۔ آخر میں کیا کروں؟'' مجھے اس سے اچانک اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

''بس صبر۔ حوصلہ چوہدری صاحب۔'' میں نے کہا۔ میرے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں تھا۔

''کیسے؟'' وہ مضطرب ہو کر کھانسنے لگا اور اپنے سرہانے رکھے ڈبے میں سے ٹشو پیپر لے کر منہ پر رکھ لیا اور جب اس نے اسے الگ کیا تو اس پر سیاہ سیال چمٹا ہوا تھا۔

پھر انہوں نے سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''کل میرا داماد میری بیٹی کو ناراض کر کے ہمارے گھر چھوڑ گیا۔ وہ اب اس کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ وہ اپنی جوان ہوتی بچی کے ساتھ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اُسے ڈر ہے کہ وہ اُسے بیچ دے گا۔''

''یہ بہت زیادتی ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

زیادتی تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ ظلم ہے۔ یا اس سے بھی بڑھ کر کچھ۔۔۔ اور آپ کہتے ہیں میں صبر کروں۔ واپس آ کر نپٹ لوں گا اس بدقماش سے۔ اس نے سمجھ کیا رکھا ہے میری بیٹی کو لاوارث تو نہیں چوہدری مشتاق کی بیٹی ہے۔ بہت ہو گئی میرے ساتھ، ایسا آخر کب تک چلے گا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے سر تکیے میں چھپا لیا تھا۔ میں وہاں سے اُٹھ کے آ گیا۔ کمرے میں دوائیوں کی اور چوہدری کے اندر کی بُو پھیلی ہوئی تھی، مجھ سے اور بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

ہسپتال چھوڑنے سے پہلے میں چوہدری مشتاق سے یہ بات کہنا چاہتا تھا جب وہ جھنجھلا کر کہہ رہا تھا۔ ''بہت ہوگئی''

''یہ سب اللہ کی حکمت ہے۔''

''کیا حکمت ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آتی۔'' مجھے پتا تھا وہ یہی کہتا اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا، کسی وقت بھی چھلک سکتا تھا۔ مایوسی اُسے ڈبو رہی تھی اور میں اسے سمجھا نہیں سکتا تھا کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے وہ مسبّب الاسباب اس کی مصیبتوں کا کوئی نہ کوئی حل نکال آئے گا۔

اس نے جو کہا تھا ''بہت ہوگئی'' تو اس سے اس کی ذہنی حالت کی عکّاسی ہوتی تھی۔

چند دنوں بعد وہ ہسپتال سے بظاہر صحت یاب ہو کر گھر آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے جا کر اپنے معذور بیٹے کو گلے لگایا، اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بار بار اس کا ماتھا چوما۔ بیٹے کا غصہ کم پڑ گیا اور ساتھ ہی غرّاہٹ میں واضح کمی آ گئی۔ میری پریشانی بھی اس حد تک کم ہوگئی۔ لیکن چوہدری مشتاق اب بھی متوازن چال ڈھال سے دُور تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا تھا۔ کوئی اسے سلام کہہ جاتا تو جواب اور کبھی کبھی صرف سر ہلا دیتا۔ جب وہ گلی میں اپنے گھر کے باہر کھڑا کچھ سوچتا دکھائی دیتا تو گلی کے بچے اُدھر کرکٹ کھیلنے سے پرہیز کرتے تھے۔ وہ اجنبی بنتا جا رہا تھا۔ اتنی بھری پُری دنیا میں وہ شاید اکیلا رہ گیا معلوم ہوتا تھا۔

''اگر وہ یہ سوچنے لگے کہ اب اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تو وہ کیا کرے گا۔ یہ سوچ اُسے کہاں لے جائے گی۔''

اس پر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک اتوار کو میں نے چوہدری مشتاق کو اپنے گھر پر چائے کے لیے مدعو کیا۔ میں نے دیکھا اُن کی صحت اچھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک طرح کی اُداسی جھلکتی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں چوہدری صاحب؟'' میں نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے پوچھا۔

''ہاں۔ مگر آج کل نیند نہیں آتی۔ رات رات بھر جاگتا ہوں۔ زندگی عذاب بنتی جا رہی ہے۔'' اس نے آزردگی سے کہا۔ یہ ایک شکست خوردہ اور ہارے ہوئے آدمی کی آواز تھی۔

''ایک مدت تک مجھے یہ خیال خوش کرتا رہا کہ سلمان ایک روز اچانک ہی بولنا شروع کر دے گا لیکن آخر کار میں نے یہ اُمید یہ سوچ کر چھوڑ دی کہ اب یہ معجزوں کا زمانہ نہیں رہا۔ انتظار کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔''

یہ بات اس نے میرے کسی سوال کے جواب میں نہیں کی تھی۔ میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا جیسے مجھے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

''مجھے اب اپنی مایوسی سے ڈر لگنے لگا ہے۔ یہ میری طاقت سے زیادہ ہے اور مسجد کے مولوی صاحب نے پچھلے جمعہ کے روز کہا تھا اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔'' مگر اس بوجھ نے تو میری کمر توڑ رکھی ہے۔ نہ جانے کس جرم کی یہ سزا ہے۔

مجھے چوہدری مشتاق پر بڑا ترس آیا۔ جب میں نے اُسے رخصت کیا تو باہر گیٹ تک گیا۔ مجھے اس کے کندھے جھکے دکھائی دے رہے تھے۔

یہ کچھ بھی کر سکتا ہے، اتنا مایوس اور ہارا ہوا شخص۔

یہ دنیا سے کیسے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔

اس اتوار کے بعد جو اگلا اتوار آیا اس روز چوہدری مشتاق نے بڑی بیدردانہ طریقہ سے خودکشی کر لی۔ اس کے کمرے میں دونالی بندوق رکھی تھی جو اس نے اپنے اچھے وقت میں بڑے شوق سے خریدی تھی۔

اس نے اس کا بٹ اپنے پاؤں میں پھنسایا، سیدھے لیٹ کر نالی کا آخری سرا منہ میں دبایا اور پاؤں کے انگوٹھے سے اس کی لبلبی دبا دی۔ دبا دبا سا ایک دھماکہ ہوا اور اس کے سر کا اوپر والا حصہ پھٹ کر یوں بکھر گیا کہ دیواروں پر لوتھڑے چمٹ گئے۔

اس واقعہ سے پہلے وہ گھر والوں سے کاغذ قلم مانگتا رہا۔ کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ وہ کیا لکھنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے سرہانے تحریر چھوڑی۔ میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں۔ کسی کو اس کا ذمہ دار نہ سمجھا جائے۔

اور اس کا معذور بیٹا سہم گیا اور اس کے ہونٹوں کو ایسی چُپ لگی کہ اس نے غرّانا، چیخنا چھوڑ دیا۔

اردو شاعری میں

غالب عرفانؔ کے مقام و مرتبہ پر

مشہور نقاد، مصنف اور مورخ

جناب سید مسعود اعجاز بخاری

کی بیس سالہ تحقیقی کاوش کا نتیجہ

غالب عرفانؔ اور تخلیقی وجدان

تقریباً دو سو دبیز صفحات پر محیط کتاب

جو گیارہ ابواب پر منقسم اور رنگین مجلد سرورق سے مزین ہے۔

منظرِ عام پر آچکی ہے

رابطہ: ٹیلیفون۔021-36967952

موبائل: 0333-3137181

قیمت:-/400 روپے

''جلتی ہریائی''

شمع خالد
(راولپنڈی)

مجھے اس اونچے پہاڑی نما ٹیلے پہ آتے جانے کتنے دن کتنی صدیاں گزر گئی تھیں۔ایک عجب تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔دور اسلام آباد ایک خوبصورت تصویر کی امیجری پیش کر رہا تھا۔چھوٹے سے میدان کے گرد چھوٹے چھوٹے بغیر چھت کے حجرے دکھائی دے رہے تھے۔جن میں صرف بیٹھنے کی جگہ تھی۔سامنے ایک جگہ چکی پڑی تھی اور پانی کے لیے ایک ایسی نالی سی بنی تھی جو نیچے سے پانی اوپر لایا کرتی تھی۔میں حیرت سے گنگ بت بنی یہ ہی سوچے جا رہی تھی اتنی بلندی پر جو صرف سیدھی راہ جیسی ہے جس میں رکنے یا سانس لینے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔وہ لوگ کیسے اپنا اپنا راشن اُٹھائے اس پہاڑی پر چڑھتے ہونگے۔

سامنے سورج کی ڈوبتی شعاعیں ایک عجب منظر پیش کر رہی تھیں۔ہمارے گائیڈ نے اپنی آواز کو بھاری اور پُر اثر بناتے ہوئے کہا یہاں بدھ بھکشو اپنے دھیان اور گیان کے لیے آیا کرتے تھے۔اور روحانی تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔دنیا کی پہلی یونیورسٹی کا اعزاز اسے ہی ملا ہے۔جسے اشوکا کے بیٹے کنال نے بنوایا تھا۔میں فوراً بولی۔وہ ہی کنال جس کی سوتیلی ماں نے اُسے اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا اور ناکام ہو کر سازش کر کے اُسے یہاں بھجوا دیا تا کہ بادشاہت سے دور رہ سکے۔یہ ہی نہیں اُسے سزا دلوا کے اُس کی آنکھوں میں سلایاں پھروا کر اُسے اندھا کروا دیا۔

گائیڈ نے مجھے حیرت سے دیکھا۔اوہ تو آپ بدھ مت کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔ہاں مجھے بچپن سے ہی تاریخ کے بارے میں جاننے کا شوق ہے۔میں نے غالباً پانچویں جماعت میں گوتم کے احوال پڑھے تھے۔''دنیا دکھوں کا گھر ہے'' اپنی خواہشات کو محدود کر لو۔وغیرہ وغیرہ۔بہت پہلے میں ایک افسانہ بھی لکھ چکی ہوں۔اُس نے کہا پھر تو آپ نے گوتم بدھ کا وہ بت بھی دیکھا ہوگا۔یہ کہہ کر وہ آگے آگے چلنے لگا۔کچھ حجروں کے بعد بدھا کے کچھ ٹوٹے بت جن میں ایک کا سر نہیں ایک کا پاؤں نہیں پڑے تھے۔اور سامنے ایک بہت بڑا مجسمہ کھڑا تھا جیسے گوتم بدھ سچ مچ کھڑا ہو۔جہاں یہ فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا وہیں میں سوچنے لگی۔اسے یہاں کیسے لایا گیا ہوگا۔کنال نے یہ بدھ کا مجسمہ بنوایا تھا اور سننے میں آیا ہے کہ اس کے طفیل کنال کی آنکھیں بھی ٹھیک ہو گئی تھیں۔

اس بت کے بارے میں بدھ بھکشو کا عقیدہ ہے کہ اس کی ناف میں انگلی رکھ کر جو بھی خواہش کرو پوری ہو جاتی ہے۔میں نے بغیر سوچے اپنی انگلی گوتم کی ناف میں رکھ دی۔مجھے پیچھے سے کسی نے کہا۔ارے کہیں ایسا نہ ہو کوئی سانپ یا کیڑا اندر چھپا بیٹھا ہو کاٹ لے۔میں مسکرا دی نہیں ایسا نہیں ہوگا۔میں پہلی بار جب آئی تھی تو یہ ہی حرکت کی تھی۔آپ مسلمان ہو کر یار۔۔۔میں نے کبھی غیر خدا سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔بس یہاں مجھے سکون ملتا ہے۔میں نے آنکھیں بند کیں تو میرے کانوں میں جلتے سبز درختوں کے چٹخنے کی آوازیں آنے لگیں۔شور بڑھتا جا رہا تھا۔

مجھے یاد آیا دانی صاحب نے کہا تھا کہ اسلام آباد میں ایک درخت ہے جسے گوتم سے منسوب کا بدھی درخت کہا جاتا ہے۔جہاں ہر سال بہت سارے بدھ مت کے ماننے والے جمع ہوتے ہیں۔عبادت کرتے ہیں۔پھر سنا کہ اکثر غیر ملکی لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔اُنہوں نے بیٹھنے کے لیے بنچ بنوا رکھے تھے۔

پھر وہاں اسلام کے چاہنے والوں نے مدرسہ بنا لیا۔۔۔اور درخت کو آگ لگا دی۔تب میں نے سوچا بے شک یہاں درسگاہ بنا لیتے لیکن ایک ہرے بھرے جیتے جاگتے درخت کو جلا دیا۔میری امّی کبھی ہریائی ٹہنی کو بھی جلانے نہیں دیتی تھیں۔وہ کہا کرتی تھیں کہ تم جانتی نہیں یہ درخت تمہاری طرح جاندار ہیں۔اگر میں تمہاری انگلی کو ماچس لگاؤں تو کتنا درد ہوگا۔تمہیں پتہ ہے ناں۔۔۔اور میں ڈرتے ڈرتے کہتی، تو یہ ہم آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرتے ہیں۔تو وہ بولیں وہ قدرت خدا کی ہے یہ درخت سرسبز ہوتے ہیں ہمیں خوراک، آکسیجن سکون دیتے ہیں۔اور جب خشک ہو جائیں تو ہمارے پکانے کا ایندھن بن جاتے ہیں۔بس آئندہ سبز درخت یا پودے کو کبھی مت جلانا۔

تو پھر بدھی درخت کو آگ لگانے والوں نے یہ کیوں نہیں سوچا۔

میں نے دوبارہ گوتم بدھ کی ناف میں اپنی انگلی رکھی۔درختوں کے جلنے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف پانی کے اچھلنے کی آواز مجھے پریشان کر رہی تھی۔درختوں کے ساتھ ساتھ انسانی چیخوں، بچوں کی آوازوں نے بھی مجھے ہلا دیا۔

یہ تو سنا تھا کہ ٹیکسلا تک آنے کے لیے ذرائع آمد و رفت نہریں ہوا کرتی تھیں مگر اب تو چاروں طرف ہریالی ہے۔ایک چھوٹے سے خشک نالے سے گزر کر ہم یہاں آتے تھے۔یہ کشتی یہ بچے یہ انسانی آوازیں۔۔۔

بدھا نے جیسے میری انگلی کو کان بنا دیا اور سرگوشی میں کہنے لگا۔تاریخ کے اوراق میں زندگی تلاش کرنے والی خاتون۔۔۔تم ان آوازوں کو نہیں پہچان رہی۔یہ آوازیں تو میرے ایک ایک سٹوپا Stupia ایک ایک بت کے ذرے ذرے سے چمٹ رہی ہیں۔

یہ آوازیں اُن سمندر میں بھٹکنے والے انسانوں کی ہیں جو ایک ایک ملک کے قریب جا کر امن کی بھیک امان کی بھیک مانگنے والے برمی مسلمان ہیں۔صرف چند گز زمین چند روٹی کے نوالے۔کیا زمین اتنی تنگ ہو گئی ہے کہ کہیں کسی ملک میں انہیں پناہ نہیں مل رہی۔میرے ملک میں اُنہیں اُس وقت خوش آمدید کہا تھا اور انہیں ہونگیا (نیک لوگ) کا خطاب دے کر پناہ دی گئی تھی۔پھر وہ کیا ہوا چلی۔وہ موسم کیسے بدلے، ہونگیا (نیک لوگ) جانے کب معتوب ہوئے اور وہ بدھ بھکشو جو بچھو کو بھی نہیں مارتے تھے کہ جاندار ہے۔آج اتنے سفاک کیسے ہو گئے کہ اُنہوں

نے اتنے لوگوں کو اذیت دے دے کر مارا۔ ہر انسان ہر بے گناہ کا خون میرے ذرے ذرے میں درد اور زہر بھر گیا ہے۔ میں تو اپنی سیدھی سادی زندگی اور سیدھے سارے اصول دے کر آیا تھا۔ بدھ بھکشو ہمیشہ آبادیوں سے دور پہاڑوں پر اللہ کو تلاش کرتے تھے چاہے یہ جولیاں ہو یا کوہ کیلاش یا جاپان کا kokaj یا kaki پہاڑ یہ سب بدھ مت کی تعلیم گاہیں یا اونچائی اتنی کہ آسمان سے باتیں کرتے kaki 800m کی اونچائی پر بدھ بھکشو کا ہیڈ کوارٹر۔۔۔ جسے دور سے دیکھیں آٹھ پہاڑوں کی چوٹیاں دور سے کنول کے پھول کی طرح نظر آتی ہیں۔ وہاں دھیان گیان کے لیے جمع ہونا۔ کیلاش جس کی گود دریائے سندھ، دریائے ستلج، بھرم پُتر اور کرنائی دریا کی ماں کیلاش ہی تو ہے۔ دنیا کی قدیم اونچی ترین عظیم جگہ۔۔۔ جسے تبت کے لوگ برف کے قیمتی زیور کا نام دیتے ہیں۔ کوئی اسے پانی کا پھول (عجیب بات ہے) دریاؤں کو جنم دینے والا پہاڑ پانی کا پھول اور تبت کے بدھ اسے برف کی عظیم اور بلند ترین جگہ کہتے ہیں۔ اور اسی پہاڑ پر دھیان گیان کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ عجیب بات کے یہ آسمان سے باتیں کرنے والا برفانی پہاڑ صرف بدھ ازم ہی نہیں جین ازم، ہندوازم اور (Bon) مذاہب سب ہی اس پہاڑ سے جڑے ہیں۔ ہندو اسے یشو ''اوم'' کے نام سے مقدس سمجھتے ہیں۔

میں گوتم بدھ کے سامنے جانے کب سے کھڑی تھی میری انگلی ابھی بھی بدھ کی ناف پر تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک آنسو بت کی آنکھوں سے نکل کر میرے ہاتھ پر آ گرا۔ میں گھبرا گئی۔ جلدی سے اپنے حواس یکجا کیے میرے ہاتھ بالکل صاف تھے۔ گوتم بدھ کا بت ویسے ہی شان سے ایک ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔

میرے ساتھی مجھے چھیڑ رہے تھے اور اسی ہنسی مذاق میں واپس چل پڑے۔ واپسی کا راستہ مجھے ہمیشہ ہی بے حد ڈراؤنا لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اگر میں گر گئی تو پھسل کر نیچے نہیں جاؤں گی بلکہ اچھلتی اردگرد کی پہاڑیوں سے ٹکراتے ہوئے گر جاؤں گی۔

نالے کو عبور کر کے ہم چھپر ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ مجھے بچپن میں پڑھی کہانی یاد آ گئی۔

سدھارتھ کے والد اولاد کے لیے بے حد پریشان تھے۔ سالوں انتظار کے بعد جب گوتم پیدا ہوئے تو محل میں جشن کا سماں تھا۔ خوب خوشیاں جشن منانے کے بعد گوتم کے والد جو اپنے وقت کے طاقتور بادشاہ تھے۔ انہوں نے بہت سارے نجومیوں کو بلوایا تا کہ شہزادے کے مستقبل کو جان سکیں۔ گوتم بادشاہ کی گود میں کھیل رہا تھا اور نجومی خاموش ساکت بیٹھے تھے۔ بادشاہ نے جب زور دے کر پوچھا کہ آپ لوگ کچھ بول نہیں رہے۔ ایک نجومی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ لڑکا کبھی بادشاہ نہیں بن سکے گا۔ بادشاہ کے لیے جواب خلاف توقع تھا پہلے تو اسے اس بات پر غصہ آیا کہ میرے سامنے ایسے الفاظ بولنے کی ان لوگوں میں ہمت کیوں کر ہوئی۔ شاہی تربیت اور جاہ وجلال نے بادشاہ کو جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ترغیب دی اور بادشاہ بولا۔ بادشاہ کا اکلوتا وارث بادشاہ نہیں بنے گا تو اور کون؟

ایک بے حد مقبر جوتشی بولا۔ حضور آپ کا بیٹا وہ مقام حاصل کرے گا جو کسی بادشاہ کے نصیب میں ہی نہیں۔ یہ لاکھوں دلوں پر راج کرے گا اور اس کا نام اسد ہوگا۔ نہیں مجھے اسے صرف اپنا وارث بادشاہ بنانا ہے۔ مجھے کوئی اپائے بتائیں۔ تو وہ ہی جوتشی بولا پھر اسے عام لوگوں سے دور رکھا جائے۔

بادشاہ نے سختی سے حکم دے دیا۔ میرے بیٹے کو عام لوگوں سے دور رکھا جائے۔ بس وہ اور اس کا اتالیق اور اُستاد یا بادشاہت کی تربیت دینے والے پاس جا سکتے ہیں۔ یوں سدھارتھ اپنے ہی محل میں قید تنہائی میں زندگی بسر کرنے لگا۔ جوں جوں وہ بچپن کی سرحد پار کرتا گیا اُس کے دل و دماغ میں باہر کی دنیا دیکھنے کا جنون بڑھتا گیا۔

جوانی نے باپ سے بات منوانے کا حوصلہ بھی دے دیا تھا۔ ایک شام سدھارتھ نے بادشاہ سے یوں اجازت طلب کی اور کہا پتا جی میں محل سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے آ گیا دیجیے بادشاہ نے انکار کر دیا۔ سدھارتھ نے کوئی حیلہ کیے بغیر خاموشی سے ایک دیوار سے ٹیک لگا لی اور تمام رات وہاں کھڑا رہا۔ بادشاہ شاہی ضد سے واقف تھا۔۔۔ اُس نے اپنے وزراء کو حکم دیا کہ شہزادہ جدھر سے بھی گزرے اُدھر جشن کا سماں ہونا چاہیے۔ سو جب شہزادہ اپنے اتالیق کے ساتھ باہر نکلا تو چاروں طرف رنگ و نور کی برسات تھی۔ لوگ ناچ رہے تھے پھول برسا رہے تھے لیکن شہزادے نے دور سے ایک غریب کے جنازے کو دیکھا۔ اتالیق نے بتایا یہ بیمار غریب کا جنازہ ہے۔ اُس کے ساتھ چلنے والوں کے کپڑے پھٹے ہوئے پاؤں ننگے تھے۔ شہزادے نے حیرت سے پوچھا یہ سب کیا ہے۔

واپسی پر شہزادے کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ اُس نے آتے ہی بادشاہ سے تین سوال پوچھے۔ دنیا میں سب لوگ برابری سطح پر کیوں نہیں۔ سب کو یکساں مواقع کیوں نہیں، کوئی محلوں میں اور کوئی جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ کیوں ہیں۔ میں سدھارتھ کے سوالوں میں اتنی محو تھی کہ پتہ ہی نہ چلا کب ہم نے چائے ختم کی کب ہم گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی کے سٹارٹ ہونے پر مجھے اپنے دوست کی آواز آئی۔ بھئی اس شامی بچے نے دنیا بھر کے ضمیر جگا دیے۔ دیکھو سب ملکوں نے کیسے ان کے لیے دروازے کھول دیئے۔ اور ایک امیر آدمی نے تو ان کے لیے نیا ملک بنانے کا اعلان کیا ہے۔ بس یار یہ ساری میڈیا کی گیم ہے۔ ایتھوپیا کے بچے کسی کو یاد نہیں آ رہے۔ ہونگیا کے مسلمانوں کے لیے کوئی کیوں نہیں بولا۔ میں نے تصور ہی تصور میں گوتم بدھ۔۔۔ سدھارتھ سے سوال کیا۔ تو جانے کہاں سے سانحہ قصور کے وہ بچے جو جوان ہو چکے تھے میری گاڑی کے آگے پیچھے بھاگنے لگے۔ اور جانے کہاں سے پشاور سکول کے خون میں رنگے یونیفارم آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔

ہماری گاڑی ٹیکسلا میوزیم کے سامنے دوبارہ جا رُکی۔ میری دوستوں نے چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ تم بھی جلدی سے آ جاؤ۔ ہم میوزیم کے اندر نہیں جا رہے بلکہ ہم نے اُس درخت کو دیکھنا ہے جس کے بارے میں ہمارے

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ کیجیے

''قیدی نمبر ۲۳۴''

ڈاکٹر رینو بہل

(چنڈی گڑھ، بھارت)

نیند سے اُس کا تعلق ٹوٹے ہوئے تقریباً پانچ برس ہو گئے ہیں۔ جب سے گھر چھوٹا نیند نے بھی منہ پھیر لیا۔ شام ہوتے ہی رات کی آمد کا خوف ستانے لگتا ہے۔ رات اپنے دامن میں ہر روز پُرانے زخم سمیٹ کر لے آتی ہے۔ وہ رات پھر ان زخموں کو کُریدتی ہے۔ کبھی ٹیس اُٹھتی ہے تو کبھی زخم رِسنے لگتے ہیں، کبھی آہیں نکلتی ہیں تو کبھی سسکیاں تھمنے کا نام نہیں لیتیں۔ رات کی خاموشی میں کبھی کسی کونے سے سسکنے کی آواز آتی ہے تو کبھی کہیں سے کسی کے پھپھک پھپھک کر رونے کی آوازیں دوسروں کے آرام میں خلل پیدا کرتی ہیں تو اُس وقت لچھی کی کڑک ڈانٹ اُسے دم سادھ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہر رات یہ ہی تماشا ہوتا ہے اور ہر صبح پھر نئے دن کو جھیلنے کے لیے سب تیار ہو جاتی ہیں۔

بُدھ کی صبح عام دنوں سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ عموماً پَو پھٹنے سے پہلے ہی بیرک میں ہلچل شروع ہو جاتی ہے مگر بدھ کے دن آدھی رات کو گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے۔ رات بھر بیرک میں مدھم روشنی جلتی رہتی ہے اور بیرک کے دونوں جانب بنا کنڈی بنا دروازے بنے چار چار پاخانے اور غسل خانے کی طرف آ رجا لگی رہتی ہے اور بدھ کی صبح دونوں جانب قطاریں لگ جاتی ہیں ''پہلے میں پہلے میں'' کے چکر میں اکثر عورتیں گالی گلوچ اور پھر گتھم گتھا بھی ہو جاتی ہیں۔ پچاس قیدیوں کے لیے بنی بیرک میں اس وقت اسّی قیدی عورتیں اور تین بچے سانس لیتے ہیں۔ رات کو اُٹھ کر حاجت رفع کے لیے جانا کسی بڑے جوکھم سے کم نہیں۔ قدم سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑتا ہے اگر غلطی سے کسی کو پاؤں لگ گیا تو سمجھو آدھی رات کو ہی مہابھارت شروع ہو گئی۔ جیل کی سرد تاریک فضا نے قیدیوں میں اتنی تلخی، بے بسی، لاچاری بھر دی ہے کہ صبر، سکون، شانتی نام کی شے اُن کی زندگی سے ناپید ہو چکی ہے۔

بُدھ کا دن اس لیے خاص ہے کہ یہ ملاقات کا دن ہوتا ہے۔ قیدیوں کو اپنوں سے ملنے کا انتظار رہتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں نہ صرف معاشرے بلکہ گھر سے بھی ٹھکرائی جا چکی ہیں۔ جن عورتوں کو کوئی ملنے آتا ہے اُنہیں باقی کی عورتیں زیادہ خوش قسمت سمجھتی ہیں اور حسد بھری نظروں سے اُنہیں دیکھتی ہیں۔ اس بیرک میں سبھی عورتیں جن کا سنگین جرم ثابت ہو چکا ہے، جن پر ابھی کیس چل رہا ہے اور جُرم ثابت نہیں ہوا اور وہ جن کے کیس کی سنوائی شروع بھی نہیں ہوئی، سبھی ایک ہی بیرک میں قید ہیں۔

رتنا پچھلے چار سال سے اسی بیرک میں قید ہے اپنے بیٹے بلو کے ساتھ اور کیس کیٹری کی چال چل رہا ہے۔ آج اُسے بھی انتظار ہے اپنے بھائی کا جس کی درخواست پر اُسے دس دن کے لیے پیرول پر چھوڑا جا رہا ہے۔ صبح سویرے ہی اُس نے بلو کو تیار کر دیا تھا اور خود بھی کھڑی میں اپنا مختصر سا سامان تیار کر کے دس بجے کا انتظار کرنے لگی۔

چائے ناشتے کی ٹرالی بیرک کے پاس آ کر رُکی تو اُسے پتا چلا کہ ابھی تو صبح کے سات ہی بجے ہیں۔ بیرک کے تالے کُھلنے کی آواز سے عورتیں اپنے اپنے المونیم کے مگ اور پلیٹ لے کر اُس کی طرف لپکیں تو لچھی کے ایک اشارے پر سبھی قطار میں کھڑی ہو گئیں اور باری باری سے اپنی پلیٹ اور مگ آگے بڑھاتیں، اپنے حصّے کے چار چار بریڈ کے سلائیس اور چائے ڈلوا کر آگے بڑھ جاتیں۔ رتنا نے بے من سے چائے اور وہی سوکھی بریڈ لی اور بلو کی انگلی پکڑ کر اپنی جگہ پر لے گئی۔ چائے میں ڈبو ڈبو کر بلو کو کھلانے لگی اور سوچنے لگی کہ یہ ہی تو کھانے پینے کے دن ہیں ان بچوں کے۔ کتنا بدنصیب ہے اُس کا بیٹا جسے باپ کی جائیداد ہوتے ہوئے بھی ان سوکھے ٹکڑوں پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسے تو اُن چیزوں کے نام اور ذائقہ تک نہ معلوم ہو گا جو اس کے بہن بھائی کھاتے تھے۔ اُس نے بلو کی نظریں بچا کر گالوں پر گرے آنسو کے قطرے صاف کیے۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے آنسو دیکھ کر اُس کا بیٹا سہم جاتا تھا۔

لچھی کو اپنے طرف آتے دیکھ وہ اپنے آنسو چھپا کر مسکرا دی۔ لچھی اس بیرک میں سب سے پُرانی قیدی ہے۔ لمبا قد پھیلا ہوا جسم، گہرا سانولا رنگ، کالی موٹی کجراری آنکھیں اور چمیلی کے تیل سے چپڑے ہوئے بال۔ جیل کی میٹرن آتے ہی سب سے پہلے مسکرا کر اُس سے بیرک کا حال جانتی۔ بیرک کے اندر امن برقرار رکھنے کے سب حقوق اُسے دے رکھے تھے۔ اُس کی کڑک آواز، اُس کی قہر آلود گھوری سے سبھی قیدی خوف کھاتے ہیں مگر بلو بے جھجک بے خوف اس کے پاس چلا جاتا۔ اُس کی گود میں بیٹھ کر اُس کے بالوں سے کھیلتا، اُس کی تھالی سے کچھ بھی اٹھا کر کھا لیتا۔ وہ بس مُسکرا کر اُسے دیکھتی رہتی۔ چہرے کی نسیں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ وہ ہلکی سی میٹھی سی مُسکراہٹ اُس کے چہرے کی کرختگی اور سختی کو پل بھر میں ملائم کر دیتی۔ ممتا کی بھینی بھینی خوشبو سے اُس کا وجود تر بتر ہو جاتا۔ بلو کی وجہ سے ہی لچھی کے دل میں رتنا کے لیے نرم گوشہ تھا۔ چار سال پہلے جب رتنا اس بیرک میں آئی اس وقت بلو ایک سال کا تھا۔ ٹھیک سے بولنا بھی نہیں سیکھا تھا اور نہ ہی چلنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اسی قید خانے میں اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اس کی دنیا بہت محدود ہے۔ جیل کی یہ بیرک، بیرک کے باہر راہ داری اور راہ داری کے آگے کھلا میدان جس کے ارد گرد لمبی لمبی دیواریں۔ جیل میں ساتھ رہنے والی عورتوں سے اُس نے عمر کے حساب سے رشتہ بنا لیا تھا۔ دیدی، موسی، چاچی، نانی، دادی سبھی رشتے اس نے خود ہی تراش لیے تھے۔

لچھی نے آتے ہی پوچھا۔

''بلو کو ساتھ واپس لاؤ گی یا بھائی کے گھر چھوڑ کر آنے کا ارادہ ہے؟''

''میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔ ابھی ایک سال اور میرے ساتھ

رہ سکتا ہے پھر معلوم نہیں اس کا کیا بنے گا؟''

''ابھی ایک سال ہے نہ؟ فکر کیوں کرتی ہو کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔''

وہ خاموش رہی۔ ابھی سے اُسے ببلو کی فکر اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ سوچنے اور فکر کرنے کے علاوہ وہ کر ہی کیا سکتی تھی کچھ بھی تو نہیں تھا اُس کے اختیار میں۔ یہاں تک کہ پیرول پر جانے کے لیے بھی اُسے لچھی کی پُرزور سفارش کی ضرورت پڑی تھی۔

دن میں دو بار بیرک کے دروازے کھُلتے ہیں۔ پہلے دس بجے اور پھر دوپہر تین بجے۔ دو گھنٹے صبح اور دو گھنٹے دوپہر کو قیدیوں کو آزادی ہوتی ہے چار دیواری کے اندر ہی گھومنے، پھرنے، کھیلنے، کودنے، گانے بجانے کی۔ جیسے ہی بیرک کا دروازہ کھُلا سبھی بھیڑ بکریوں کی طرح باہر کو لپکیں۔ رتنا سے پہلے ببلو باہر تھا۔ کھُلی فضا میں پہنچتے ہی دونوں بانہیں پھیلا کر ''اوم اوم'' کہتا گراؤنڈ میں بھاگ بھاگ کر عورتوں سے بچتا بچاتا چکر لگانے لگا جیسے اپنی آزادی کا جشن منا رہا ہو۔ اس عمر میں بچے گھر کے اندر ٹکتے کہاں ہیں اُنہیں تو کھیلنے کے لیے کھُلا میدان چاہیے اور وہ اس عمر میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی چار دیواری میں قید ہے۔ یہ خبر آگ کی طرح بیرک میں پھیل چکی تھی کہ وہ آج پیرول پر جا رہی ہے۔ وہ باہر آ کر وشال کے انتظار میں بیٹھی تو کچھ عورتیں اُسے دیکھتے ہی اپنی اپنی فہرست لے کر اُس کو تھمانے لگیں کچھ دور سے ہی اُسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اور کچھ مارے حسد کے فالتو میں بکے جا رہی تھیں۔ وہ ان سب سے بے نیاز صرف وشال کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ببلو بھی چکر کاٹتا ہانپتا کانپتا اس کے پاس آ کر اُس کی گود میں گرتے ہی بولا:

''ماں ماما کب آئیں گے؟ ہم دیدی کے پاس کب جائیں گے؟ مجھے بھیّا کے ساتھ کھیلنا ہے۔''

وہ بھی بے چین تھا اپنے بھائی بہن سے ملنے کو جلد سے جلد اُن تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جیل آنے کے بعد وہ صرف دو بار ہی مل پایا تھا ان سے۔ اُس کے بعد وہ کبھی آئے ہی نہیں۔

دو مرتبہ جب ماما کے ساتھ ملنے آئے تو واپس جا کر اور سہم گئے تھے۔ خوشی کچھ پل کی نصیب ہوئی اور مایوسی نے دلوں میں گھر کر لیا۔ دل پر پتھر رکھ کر رتنا نے چھوٹی سی خوشی کو بھی مار دیا۔ جب سے اُس نے پیرول پر جانے کی درخواست دی تھی اُس کی ممتا اُچھالے مار رہی تھی جسے اُس نے بڑی مشکل سے باندھ کر رکھا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر اپنے بچوں کے پاس پہنچ جاتی۔ میٹرن کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ چونک کر اُٹھی۔

''قیدی نمبر ۲۳۴ آ جائے۔''

اپنا نمبر سُنتے ہی اُس کا مرجھایا چہرہ دمک اُٹھا۔ جسم میں نئی پھرتی بھر گئی۔ ببلو کا ہاتھ تھامے وہ بجلی کی رفتار سے راستہ پھلانگتی ہوئی میٹرن کے پاس پہنچ گئی۔

''میرا بھائی آیا ہے؟''

''اندر سے اپنا جو سامان اُٹھانا ہے اُٹھا لو۔ ابھی تم پیرول پر چھوڑ دی جاؤ گی۔''

وہ اُسی تیزی سے اندر گئی اور پوٹلی اُٹھا کر میٹرن کے ساتھ جانے لگی تو لچھی نے ببلو کو آواز دے کر بُلا لیا۔

''بڑا خراب ہے رے تُو۔ اپنے بہن بھائی سے ملنے جا رہا ہے اور موسی کو بنا ملے چلا جائے گا؟ ادھر آ میرے پاس۔''

ببلو ماں کا ہاتھ چھڑا کر اُس کی طرف لپکا۔

''لچھی نے اُسے کس کر سینے سے لگا لیا، اُس کے گال چومے اور کہا:''

''اپنے بہن بھائی کے ساتھ خوب مستی کرنا اور سُن موسی کو بھول مت جانا۔''

''ہوں۔''

سر ہلا کر جھومتا، جھامتا پھر ماں کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی وشال کو دیکھ کر اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا اور ببلو ماما سے جا کر لپٹ گیا۔

''کیسی ہیں آپ جی جی؟'' بہن کے پاؤں چھو کر اُس نے پوچھا۔

''تجھے دیکھ کر تو ساری تکلیف بھول جاتی ہوں۔ گھر پر سب ٹھیک ہیں نا؟''

''بس آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

جیل کی دیگر کارروائی پوری کرتے کرتے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب ایک گھنٹے بعد وشال اور ببلو کے ساتھ جیل کے صدر دروازے سے باہر نکل کر کھُلے آسمان کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگیں۔ یہ آنسو شکرانے کے تھے، تاریکی سے نکل کر اُجالے میں آنے کے تھے، کھُلی ہوا میں سانس لینے کے تھے، درد بھرے دن چار دیواری میں گزارنے کے تھے یہ وہ خود نہیں سمجھ پائی۔ سب جذبات یکجا ہو کر آنکھوں کے کٹوروں کو لبالب بھر کر گالوں پر جھلک گئے تھے۔

ببلو کے لیے یہ دنیا نئی تھی۔ پانچ سال کا ببلو جس نے بنا کسی جرم کے اپنی زندگی کے چار سال سلاخوں کے پیچھے اُونچی اونچی دیواروں کے سائے میں گزارے تھے۔ وہ ہر چیز کو کبھی حیرت، کبھی خوف، کبھی تجسس اور کبھی خوش ہو کر دیکھ رہا تھا۔

بس سے اُن کے شہر کا راستہ تقریباً چار گھنٹے کا تھا۔ ببلو نے وشال کو سوالوں کے جال میں پھنسا دیا تھا۔ ببلو سوال کرتا جاتا اور وشال جواب دیتا جاتا۔ نیا ماحول، نئی دُنیا دیکھ کر ہر شے میں اُس کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کھُلی فضا میں ایسے سانس لے رہی تھی جیسے آزادی کا ہر لمحہ، کھُلی فضا کا قطرہ قطرہ اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی ہو۔ اتنی ذلت، رُسوائی، اذیت، دُکھ درد، محرومیوں اور تکلیف سہنے کے باوجود وہ جینا چاہتی تھی۔ اُسے ہر ظلم ہر جبر، ہر تکلیف قبول تھی صرف اپنی اولاد کی

خاطر۔ اُنہیں اُس کی ضرورت تھی۔ اتنی بڑی بے رحم دنیا میں وہ اُنہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اُن سے دور ہے تو کیا، خبر تو رہتی ہے۔ اِک اُمید تو ہے کہ اُسے بھی انصاف ملے گا۔ کبھی تو یہ دُوریاں ختم ہوگی۔ اُس کی دعائیں، اُس کی فریاد بے اثر نہیں جائیں گیں۔ شاید اُس کی دعاؤں کا ہی اثر تھا کہ خاندان والوں کے سبھی تعلق ترک کرنے اور گھر سے نکالے جانے کے باوجود ایک مسیحا باقی تھا جو اُنہیں سنبھال رہا تھا۔

اُس کی نظریں باہر کی دنیا نہار رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ چار سالوں میں کچھ بھی تو نہیں بدلا دنیا ویسے ہی چل رہی ہے مگر اُس کی دنیا کتنی بدل چکی ہے۔ ایک ہی دن میں وہ عرش سے فرش پر آ گری تھی۔ نہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی۔ اُس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اُوپر والے نے اُسے اس طرح تراشا تھا کہ اُسے دیکھ کر بھوک نہیں مٹتی تھی۔ دیکھنے والے کی نگاہیں اُس کے چہرے کی کشش میں بھٹک جاتیں اور نظر بھر دیکھنے کی خواہش سر اٹھانے لگتی۔ امر بھی دیکھتے ہی اُس کی خوبصورتی کے سحر میں ایسا پھنسا کہ کبھی نکل نہ پایا۔ اُسے پانے کے لیے اُس نے اپنے خاندان سے بغاوت کر لی تھی۔ مجبوراً انہوں نے رتنا کو قبول تو کر لیا تھا پر دل سے اپنا نہ سکے۔ وہ مکمل کیچڑ میں کھلا تھا۔ ایک تو چھوٹی ذات اور دوسرے مالی حیثیت میں کم خاندان سے رشتہ جوڑنے میں جو توہین سہنی پڑتی تھی اُسے وہ بھلا نہیں سکے۔ ماں کی انا لڑکی کے لیے بیٹے کی بغاوت نے مجروح کی تو بڑی بھابی کو رتنا کی خوبصورتی نے حسد کی بھٹی میں جھونک دیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی، موقعہ ملتے ہی ہلاک کر دی گئی۔ مرا تو اُس کا شوہر تھا مگر ماری وہ گئی تھی۔ بھلا وہ کیوں مارتی اُس شخص کو جس کے دم سے اُس کی دنیا آباد تھی۔ جس کے اردگرد اُس کی پوری کائنات گھومتی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ جیتی تھی، جس کی بے پناہ محبت نے اُس کی زندگی میں سرشاری بھر دی تھی، جس نے اُسے مکمل عورت بننے کا شرف بخشا تھا۔ اُسی کی بے وقت مشکوک موت کی ذمہ دار اُسے ٹھہرا دیا گیا۔ اُسے بے گناہی ثابت کرنے کا موقعہ بھی نہ دیا اور اُس کے کردار کی دھجیاں اُڑا دیں۔ اُس کا دامن الزامات سے داغدار کر دیا، رُسوایاں، تہمتیں، ذلت اس کا نصیب بن گیا۔ وہ تو سمجھ ہی نہ سکی کہ امر کی بے وقت رحلت کا ماتم کرے یا اپنی بے گناہی پر روئے، چلّائے۔ اپنے ہی گھر سے دھکے مار کر نکالے جانے پر شور مچائے یا پھر اپنے بچوں سے بچھڑ جانے، اُنہیں بے گھر اور یتیم ہوتا دیکھ کر کہرام مچائے۔

عورت کی چھٹی حس مرد کی نیت کو بہت جلد سونگھ لیتی ہے۔ کرتار کی آنکھوں کی اوٹ میں چھپے ڈورے دیکھ کر وہ لرز اُٹھی تھی۔ اُس نے امر کو اپنے خوف سے آگاہ کرنا چاہا تو اُس نے اُس کا وہم کہہ کر ہنسی میں اُڑا دیا۔ کرتار امر کے بچپن کا دوست تھا اور خود سے زیادہ اُسے اپنے دوست پر یقین تھا۔ وہ ہمیشہ یہ ہی کہتا کہ ''میں اُسے اپنے سے زیادہ جانتا ہوں۔ لاکھ برائیاں ہوں اس میں مگر وہ بدنیت نہیں ہوسکتا۔ یہ وہم اپنے دل سے نکال دو۔'' امر کا دلاسا اسے مطمئن نہ کر سکا۔ جب انسان کے دل و دماغ پر ہوس کا پردہ پڑ جاتا ہے تو اُس کی نظر میں جائز ناجائز کا فرق مٹ جاتا ہے۔ رتنا کو رجھانے کے لیے، اُس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے، اُسے پانے کے لیے وہ چوری چھپے طرح طرح کے ہتھ کنڈے اپناتا رہا۔ سام دام ڈنڈ بھید کچھ بھی نہ چھوڑا اور نہ وہ ڈگمگائی اور نہ ہی اپنے مقام اپنے رتبے سے گری۔ ہارے ہوئے شکاری نے آخری وار ایسا کیا کہ وہ اُس کی چال سے چاروں خانے چت ہوگئی۔ نہ شوہر بچا نہ گھر، نہ بچے اور خود بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئی۔ اپنے عاشق سے مل کر شوہر کو مار ڈالنے کا الزام امر کی بھابی نے ہی لگایا تھا۔ خاندان والوں نے بے دخل کر دیا۔ جب وہ جیل گئی اس وقت جو ہی آٹھ سال کی تھی اور جگنو سات کا۔

حادثے سے دو دن پہلے ہی ببلو کی پہلی سالگرہ دھوم دھام سے منائی تھی۔ آج وہ پانچ سال کا ہو چکا تھا اور اگر ایک سال میں اُس کے کیس کا کچھ نہ بنا تو اُسے مجبوراً ببلو سے بھی بچھڑنا پڑے گا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لرز اُٹھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اتنا چھوٹا بچہ ماں کے بغیر کیسے رہ سکے گا اور پھر وشال کی اپنی گھر گرہستی بھی ہے۔ پہلے ہی دونوں بچوں کی ذمہ داری اُس کے کاندھوں پر ہے اور ببلو کی ذمہ داری۔۔۔؟ اس کے آگے وہ سوچ نہ سکی۔ فکر کی لکیریں اُس کے چہرے پر چھا گئیں۔ اُس نے ببلو کی طرف دیکھا جو ماما کی گود میں بڑی بے فکری کی نیند سویا ہوا تھا اور اُس کی طرح وشال بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو ہی اور جگنو بھی چار سال میں بڑے ہوگئے ہونگے۔ وقت کسی کے لیے کہاں رُکتا ہے، اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے مگر اُس کا وقت رُک گیا تھا زندگی تھم سی گئی تھی۔

''سجان پور۔۔۔ سجان پور'' کنڈیکٹر نے اونچی آواز میں چلا کر کہا تو وہ ماضی کے دریچوں سے نکل آئی۔ وشال ببلو کو لے کر کھڑا ہو گیا اور اُسے بھی اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ بھائی کی خاموشی اور پیشانی پر فکر کی لکیریں سیدھی اُس کے سینے میں تیر کی طرح چُبھ رہی تھیں۔ آج اُسے گھر لے جاتے ہوئے کس قدر مایوس اور پریشان لگ رہا ہے یہ وہی وشال ہے جو اُسے سسرال سے لینے آتا تھا تو سارا راستہ اس کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں بے وجہ ہی ہنستا جاتا تھا۔ اس کی بدنصیبی نے اُسے بھی بہت رُسوا کیا تھا۔ شام کے سائے اترنے لگے تھے جس کی دھندلی روشنی میں خود کو چھپانا اُسے آسان لگا تھا۔ سجان پور ایک چھوٹا سا قصبہ جس کی گلی گلی، چپّا چپّا اُس سے واقف تھا، جدھر ہر شخص دوسرے کو جانتا تھا، جدھر اُس کا بچپن گزرا، جدھر وہ ہرنی کی طرح پھُدکتی تھی، آج وہی سب سے نظریں چُرا کر سب کی نظریں بچا کر نکل جانا چاہتی تھی۔ گھر کے دروازے پر آ کر رکشہ رُکا تو اُسے چین کی سانس آئی۔ ببلو کی اُنگلی پکڑ کر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اُس کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگیں۔ آنگن میں امّاں کا تخت ویسے ہی بچھا تھا۔ آج وہ تخت خالی تھا۔ آخری بار وہ امّاں سے ببلو کی سالگرہ پر ہی ملی تھی پھر امّاں بیٹی کا صدمہ برداشت نہیں کر پائی تھی۔ دروازے پر آہٹ سُن کر بھابی اندر سے چلی آئی۔ پہلا جھٹکا اُس کے گلے ملنے کے انداز سے لگا۔ اپنے ہی گھر میں اس طرح سرد مہری کا مظاہرہ؟ دوسرا جھٹکا اُسے تب لگا جب بچے اندر ہی چھپے رہے اور بُلانے پر بھی نہیں آئے۔ پھر وشال خود انہیں اندر سے کھینچ کر لایا۔ جو ہی اُسے دیکھ

کرایسے جھجک رہی تھی جیسے وہ کوئی اجنبی ہواور جگنو بہن کی قمیض کا کونا پکڑے اُس کے پیچھے چھپا جا رہا تھا۔ بچوں کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے اُن کی طرف لپکی اور دونوں کو بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ آنکھیں برستی رہیں اور وہ بے تحاشہ اُنہیں چومتی رہی۔ ممتا کی پھوار میں معصوم بچپن بھیگتا رہا اور ماں کی شفقت نے دھیرے دھیرے دُریوں کی گرد صاف کردی۔ ساری ہچکچاہٹ سارے فاصلے پُر کردیئے۔

ببلو کی تو جیسے لاٹری نکل آئی تھی۔ جوہی، جگنو، مُنی، چیکی سب سے مل کرایسا مست ہوا کہ ماں کو بھول ہی گیا۔ دو دن میں ہی سب کا لاڈلا بن گیا۔ جوہی کی کچی عمر دیکھ کر وہ فکرمند ہوگئی تھی۔ بیٹیاں چاند کی طرح ہوتی ہیں کتنی جلدی بڑھ جاتی ہیں۔ اس عمر میں قدم قدم پر ماں کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھابی کے تیور کُھل کر سامنے آ رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ اس کا رویہ دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ کس بے زاری میں وہ دن کاٹ رہے ہونگے۔ حالات نے اُن سے اُن کا بچپن چھین لیا تھا۔ جگنو نے گھر سے باہر بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے فقرے کستے تھے، اُسے ماں کا طعنہ دے کر چھیڑتے تھے جس وجہ سے اُس کی طبیعت میں چڑچڑاپن اور غصہ شامل ہوگیا تھا۔

اُس کے آنے کی خبر محلے میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ لوگ منہ اُٹھا کر اُس سے ملنے، اُسے دیکھنے، اُسے کریدنے، جھوٹی ہمدردی جتانے اور اُس کا تماشا دیکھنے چلے آتے۔ وہ سب کو اپنی صفائی دے کر تھک چکی تھی۔ یہ تو بھلا ہو وشال کا جس نے سختی سے سب کو گھر آنے سے منع کردیا۔ اپنے بھائی پر وہ جتنا ناز کرے کم ہے۔ اپنی محدود کمائی میں بیوی کی مخالفت کے باوجود بھائی ہونے کا فرض نبھا رہا تھا۔ اُس کے بچوں کو سنبھال کر بیٹھا تھا۔ اُس روز وہ ایک ایسے نامی وکیل کے نام کا رقعہ لے کر آیا جو کبھی کوئی کیس ہارا ہی نہیں تھا۔ وشال کو پوری اُمید تھی کہ وہ اُن کی مدد کرسکتا ہے۔ بناوقت گنوائے اُسے مل لینا چاہیے۔ ابھی تو وہ جی بھر کر بچوں سے ملی بھی نہ تھی کہ آٹھ دن پلک جھپکتے ہی بیت گئے۔ پیرول ختم ہونے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا لہٰذا اس شام دونوں وکیل کے دفتر پہنچ گئے۔

وکیل کے دفتر میں ملنے والوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ دفتر اور بھیڑ دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ یہ مہنگا وکیل ہوگا اور اُس کے پاس فیس دینے کے لیے منگل سوتر اور دوسونے کی چوڑیوں کے علاوہ ہے کچھ بھی نہیں۔ تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اُن کی باری آئی۔ عمر سے، تجربے سے، باتوں سے اُنہیں وہ منجھا ہوا وکیل لگا۔ پکا رنگ، چیل جیسی آنکھیں، گھنی مونچھیں، رعبدار اندازِ گفتگو، رتنا کی زبانی سارا واقعہ سنا اور اس دوران ایک پل کے لیے بھی اس نے رتنا کے چہرے سے اپنی نظریں نہیں ہٹائیں۔ اپنی چیل جیسی شاطر آنکھوں سے جیسے رتنا کے ہر لفظ کو وہ تول رہا ہو، جانچ رہا ہو، پرکھ رہا ہو۔ جب وہ اپنی بات کہہ چکی تو کمرے میں خاموشی بھر گئی۔ پھر وکیل نے سوال اُچھالا:

''ایک سال میں رہائی کی فیس تین لاکھ اور جائیداد میں حق کی بات بعد میں کریں گے۔''

''تین لاکھ؟'' وشال کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

اس کے چہرے کا رنگ بھی اُڑ گیا۔

''چار سال سے سلاخوں کے پیچھے ہو اور کیس کی سنوائی بھی شروع نہیں ہوئی میں تو ایک سال کے اندر رہائی کی گارنٹی دے رہا ہوں۔ چلو بی بی تم آدھی فیس ابھی دے دو آدھی رہائی کے بعد۔''

دو منٹ وہ خاموشی سے کچھ سوچتی رہی پھر کل صبح آنے کا کہہ کر وہاں سے نکل آئی۔ وشال نے نکلتے ہی پوچھا۔

''اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟''

''تم فکر نہ کرو۔ سوچتی ہوں کیا کرنا ہے۔ پوری رات پڑی ہے سوچنے کے لیے''

''میں تو اس قابل بھی نہیں کہ تمہاری کچھ مدد کرسکوں''

''تم میری جس طرح مدد کر رہے ہو وہ میرے لیے بہت زیادہ ہے۔ میرے پاس دو چوڑیاں اور منگل سوتر پڑا ہے اُسے بیچ دیتے ہیں۔''

''مگر وہ تو۔۔۔''

''اس وقت زیور کام نہیں آئیں گے تو کب آئیں گے؟ ویسے بھی اب منگل سوتر میرے کسی کام کا نہیں۔''

دونوں اپنی اپنی فکر میں گُم گھر کی جانب چل دئے۔

صرف دو راتیں آزادی کی بچوں کے ساتھ گزار سکتی ہے اور اُس کے بعد وہی تاریک جیل کی زندگی، وہی جدائی، وہی فکر، وہی پریشانی۔ واپسی کا سفر دل ہولا رہا تھا۔ بچے رو رو کر بے حال ہو رہے تھے۔ ابھی تو اس نے جی بھر کر بچوں کو پیار بھی نہیں کیا تھا اور وقت پنکھ لگا کر اُڑ گیا۔ ببلو نے ابھی سے رونا شروع کردیا تھا کہ وہ جوہی اور جگنو کے ساتھ ہی رہے گا اور ماں کو بھی نہیں جانے دے گا۔ بھابی کے تیور ساتویں آسمان پر تھے۔ اس وقت صرف ایک ہی شخص تھا جو اُسے اس بھنور سے نکال سکتا تھا اور وہ وکیل تھا۔

اگلے ہی روز زیور بیچ کر دونوں وکیل کے دفتر پہنچ گئے۔ پیشگی رقم میں بھی چالیس ہزار کم تھے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ شاید وکیل اُس پر رحم کردے اور بقایا رقم رہائی کے بعد لے لے۔ وہ اس کے سامنے تھی۔ اُس نے سارے حالات صاف صاف بتادیئے۔

''آپ ذرا باہر بیٹھئے مجھے ان سے کیس کے متعلق چند ذاتی سوالات کرنے ہیں'' وکیل نے وشال کو باہر جانے کو کہا۔ وشال کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بات کرتا رہا کچھ پوچھتا رہا پھر وکالت نامہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ پل خاموشی سے سوچنے کے بعد اُس نے دستخط کردیئے۔

''بی بی اب تمہارا کام ختم اور میرا شروع۔ اب تُم جاؤ اور اپنی رہائی کے دن گننا شروع کردو۔''

باہر آئی تو وشال نے آتے ہی پوچھا۔

باقی صفحہ ۸۵ پر ملاحظہ کیجیے

''جسم جزیرہ''

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

''گلزار'' سجا دوں پانی میں
میں آگ لگا دوں پانی میں

میں موج میں آ کر اُترا ہوں
اک شور مچا دوں پانی میں

اے مجھ کو ڈبونے والے سُن
اب تجھ کو دعا دوں پانی میں

کشتی کے سفر پر آؤ چلیں
کچھ گیت سنا دوں پانی میں

شہکار کے فن میں روانی ہو
تصویر بنا دوں پانی میں

معیار مری محنت کا یہی
میں خون ملا دوں پانی میں

یوں موتی موتی آنکھوں کے
سب خواب بہا دوں پانی میں

پھر جسم جزیرہ بن جائے
جب جان گنوا دوں پانی میں

برسات اسی سے جھڑیاں بھی
ہیں ساون بھا دوں پانی میں

جذبات سپردِ خاک کروں
ارمان ملا دوں پانی میں

سیلاب سے پہلے ثاقب میں
اک شہر بسا دوں پانی میں

اعتبار ساجد
(لاہور)

سوزِ دل ، زخمِ جگر، حسنِ نظر سب کچھ ہے
وہ مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر سب کچھ ہے

اک کمی سی تو یقیناً ہے کہیں پر موجود
کیا سبب ہے مری وحشت کا اگر سب کچھ ہے

جو زر و مال کے تاجر ہیں انہیں کیا معلوم
آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک گہر سب کچھ ہے

اب کھُلا ، اور ہی معیار کے پیمانے ہیں
ہم سمجھ بیٹھے تھے دنیا میں ہُنر سب کچھ ہے

اس نتیجے پہ سیانوں نے ہمیں پہنچایا
شاعری وائرَی بیکار ہے، زر سب کچھ ہے

قاصدِ شاہ نہیں آیا وظیفہ لے کر
منتظر بیٹھے ہیں، اک دستکِ در سب کچھ ہے

ارضِ دِلّی میں اُنہیں جائے لحد بھی نہ ملی
وہ تو کہتے تھے یہ دِلّی ہے، اِدھر سب کچھ ہے

○

غالب عرفان
(کراچی)

وہ شخص بے لباس جو اک آن میں ہوا
بے وزن سا میں ذہن کی میزان میں ہوا

سمٹی ہے کائنات بھی اپنے وجود کی
جب میں اکیلا لمحہ، وجدان میں ہوا

اک خواب جب ادھورا نظر آیا تو کھلا
اک حادثہ شعور کے امکان میں ہوا

اک فاصلہ عبور کیا اک نہ کر سکا
اور یہ بھی ایک وقت کے بحران میں ہوا

اک نغمہ اس نے چھیڑ دیا بےخودی کے ساتھ
اک رقص مجھ سے حالتِ ہیجان میں ہوا

میں اس کے ساتھ عمرِ طبعی نہ جی سکا
جس سے ملاپ حلقۂ عرفان میں ہوا

○

نقشبند نقوی بخاری
(امریکہ)

سفر جس سے مکمل ہو وہی نقشہ نہیں بنتا
کبھی منزل نہیں بنتی، کبھی رستہ نہیں بنتا

ہے ناقہ ایک مشکل اور محمل ایک دشواری
چنانچہ قصۂ لیلیٰ کا دیباچہ نہیں بنتا

مصور نے نجانے کتنی کی ہو گی عرق ریزی
قلم کی ایک جنبش سے کوئی جلوہ نہیں بنتا

بدن کی زیب و زینت کو بہت ملبوس بنتے ہیں
جو فطرت کو بدل سکتا ہو وہ خرقہ نہیں بنتا

ہے درویشِ وفا شہرِ تمنا میں ہی سرگرداں
جوارِ حسن میں اس کا مگر حجرہ نہیں بنتا

بہت سی عرضیاں لکھیں، کئی مضموں بنائے ہیں
جو سارا مدعا کہدے وہی جملہ نہیں بنتا

محبت دو دلوں کے متفق ہونے کی حالت ہے
تعلق کوئی اس دنیا میں یکطرفہ نہیں بنتا

عمارت کے لیے بنیاد کا ہونا ضروری ہے
مکاں جو ریت پر بنتا ہے وہ پختہ نہیں بنتا

وہ آبادی کہ قانونِ محبت جس میں نافذ ہو
ابھی تک نقشبند ایسا کوئی قریہ نہیں بنتا

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

بچا نہ کچھ بھی نگاہوں کو منتہٰی کے سِوا
جھکا یہ سر نہ کہیں، اُن کے نقشِ پا کے سِوا

ہزار مِنّتیں کیں ۔ لاکھ ہاتھ پھیلائے
مگر نہ کُچھ بھی مِلا زخم اِلتجا کے سِوا!

یہی ہَوس ہے کہ سارا جہاں ہو زیرِ نگیں
جہاں میں کچھ بھی نہیں اور، اِس ہوا کے سِوا

نہیں ہے اِس کے سِوا اور کچھ بھی پاس مِرے
مَیں دوں بھی کیا تجھے اے دوست! اب دعا کے سِوا

خلوص شرط ہے، اوّل بھی اور آخر بھی
دِیارِ عشق میں سب ہیچ ہے وفا کے سِوا

لبوں پہ حرفِ وفا ہے دلوں میں بَیر مگر
کہوں میں کیا اِسے یاروں کی اک اَدا کے سِوا

عزیز کیوں نہ ہو اے چاندؔ! مجھ کو یہ دولت
بچا ہی کیا ہے مِرے پاس اب اَنا کے سِوا؟

○

مامون ایمن
(نیویارک)

لغزشِ پا کو اِک ہُنر کہیے
بے گھری کو بھی اب سفر کہیے

گدگدی کیجیے کبھی دل میں
شعر کہیے تو بااثر کہیے

جس نے پاتال سے کیا رِشتہ
اُس تصوّر کو بام پر کہیے

زندگی چار دِن کی ہے جگ میں
اس لیے اُس کو مختصر کہیے

بیٹھ جانا غلط ہے دھڑکن کا
دل کے محور کو رَہ گذر کہیے

خواب، نیندوں میں جب اُمڈ آئیں
شام کو جاگ کر سحر کہیے

چُپ ہی بہتر ہے چار لوگوں میں
سچ ہی کہیے مگر، اگر کہیے

اس میں بستی ہیں آ کے اُمّیدیں
آنکھ کو خواب کا نگر کہیے

آپ کا راستہ ہے پیچیدہ
خود کو دُنیا سے یوں دِگر کہیے

خاک بہتر ہے نُور سے ، ایمنؔ!
بات کہیے یہ، سر بَسر کہیے

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

چمن میں کوئی ٹھکانہ تو بے پروں کو ملے
کہ انقلاب کا مژدہ بھی بے زروں کو ملے

افق پہ شب کی سیاہی، غبار چاروں طرف
کوئی تو راہ پلٹنے کی منظروں کو ملے

کہاں سے آئے گا نقد و نظر کا پیمانہ
کہ پھر جریدوں میں توقیرِ تبصروں کو ملے

سروں پہ اپنی ہی چھت ہو تو بات بن جائے
مکان رہنے کو اپنا بھی، بے گھروں کو ملے

کوئی تو آئے کہ بیٹھے ہیں منتظر کب سے
کہ دستِ ناز سے تحفہ مجاوروں کو ملے

تراشنے کی سہولت اگر میسر ہو!
تو فن کی قدر بھی لازم ہے آرزوؤں کو ملے

کہیں نہ کوئی سمندر ملا ہے صحرا میں
کبھی تو درد کا صحرا سمندروں کو ملے

○

پروفیسر صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

روز و شب سفر میں ہیں آنکھ ہے تماشائی
قرب اتفاقی ہیں خام ہے شناسائی

دل کی غم پذیری سے یوں تو ناواقف نہ تھے
یہ کبھی نہ سوچا تھا مار دے گی تنہائی

عہدِ الفتِ یاراں، بے غمی و آزادی
پھر وہ گم شدہ عشرت لوٹ کر نہیں آئی

ہم نے اپنی شہرت سے فیض کچھ نہیں پایا
قریہ قریہ وحشت تھی، شہر شہر رسوائی

اک ہوا کے جھونکے سے جان پر بن آئی ہے
تم نے دیکھی ہی کب ہے موسموں کی انگڑائی

بار تھا جو آنکھوں پر دیکھنا پڑا مجھ کو
کوستی رہی شاہدؔ مجھ کو میری بینائی

○

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

زمیں بدلی نہ اب تک آسماں بدلا
پلک جھپکی سلوکِ دوستاں بدلا

کوئی صحرا نوردی اب نہیں کرتا
مبارک ہو مزاجِ عاشقاں بدلا

کہیں ہم سائے اچھے بھی ملیں شاید
یہی کچھ سوچ کر ہم نے مکاں بدلا

ہمارا رازِ سر بستہ زباں زد ہے
مگر پھر بھی نہ ہم نے راز داں بدلا

تغیر ہے پرندوں کی نوا میں بھی
مگر تیرا نہ اندازِ فغاں بدلا

ہزاروں سنگ و آہن راستے میں تھے
تو پھر کیا جادۂ آبِ رواں بدلا

بدلنا ہے ابھی کچھ اور بھی اختؔر
ابھی تو صرف نظمِ گلستاں بدلا

○

ڈاکٹر رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

پڑا جو وقت تو کیا کیا بدلتے رہتے ہیں
یہ لوگ وہ ہیں جو قبلہ بدلتے رہتے ہیں

نگاہ باز کبھی مطمئن نہیں ہوتے
تماش بین ۔۔۔ تماشا بدلتے رہتے ہیں

کوئی نشان کہیں بھی وہ چھوڑتے ہی نہیں
جو رنگ لحہ بہ لحہ بدلتے رہتے ہیں

نگاہ ٹکتی ہے ان کی نہ پیاس بجھتی ہے
کہ گاہے گاہے وہ چشمہ بدلتے رہتے ہیں

خدا کا شکر میں آتا نہیں کبھی زد پر
عدو ہزار نشانہ بدلتے رہتے ہیں

جہاں تلاش کرو گے وہاں نہ پاؤ گے
خراب حال خرابہ بدلتے رہتے ہیں

رؤف خیؔر ہمیں وہ پسند کیا کرتے
جو نظم و نثر کا حلیہ بدلتے رہتے ہیں

○

کرامت بخاری
(لاہور)

یہ جہانِ آب وگل ہے یہ نگر مٹی کا ہے
راستے سب گرد ہیں سارا سفر مٹی کا ہے

جی رہے ہیں ایک مدت سے کسی اُمید پر
اپنی اس سادہ دِلی میں سب اثر مٹی کا ہے

یہ گزرتے لوگ یہ حیران کرتی صورتیں
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے سب ہُنر مٹی کا ہے

ڈر ہے یہ سیلابِ گریہ میں نہ بہہ جائے تمام
تیرا غم سرمایہ جاں ہے۔ مگر مٹی کا ہے

دیکھئے اُمید کی کشتی کا کیا انجام ہو
وقت ہے گہرا سمندر اور بھنور مٹی کا ہے

کب تلک قائم رہے گا آخرش گر جائے
زعم ہو کس بات کا جب گھر کا گھر مٹی کا ہے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

چاروں طرف جہاں میں پھر کربِ ابتلا ہے
مظلوم سرنگوں ہے ، زردار رہنما ہے

پیشِ نظر ہے سب کے اپنی ہی ذات یارو
دورِ منافقت میں ہر شخص خود نما ہے

قلب ونظر میں نفرت، چہروں پہ ہے مسّرت
ہر سمت پُر تملّق، ہر شخص میں ریا ہے

یہ سادگی ہے دل کی یا وقت کا کرشمہ
مظلوم ظالموں سے اِنصاف مانگتا ہے

ہر دل میں حسرتوں کا کتبہ لگا ہوا ہے
گویا قدم قدم پر آسیب برملا ہے

انسانیت سے عاری اَب ہو رہی ہے دنیا
میں نے زہیؔر دیکھا، کانوں سے بھی سُنا ہے

○

صبا اکرام
(کراچی)

دلوں پہ تیرہ شبی کا ہے خوف طاری بھی
کہ رات ختم ہوئی اور ہے رات جاری بھی

خمیدہ سَر کو کئے آج تک کھڑے ہیں ہم
گزر چکی ہے شہنشاہ کی سواری بھی

نہ جا اے شیشہ صفت اس گلاب چہرے پر
درونِ ذات ذرا دیکھ سنگ باری بھی

ہر ایک لمحہ کرشمہ ہے زندگی میری
کہ پارسائی بھی، اور ساتھ دنیا داری بھی

کھڑا ہوں کب سے میں لے کر لگان جیون کا
اب آئے جلدی سے اکرامؔ اپنی باری بھی

○

اجیت سنگھ حسرت
(لدھیانہ، بھارت)

یہاں فقیر ہے کوئی نہ اب دُعا کی بات یہاں
جو پہلے تھی وہ کہاں روح کی غذا ہے یہاں

کسی کے ہاتھ میں پتھر نہیں مگر پھر بھی
ہمارا آئینہ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے یہاں

الکھ جگائے بھی کوئی تو کس بھروسے پر
نہ کوئی در نہ دریچہ کھلا ہوا ہے یہاں

زمیں کا قرض چکانا کسی کو یاد نہیں!
وہ آسماں کی بُلندی سے جھانکتا ہے یہاں

ہماری صدمۂ ہجرت سے جاں نکلتی ہے
تُو کس خوشی میں تبسّم لُٹا رہا ہے یہاں

رُخِ حیات پہ کتبہ نما ہیں تحریریں
اُداسیوں کا تو میلہ لگا ہوا ہے یہاں

ہمیں تلاش ہے حسرتؔ اُسی فسوں گر کی
طرح طرح کے جو جادو جگا رہا ہے یہاں

○

''رفتارِ وقت''

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

جولائی کا مہینہ آتا تو گھڑی بیل (Passion Vine) کے پھولوں کا جادو سر چڑھ کر بولتا۔ پھول ہوں یا پھل، گرم مرطوب علاقوں میں پیشن ایک کریز ہے جو پھولوں اور پودوں سے محبت کرنے والوں کو لاحق ہوتا ہے۔ اسے یوں لگتا جیسے گہرے نیلگوں، جامنی آسمان کے بیچ دُودھیا ٹکی میں وقت اپنی گھڑی کی سوئیاں اوڑھ کر سو گیا ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خوش قسمت لوگ ہی گاؤں سے شہر جایا کرتے تھے۔ دنیا ہو یا دیہہ مگر خوش نصیب لوگ تو گنے چُنے ہی ہوتے ہیں۔ چچا اسمٰعیل کا شمار اُن معدودے چند لوگوں میں تھا جن کا شہر آنا جانا تھا۔ اُسے وسط پنجاب کے ایک چھوٹے گاؤں کے جنوبی محلے میں واقع اپنی چھوٹی سی دکان کے لئے سودا سلف کی خریداری کی خاطر شہر جانا پڑتا۔ اس بار تو شاید تین ماہ گزر گئے مگر وہ شہر نہ جا سکا۔ بڑی وجہ مون سُون کی بارشیں تھیں جن کے کارن گاؤں کے سارے رستے اور پگڈنڈیاں جوہڑ کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کاتک کے مہینے میں کھیتوں کھلیانوں کا پانی خشک ہوا اور بچی کھچی دھان کی فصلوں میں درانتی پڑی تو اسے بھی اپنی دکان کا خیال آیا جس کے ڈھکنا لگے ٹین کے ڈبے سوائے کھکھر بُورے اور گُڈی کے، خالی بھاں بھاں کرتے۔ اسمٰعیل کے شہر جانے کی سب سے زیادہ خوشی تو بیگے کو تھی جس نے دو اڑھائی مہینے پہلے ہی اُسے اپنے بیٹے کے لئے شہر سے نئی کیمی (CAMY) گھڑی لانے کی سائی دے رکھی تھی۔ چھ ماہ پہلے اس نے اسمٰعیل کے ذریعے شہر میں گھڑیوں والی دکان سے گھڑی کی قیمت کا پتہ کیا اور پھر اسے تین سو روپے جمع کرنے میں آدھا سال لگ گیا۔ اِدھر پیسے جمع ہوئے اُدھر موسمی بارشوں کی طویل جھڑی لگ گئی۔ اب جو اسمٰعیل نے شہر جانے کا عندیہ دیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے سائیں سے چوری اپنے چھوٹے بیٹے کو اصلی گھڑی خرید کر دینے کا وعدہ کر رکھا تھا، کاکے کے ابّا کو پتہ چل جاتا تو وہ اتنے پیسوں سے چھوٹی موٹی کٹی بچھی تو لے آتا پر گھڑی ہرگز نہ خریدنے دیتا۔ بڑی محبت تھی بیگے کو اپنے چھوٹے بیٹے سے۔ پتہ نہیں محبت تھی یا اس کے اندر کا خوف لیکن وہ اس کی کوئی فرمائش نہ ٹالتی۔ دراصل اس سے اُوپر کا چھلے ہی میں اللہ میاں کو پیارا ہو گیا تھا۔ ماں بتاتی تھی کہ اس کا بڑا بھائی پیدا ہوا تو بہت ہی خوبصورت تھا، ستواں ناک اور چڑی ہوئی موٹی آنکھیں، پیدا ہوتے ہی ٹکر ٹکر دیکھنے لگا، یہ بھی معجزہ ہی تھا، پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا، شاید کسی کی نظر لگ گئی یا کسی سُودک والی کا سایہ پڑ گیا۔ پیدائش کے تیسرے روز اس نے رونا شروع کر دیا اور ماں کے تمام حیلے، جتن کرنے کے باوجود بھی وہ ایک پل کو چپ نہ ہوا، یہاں تک کہ اس کا جسم نیلا ہو گیا اور وہ اللہ کا جی شام سے پہلے ہی اللہ کو جا پیارا ہوا۔ بیگے کو یوں لگا جیسے اس کا اکلوتا بھائی دِینو ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے پوہ کی سردی میں زمین کے ننگے فرش پر بیٹھی اس کی ماں کی گود میں مہاجر کیمپ کی ایک ویران شام دم دے گیا ہو اور اس کی ماں نے اسی فرش کو ایک بار پھر پھُوڑی بنا لیا ہو۔ اس دن کے بعد بچے کے رونے کا خوف اس کے دل میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اس کی کوشش ہوتی کہ کسی بھی طرح اس کا بچہ رونے نہ پائے۔

اب بھی، جب تلے کا یعنی اس کے مرنے والے بیٹے سے چھوٹا گیارہ سال کا ہو گیا تھا اور چھٹی کلاس میں دور پار کے گاؤں سائیکل پر پڑھنے جاتا مگر وہ ابھی تک اس کے رونے سے بہت ڈرتی تھی۔ وہ بیچاری اپنے خاوند اور دیورانیوں، جٹھانیوں سے چوری اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرتی مگر اب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کی فرمائش بھی بڑی ہو گئی، اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کی کلائی پر کیمی گھڑی بندھی دیکھی تو اپنی ماں سے ویسی ہی گھڑی دلانے کی فرمائش کر دی اور اس بیچاری نے چار و ناچار حامی بھی بھر لی۔ گھڑی دلا کر ماں نے جیسے ہمیشہ کے لئے وقت کو اس کی کنی میں باندھ دیا، ویسے ہی جیسے سکول بھیجتے وقت وہ بلوں والے پراٹھے اور اچار کی پھانک کو پونے میں باندھ کر اس کی سائیکل کے ہینڈل سے لٹکا دیتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد ہے جب پہلے دن گھڑی باندھ کر وہ سائیکل پر ساتھ والے گاؤں سے بھینس کے لئے تعویذ لینے جا رہا تھا تو ادھ راستے میں ہی اس نے گھڑی کلائی سے کھول کر جیب میں رکھ لی مبادا سائیکل کا ہینڈل بار بار ہلنے اور گھڑی چھنکنے سے اس کی مشینری خراب نہ ہو جائے۔ عمر کا یہی حصہ تھا جب اسے اپنے گرد وقت کی دوئی کا احساس ہوا۔ ایک وقت جو اس کے باہر یعنی اس کی کلائی پر گھڑی کی صورت بندھا تھا اور ایک وقت جس کے گھڑیال کی سُوئیاں اس کے دروں گھومتی تھیں۔ اس کے دماغ میں اندرونی طور ایک خودکار گھڑی فٹ ہو گئی تھی جو اسے ہمہ وقت جگانے، اُٹھانے اور بھگانے کے کام آتی۔ اس اندر کی گھڑی پر الارم بھی لگتا تھا، اسے جب جلدی جاگنا ہوتا تو وہ اپنے دماغ میں مطلوبہ وقت پر سوئیوں کی پوزیشن کا تصور کر کے سو جاتا اور پھر عین اس وقت فکرمندی سے ہڑبڑا کر جاگ جاتا، بعد ازاں عمر بھر اسے کسی ظاہری گھڑی پر الارم لگانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یہی وہ وقت تھا جب اسے اس کی سوچ کے حوالے سے اولیں بیماری لگی اور جس بیماری کا تعلق بھی وقت سے ہی تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وقت ہمیشہ ایک رفتار سے سفر نہیں کرتا بلکہ موسموں کے ساتھ اس کے گزرنے کی رفتار کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ پتہ نہیں یہ اس کا مشاہدہ تھا یا احساس مگر اسے یوں لگتا جیسے سردیوں میں وقت جلدی گزرتا ہے اور گرمیوں میں تاخیر سے۔ پھر اس نے اپنے احساس کو کسی خاص وقت سے منسوب کر کے دیکھا تو نتیجہ پھر وہی کہ سردیوں میں صبح کے آٹھ جلدی بج جاتے ہیں جبکہ گرمیوں میں دیر سے، پھر اس نے دیکھا کہ شام یا رات کے اوقات میں وقت کی رفتار اس کے متضاد ہے یعنی سردیوں میں رات کے آٹھ بہت دیر سے بجتے ہیں جبکہ گرمیوں میں بہت جلد۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ آخر چکر کیا

ہےاوراب تواس چکرنے اسے جیسے گھن چکر بنادیا تھا۔اس سے بھی بڑی مصیبت یہ تھی کہ فقط اسے ایسا محسوس ہوتا تھاجب کہ اس کے اردگرد کسی شخص کوایسا مسئلہ یا بیماری لاحق نہیں تھی۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں مگر گھڑیوں کی سوئیاں میکانکی ہونے کی بنا پر بظاہر سدا ایک ہی رفتار سے چلتی دکھائی دیتیں مگراس کے حساب میں وقت کی رفتار مختلف اوقات میں مختلف ہوتی۔ یہ بھی کہ گھڑی کی سوئیوں پر اثر انداز کششِ ثقل کا الگ سے کوئی مقیاس بھی نھیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر کوئی وقت کی کشتی کو اپنے دل کے سمندر کی سطح پر رواں دمتزلزل کھیناًمحسوس کرے اور وقت کی رفتار بارے فقط یہ نہ کہے کہ گرمیوں میں سورج جلد طلوع ہوتا ھے اور سردیوں میں تاخیر سے کہ یہ وقت کے سلسلے کی عام تر اور آسان ترین تاویل ہے۔

اب جبکہ رات اور دن چھوٹے بڑے ہوتے مزید پینتیس سال آگے کھسک گئے تو وہ ناسا کی آبزرویٹری میں بڑی دوربین کے پاس بیٹھا اپنے ماضی بارے سوچ رہا تھا، وقت کے ساتھ اس کی زندگی میں تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، ماں نہیں تھی اور کیمی کی جگہ ٹیگ ہیور، گرینڈ کریرا، ٹیسوٹ اور راڈو نے لے لی تھی۔ وہ زندگی بھر غور وفکر تیئں بہت مصروف رہا اور اسے اب صرف اپنی زندگی کے بڑے بڑے پڑاؤ ہی یاد رہ گئے تھے۔ پہلے گاؤں، پھر شہر، پھر کینیڈا اور پھر امریکہ۔ اسے اپنے آخری پڑاؤ میں آنے کے بعد غور وفکر کی دوسری بیماری لاحق ہوئی، اس بیماری کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ اچانک اس کی رُوح کو پھڑکا لگ جاتا اور وہ کچھ لمحوں کے لئے دور خلاؤں میں اُڑ جاتی۔ یوں تو پہلی بیماری بھی پریشان کُن ہی تھی مگر دوسری والی نے تو جیسے اسے ہلکان ہی کر دیا، اُسے یوں لگتا جیسے روح اُڑنے سے اس کا جسم خُلیہ خُلیہ ہو گیا ہو۔ وہ پہلے فکشن نگار تھا اور بعد ماہرِ فلکیات وکونیات۔ کاسمالوجی میں اس کی دلچسپی کا باعث دراصل اسکے فکشن کے تصورات وتخیلات ہی تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی امیجی نیشن کی قوت کے بل پر فکشن نگار ہی کو اعلیٰ سائنسی، ماورائی اور کائناتی تصورات کا موجد ہونا چاہیئے۔ یہ تو بعد کا معاملہ ہے کہ تجربہ وتحقیق کی کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد کوئی خیال نظریہ بن پاتا ہے یا نہیں پر نہ سوچنے سے خام سوچنا سو درجے ارفع ہے۔ اسے اس آبزرویٹری میں ملازمت اختیار کئے پانچ سال ہو گئے تھے اور یہ سوچ کر اس کے خشک ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا کہ اب اس کے ماحول میں فکشن کے تخیل کی اہمیت کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور کائنات کی وسعت وحرفت بارے کچھ لوگوں کو صرف سوچنے جیسے اہم کام پر مامور کیا گیا تھا۔ گیارہویں سمت والے ہوں یا گاڈ پارٹیکل والے یا پھر تخلیقی فکشن والے، سب ایک کنبے کی طرح دکھائی دیتے۔ آج وہ بہت خوش تھا، بظاہر پینتالیس سال کی رائیگانی کے بعد اسے اپنی پہلی بیماری میں افاقے کے آثار دکھائی دیئے، پتہ نہیں افاقہ تھا بھی کہ نھیں پر اسے ایسا محسوس ہوا۔ اب کی بار جب اس کی رُوح اُڑی تو یہ کوڑی لائی کہ بلیک ہول کے قُرب میں وقت کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے اور اس کی وجہ کششِ ثقل (GRAVITY) ہے۔ جیسے جیسے کششِ ثقل بڑھتی ہے ویسے ویسے وقت کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر ہم ایک گھڑی آسماں کی بلندی پر لٹکا دیں اور دوسری زمین کے پاتال میں رکھ دیں تو زمین کی گہرائی والی گھڑی کششِ ثقل زیادہ ہونے کی وجہ سے آسمان کی اونچائی میں دھری گھڑی سے سُست رفتار ہوگی، اسی طرح اگر ہم کسی بلیک ہول میں گر رہے ہوں تو ہم سیکنڈوں میں بھسم ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی ہمارا پیارا زمین پر بیٹھ کر ہمیں کائنات میں بلیک ہول کے اندر گرتا دیکھ رہا ہو تو اُس کے لئے ہم کھربوں سالوں میں بلیک ہول رسید ہونگے، تو پھر وقت کی رفتار بھلا ایک جیسی کہاں رہی، وقت کی رفتار ایک نہیں ہے! وقت کی رفتار ایک نہیں ہے! اس کا جی چاہا کہ وہ بھی، ارشمیدس کی طرح، واشنگٹن کی گلیوں میں ننگ دھڑنگ بھاگ نکلے۔

M. Phil. On poetry of Parvin Shere Report by Hasan Chishti Pakistan Abroad Chicago;

Miss Shabnam Parveen, a student of Jawaharlal Nehru University, Dehhi, is doing her M.Phil on "Parvin shere ki Shairi Ka Tanqeedi Jaiza" under the supervision of Professor K.M. Ekramuddin, former chair of National Council for Promotion of Urdu Language, Government of India.

Mrs. Parvin Shere, a Writer, Musician, Poet and Artist of international fame, lives in Canada. She has published two awarded books of poetry KIRCHIAN and NIHAL-E-DIL PAR SAHAB JAISE and one book of prose; CHAND SEEPIYAN SAMUNDARON SE. (Safar Nama, which was in the list of best seller at Minally Robinson book store. Winnipeg, Canada). All her publications are in Urdu with English translation and her related paintings. She has taken out 2 CDs. Of her poems in her own voice and her own music of Sitar.

اداس رنگوں کی بارش

منیرہ احمد شمیم
(اسلام آباد)

مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل جھکے ہوئے ہیں۔کالی گھنگھور گھٹا نے اندھیرے کی چادر اوڑھ لی ہے۔بارش اب ہوئی کہ اب۔۔۔ابھی سہ پہر ہی تھی مگر اندھیرا ایسا چھا گیا تھا جیسے رات ہونے والی ہو۔برسوں بعد آج وہی خوشگوار موسم کی سہ پہر ہے۔مارگلہ کی پہاڑیوں پر چھائے سفید، بھورے، سیاہ بادلوں میں خیالات ایک بار پھر اس کی جانب رواں دواں ہیں۔کبھی کبھی غیر محسوس انداز میں یادیں اُبھرنے لگتی ہیں نہ ہم اُنہیں آواز دیتے ہیں نہ کوئی اور انہیں دھکیل کر ہمارے سامنے لاتا ہے۔پھر بھی ہوا کے مدھم جھونکے کی طرح وہ خود بخود لہرا جاتی ہے۔

شاید وہ اب آسمان پر ستارہ بن کر چمک رہا ہوگا۔

ایسے ہی ساون نے اُسے مجھ سے جدا کر دیا تھا۔وہ پیار کے موسم کی طرح آیا اور چلا گیا۔اس کے جاتے ہی طوفان بادباراں۔۔۔شہر پر اتنا رویا کہ سیلاب آ گیا تھا۔وہ رات تو ختم ہوگئی اور صبح نے جنم بھی لے لیا۔۔۔لیکن وہ صبح رات سے زیادہ تاریک تھی کسی اندھے کی آنکھوں کی طرح ویران اور بے نور۔۔۔

میں نے برسات میں گرج گرج کر برسنے والے بادلوں سے تمہارا پتہ پوچھا۔۔۔سنسان راتوں کے اندھیروں میں تلاش کیا۔۔۔چمکتی ہوئی صبحوں سے تمہارا نام پوچھا۔۔۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے ہاتھوں تمہیں پریم پتر بھیجے۔۔۔مگر تم نہ آئے۔

بادل روتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گئے۔
دروازے سے لگی تمہاری آہٹ کی منتظر رہی۔

لیکن تم نے کہاں آنا تھا۔۔۔تمہارے جانے کے بعد موت کا فلسفہ میری سمجھ میں آ گیا۔اب جو کوئی تمہارا پوچھتا ہے تو میں اتنا کہہ کر چپ ہو جاتی ہوں کہ ''اس رات بارش بہت تھی۔''

تمہارے جانے کے بعد سناٹے کی ایک چادر پھیل گئی۔ایک اداسی میں رچا رونے کی کیفیت جیسا لمحہ۔۔۔جو پھیلتا چلا گیا اور اداسی سائبریا کی سردی کی طرح ماحول پر چھا گئی۔

انسان کی زندگی بھی کتنی ناپائیدار ہے۔زندگی کے اس سمندر میں انسان حباب کی طرح، پانی کے بلبلے کی طرح تھوڑی دیر کے لیے نمودار ہوتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔انسان موت کے سامنے کتنے بے بس اور مجبور ہے۔موت سارے لفظوں کا انت۔۔۔ساری آوازوں کا خاتمہ اور صداؤں کی وہ دیوار ہے جس کے آگے خاموشی کا ایک صحرا ہے جانے والے کو ہم چاہیں تو جتنی بھی آوازیں دیں لیکن بازگشت نہ سنائی دے گی۔

اس مختصر سی زندگی میں انسان کیا کیا کرتا ہے۔محبت کے آلاؤ جلاتا ہے، گناہ اور ثواب کے تانے بانے تیار کرتا ہے۔نفرت اور کدورت کے جہنم بھڑکتا ہے اور اس سارے کھیل کو زندگی کا نام دیتا ہے۔ساری عمر موت کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور یہی جدوجہد اُسے موت کے قریب تر کر دیتی ہے۔

وہ اپنی سرزمین کو چھوڑ کر پنجاب آ گیا تھا۔یہاں کے مناظر سے وہ لطف اندوز کچھ ایسا ہوا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔وہ مجھ سے روشنیوں، خوشبوؤں اور محبتوں کی باتیں کرتا۔اپنی زندگی اور گھٹن کے مسافت کے قصے سناتا۔

وہ ایک ایسا انسان تھا جس نے مجھے درد، خوشی، امید، ناامیدی اور بہت سے دوسرے گھمبیر جذبوں کی بھول بھلیوں میں گم اور مست کر رکھا تھا۔

جس کے بغیر اب ساری کائنات ایک خلا کی صورت نظر آتی ہے۔

آج جب میں اپنی زندگی کے گزرے ہوئے ان برسوں کو مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے کئی برس پہلے کی گزری ہوئی ایک سہ پہر یاد آتی ہے۔جب اسی طرح دوپہر کو اندھیرا پھیل گیا تھا۔مارگلہ کی پہاڑیوں پر سفید، بھورے اور کالے بادلوں کا ایک ہجوم تھا اور ہم دونوں ایک ساتھ تھے۔جب تک بارش شروع نہیں ہوئی ہم اسلام آباد کی سڑکوں پر یونہی ٹہلتے رہے۔ان لمحات نے ہمیں مسحور کر دیا تھا۔ہمیں اس کے سوا اور کچھ یاد نہ رہا۔۔۔بس یہ یاد تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ ہیں اور کبھی جدا نہیں ہونگے۔

اس ملاقات کی دھیمی دھیمی خوشگوار مہک میرے سارے وجود میں رچ گئی تھی۔وہ کتنا اثر انگیز۔۔بارش میں بھیگا ہوا خواب آلودہ دن تھا۔

خوشی کا وہ سیلاب کیا ایک دھوکا تھا؟ سوچ کا جلتا ہوا لمحہ قیامت برپا کر کے گزر گیا۔برسوں بعد اسلام آباد کی وہ سہ پہر ایک بار پھر لوٹ آئی ہے۔ساون کے بادل برسنے کو تلے کھڑے ہیں۔ابھی شام نہیں ہوئی۔۔۔مگر ہر سمت اندھیرا پھیل گیا ہے۔

مگر یہ کیسا ساون ہے جس میں بادل کی گونج بھی سنائی نہیں دے رہی۔نہ چھت پر بوندوں کے گرنے کی آوازیں۔۔۔نہ بارش کی پھوار۔۔۔

وہ دن تو کہیں معدوم ہو چکے ہیں۔۔۔گذرتے وقت کی ڈھیروں گردنے ان کو ڈھانپ لیا ہے۔وہ دن اب واپس نہیں آئیں گے۔مگر ماضی اپنی گہری چھاپ۔۔۔یاد کی صورت میں چھوڑ جاتا ہے جس کی گرفت سے آزادی ممکن نہیں۔

انسان کے پاس خوبصورت یادوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔وقت گزر جاتا ہے اور یادیں ستاروں کی طرح روشن رہتی ہیں۔کبھی یوں لگتا ہے جیسے تم میری زندگی سے باہر گئے ہی نہیں۔۔۔دنیا کے لیے یہ بات کتنی معمولی سی ہے کہ تم چلے گئے۔۔۔وہی شہر، وہی رونقیں، وہی لوگ اور وہی زندگی ہے۔لیکن تمہارے

''چہارسُو''

ایک نہ ہونے سے جیون کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔

اب نہ سورج ڈوبتا ہے اور نہ چاند مسکراتا ہے، نہ پھول کھلتے ہیں، پت جڑ ہو، بہار ہو یا بارش اور دھوپ ہو۔ زندگی کے رنگ بدلتے رہتے ہیں اور زندگی چلتی رہتی ہے۔۔۔ یادوں کے مقام بدل جاتے ہیں۔۔۔ یادیں نہیں بدلتیں۔ آسمان تو اب بھی مہربان ہے وہی نیلا آسمان جو رات کو ستاروں سے جگمگ جگمگ کرتا ہے۔ پھر ہم مایوس کیوں ہیں۔۔۔ دل ویران کیوں ہے؟ ہم دکھی کیوں ہیں؟

شاید اس لیے کہ دل میں جلنے والا امید کا دیا خاموش ہو گیا ہے۔۔۔ اب ہر سمت اندھیرا دکھتا ہے۔۔۔ اندر بھی۔۔۔ اور باہر بھی!

ہم سب زندگی کی شمع ہاتھ میں لئے فنا کی آندھی کے سامنے کھڑے ہیں۔ کیونکہ غم اور زندگی کی بے یقینی انسان کا مقدر ہے شاید دکھ اور درد کا اپنا کوئی مقدور نہیں ہوتا۔ کسی بھی پریشانی پر مہر بن کے ثبت ہو جاتے ہیں۔ کبھی منڈلاتی ہواؤں کے ساتھ ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں اور اس تلاش میں گہرے سمندروں کے پاٹ بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔

میں گھر کی دہلیز پر کھڑی۔۔۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر جھکے ہوئے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اپنے ذہن کے جنگل میں نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہی تھی۔

اداسی برف کی سِل بن کر مجھے دبوچنے لگی تھی۔

صحن میں بے برگ و بار تنہا پیڑ مجھے دیکھ رہا تھا۔

خزاں نے اس کے پتے بھی چھین لیے تھے۔ پتوں کی ننھی زبانیں کہاں تھیں۔ سب اداس تھے۔

بادل برسنے لگا ہے۔

''واپس اندر آ جاؤ۔''

میرے اندر سے آواز آئی۔

''یہاں کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ اندر آ جاؤ۔۔۔ بارش میں بھیگ جاؤ گی۔''

بارش کا پانی ہو یا۔۔۔ یادوں

اندر سے بھگو ہی دیتا ہے۔

بارشیں تو باہر ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن یادوں کے اس سمندر میں نہ جانے کتنے ہی زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔

تو آئے تو تجھ کو دکھائیں یہ ویراں ویراں لمحے
دل کو کیسے تڑپاتے ہیں گیت میں کیسے ڈھلتے ہیں

☆

جب موت ذبح کر دی گئی

آفاق کی انتہائی منظم اور پیچیدہ مافوق الحیات کیفیت جو اپنی بے مثال زینت کے باوصف بجائے خود تخلیق کا نادر طلسم ہے، اس کا شاہکار۔۔۔ انسان۔۔۔ جس پر خود خالق کو ناز اور افتخار تھا، اس نے اپنی اس عظیم مخلوق کے نمائندے کو اپنے کمال آفرینش کی نمائش کے لیے اس وقت کی موجود مخلوق۔۔۔ فرشتوں کے عظیم اجتماع کے سامنے ظاہر کیا اور فرشتوں کو اجازت دی کہ وہ انسان۔۔۔ آدم سے حسب مرضی سوالات کریں، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے، آدم کا علم ان کے علم سے زیادہ وسیع و وقیع ہے۔

آدم نے فرشتوں کے سامنے جو بیانات دیے ان کو سن کر فرشتے مبہوت اور متحیر رہ گئے۔ انہوں نے قبول کیا، اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے۔ اور اپنی مصلحت خود ہی سمجھتا اور جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بھی بتایا کہ وہ آدم کو روئے زمین پر اپنا نائب یا خلیفہ مقرر کرنے والا ہے، یہ اظہار یہ بجائے خود فرشتوں کے لیے حیران کن تھا، انہیں اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا تھا اس کے پیش نظر وہ جانتے تھے کہ آدم۔۔۔ انسان۔۔۔ زمین پر پہنچ کر فساد برپا کر دے گا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں اپنے اسی خیال کا اظہار بھی کیا۔

فرشتوں کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا۔

(جناب نقشبند نقوی بخاری کے ناول ''جب موت ذبح کر دی گئی'' سے اقتباس)

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، بھارت۔

○

حاملہ آوازیں

عثمان عالم
(راولپنڈی)

وہ کنواری تھی مگر حاملہ۔۔۔

ایسی حاملہ جسے آج دن تک کسی نامحرم نے آنکھ اُٹھا کر اور محرم نے اوڑھنی کے بغیر نہ دیکھا پھر بھی وہ کنواری تھی اور حاملہ۔۔۔

اِس بات کی خبر اُس بوڑھی ماں کو بھی نہ ہو سکی جس کے ساتھ رات کچھ فُٹ کی دوری پر وہ بستر ڈال کر سویا کرتی۔

اُس کی زندگی کے ماہ وسال پہاڑی پتھروں سے نکلتی انگور کی بیل کی مانند تھے جس پر کچے اور سبز دانے اپنی فطرت کے مطابق جوان ہوتے اور پھر پکتے، پکتے اور پکتے جاتے۔

جب اُنہیں کوئی 'اُتارنے' 'توڑنے' یا کھانے والا میسر نہ آتا تو اتنا پک جاتے کہ اُن میں سے رَس ٹپکنے لگتا اور اُس کی جوانی بھی غربت کی بیل پر اِتنی پک چکی تھی کہ اَب اُس میں سے رَس نکل نکل کر ٹپکنا شروع ہو چکا تھا۔

وہ درمیانے نین نقش والی لڑکی تھی۔ تعلیمی مدارج احسن طریقے سے طے کرنے کے بعد ایک سالہ سلائی کڑھائی کا کورس کر ڈالا۔

زندگی کے پُل پر وہ اِن شوخ اور دیدہ زیب لباس کے ساتھ اکیلے ہی آدھا سفر طے کر چکی تھی اور پُل کے نیچے پھیلا معاشی تنگی اور لڑکوں کی قحط کا لئی خطرے کے نشان سے اُوپر آ چکا تھا۔

گھر بیٹھے بیٹھے اُس کے اندر کی سیم اُس کے جسم اور کپڑوں پر اُترنے لگی اور وہ جسم اور کپڑوں کے خیال سے لاپرواہ ہوتی گی۔

وہ وقت دُور نہ تھا کہ اُس کے بدن کی دیوار پر پھری سفیدی، گھٹن اور سیم کے ٹکڑوں کی شکل میں اُتر اُتر کر گرتی پھر اُس نے گھر کے صحن میں محلے کے بچوں کو ٹیوشن دینا شروع کر دی۔

دوپہر ہوتے ہی بچے اپنے بھاری بھرکم بستوں کے ساتھ آنا شروع ہو جاتے اور شام ڈھلے گھروں کو واپس پلٹ جاتے۔

اُس کی دوستوں میں سے ایک وہ تھی۔ جو بڑی کپتی تھی۔ بولتی تو بولتی جاتی۔ ہنستی تو ہنستی جاتی۔ غصہ ہوتی تو پاس پڑی چیزیں اور کتابیں اُٹھا اُٹھا کر پھینکتی اور مارتی۔ اُسی کا اب اُس کے گھر آنا جانا باقی تھا۔

وہ بھی زندگی کے پُل پر آدھے سے کچھ اُوپر کا سفر اکیلے طے کر چکی تھی لیکن وہ چاہتی تھی باقی کا سفر کسی کی ہمراہی میں طے کرے۔ اور یہ اُس کا حق بھی تھا۔ مگر ایسی جو معاشی تنگی اور لڑکوں کی قحط کا شکار تھا۔ اُس کے لئے جبر بن چکا تھا۔

اُسی نے ثمینہ کو اُن آوازوں کے متعلق بتایا جن سے وہ پچھلے کچھ عرصے سے مخاطب تھی۔

وہ گھنٹوں اُن سے باتیں کرتیں، خود بہکتی، دل کو بہلاتی، اور اندر کے آتش کدے کو ٹھنڈا کرتی۔

ایک شام آسمان پر بادل جمع تھے ہلکی ہلکی میٹھی ہوا جسموں کے کُھلے پُوروں میں داخل ہو کر لطافت پیدا کر رہی تھی۔ چھت پر پڑے گلاب، موتیا، اور نیاز بُو مہکنے اور خوشبو دینے لگے بارش کی پُھوار خوشبودار پودوں کے پتوں پر جمی گرد اور آلودگی صاف کرنے لگی۔ صاف ستھرے پتے، ٹہنیاں اور پُھول ایک نئے وجود کی طرح ظاہر ہونے لگے۔

وہ بھی کسی ایسی ہی بارش کی منتظر تھی۔ جو اُس کے جسم کی ضرورتوں اور خواہشوں کی گرد کو جبر کی ندی میں بہہ دے۔

پھر اُسے اپنی دوست اور اُس سے مطلقہ آوازیں اور اُن سے منسوب باتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی دلفریب، میٹھی اور شیریں باتیں تھیں۔ جب وہ اُسے گھر آ کے سناتی تو اِس کی رَگوں میں ٹھہرا ہوا حبس کا موسم کسی خوشگوار احساس کے ساتھ چلنا شروع ہو جاتا۔

وہ پچھلے چند لمحوں سے چھت کی مغربی دیوار پر تھوڑی رکھے نیچے کھلے پلاٹ میں لڑکوں کو بارش میں بھیگتا اور کرکٹ کھیلتا دیکھ رہی تھی۔ اُنہی میں سے ایک وہ بھی تھا جو اُس کی آنکھ کی پُتلی میں آ بیٹھا تھا اور باقی کے اُس کے پیچھے دھندلے اور غیر نمایاں ہوتے گے۔

وہ بلے باز تھا جس کی بارش سے بھیگی ہوئی شرٹ ورزشی جسم کے ساتھ چمٹی جا رہی تھی۔ اُس کے کاندھے، سینے اور بازوؤں کے کٹ بڑے واضح اور نمایاں تھے۔

اُس نے ایک اُونچا شاٹ کھیلا اور گیند اُس کے چھت پر آ پڑی۔ اُس نوجوان کی آنکھیں ہوا کو کاٹتی ہوئی گیند کے تعاقب میں اُس سے ٹکرائی۔

اور یہ لمحہ۔۔۔

بس۔۔۔

یہ کچھ دنوں بعد کی بات ہے جب سورج اپنے جسم کی آگ زمین کے باسیوں پر برسا رہا تھا شام وہ چھت پر بالٹی پانی کی بھر لائی اور مگے کی مدد سے ایک ایک کر کے وہ چھت پر رکھے خشک پُودوں کو پانی ڈالنے لگی۔ پانی ڈالتے وقت اُسے احساس گزرا کہ سَدا بہار اور موتیا کے پودے کئی دنوں سے اُس کی طرح پیاسے اور خشک تھے۔ زخم حیات اور رات کی رانی کے گملوں کی مٹی اُس کے خیالات کی طرح سخت اور پتھریلی ہو چکی تھی اور کوار گندل کے سبز اور اُوپر کو اُٹھے پتے پیلے، نرم اور نیچے کو ڈھلک چکے تھے۔

کسی خیال کے مسمریزم میں وہ دیوار سے نیچے جھانکنے لگی۔ جہاں کچھ دن پہلے وہ بلے باز کسی منجھے ہوئے کھلاڑی کی طرح ہوا میں گیند اُچھالتا تھا۔

وہ اپنے خیالات کے گملے کی سخت مٹی کو جذبات اور احساسات کی گوڈی سے نرم کرنے لگی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے اپنی دوست کی بات یاد آئی۔ وہ کہتی تھی تم بھی اِن آوازوں کو مخاطب کر سکتی ہو۔ اپنی زندگی کی اندھیری شاہراہ پر چلتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ہم کلام کے جگنوؤں کو روشن کر سکتی ہو۔

مگر۔۔۔

وہ کیسے اِن نامحرم آوازوں سے ہم آواز ہو سکتی تھی۔ اُس کے دماغ کے سینے پر غیرت نام کی اوڑھنی اُس کی ماں کی جانب سے لپٹی تھی۔

وہ اِن میں آوازوں کے چھید کیسے لگا سکتی تھی؟

پھر۔۔۔

اُس کی دوست نے اُس کی اوڑھنی میں اِنہیں آوازوں کے کئی چھید خاموشی اور کبھی اُلھڑ بازی میں لگا دئے۔

اور وہ نوجوان بلے باز کو ذہن میں رکھ کر اُن آوازوں سے ہم کلام ہونا شروع ہو گی۔ ایسی سریلی اور مدھر باتیں جو کانوں کے پیالوں میں اُمرت گھول دیں۔ جن کے سحر میں راتیں بیت جائیں اور دن چڑھ جائے۔ شروع شروع کے حجابات آہستہ آہستہ بے حجابی میں بدلتے گئے۔

وہ برہنہ باتیں جو بغل میں لیٹی انجان ماں سے ہوتی ہوئیں۔ بیٹی کے کان میں جاتیں' کان سے دِل' دِل سے دماغ' دماغ سے جسم اور جسم سے رحم میں جا کر ٹھہر جاتیں۔

اُس کا تمام بدن پسینے سے تر بتر ہو جاتا۔ سانس کسی بد کے ہوئے گھوڑے کی مانند بھاگتا، جسم سورج میں پڑے لوہے کی طرح تپتا۔ یہ عمل کئی لمحوں تک جاری رہتا۔ پھر آوازیں معدوم ہونا شروع ہو جاتیں۔ جسم ڈھیلا پڑنے لگتا۔ منہ اور خشک ہوتے ہونٹ پانی کی طلب کرتے اور دماغ پر غنودگی چھانے لگتی۔

ساتھ بستر پر خراٹے بھرتی ماں جس کی کنواری بیٹی ہر رات اُس کی موجودگی میں کئی آوازوں سے جسمانی ملاپ کرتی اور وہ بے خبر جو بیٹی کو چار دیواری میں ڈال کر مطمئن تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ اُس کے رحم کا لئی خطرے کے نشان سے اُوپر آ گیا۔ وہ کنواری آنکھوں کے گرد حلقے ڈالے سارا سارا دِن چارپائی پر پڑی رہتی۔

یہ اُس دِن کی بات ہے کہ جب ایک دوپہر اُس کی ماں نے آ کر خبر دی کہ اُس کی اکلوتی دوست پچھلی رات گھر سے غائب ہے۔ یہ اُس کے لئے پریشان کن بات نہ تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ کچھ عرصے سے ایک آواز کے تعاقب میں تھی۔ اور وہ آواز اُس کے تعاقب میں، وہ اپنا حق لینا جانتی تھی۔ زمانے سے ،لوگوں سے، گھر والوں سے۔۔۔

اُسی رات جب چاند ہلکی نیلی روشنی اُس کے چہرے پر پھینک رہا تھا اور وہ اپنے کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے گورکھ دھندہ نما گلیوں میں آنکھ سے آوارہ گردی میں مشغول تھی تو اندھیرے میں اُنہی آوازوں کا ہجوم اُس کی جانب بڑھنے لگا اور اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ یہ ننگی آوازیں رات کے اس پہر شہر کے گلی کوچوں میں بے ترتیب تھور زدہ مکانوں میں مقیم لڑکیوں کے جسم کے ساتھ دیمک کی مانند چمٹی ہیں۔

بقیہ: جلتی ہریالی

گائیڈ نے بتایا تھا کہ یہ بدھی درخت تھا جسے سری لنکا والے لے گئے تھے۔ بھٹو صاحب دورے پر سری لنکا گئے اور اُنہیں بتایا گیا کہ یہ درخت ہم ٹیکسلا سے لائے ہیں۔ تو بھٹو صاحب وہاں سے ایک شاخ لے کر واپس آئے اور یہاں لگا دیا۔

ہم سب ایک چھتنار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ یقیناً گوتم بدھ کو اسی درخت کے نیچے گیان ملا ہو گا۔ اُس کا باپ تین سوالوں میں سے صرف دو سوالوں کا ہی جواب دے پایا تھا۔ کیا تم بادشاہ عام لوگوں کی طرح ہی پیدا اور مرتے ہیں۔ کیا تمام بادشاہ تینوں درجات سے گزرتے ہیں۔ بادشاہ نے تینوں سوالوں کا جواب دے دیا تھا لیکن آخری سوال کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ تمام بادشاہ عیش وعشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔ عام لوگ کیوں دکھ اذیت بھوک سہتے ہیں۔ باپ کا جواب نہ پا کر سدھارتھ گھر سے نکل کر جنگلوں میں نکل گیا۔ اور روشنی کی تلاش میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اللہ سے سوال کرنے لگا۔ آخر اُسے روشنی تو مل گئی لیکن اُس نے لوگوں کو سمجھایا ''دنیا دکھوں کا گھر ہے اپنی خواہشات کو محدود کر لو۔''

زمانے گزرتے گئے۔ بدھ بھکشیوں نے پربتوں پر بستیاں بنائیں۔ انسانی محبت میں اتنے ڈوب گئے ہر جاندار چیز بچانے کی کوشش کرتے۔ چاہے وہ سانپ بچھو ہی کیوں نہ ہو۔ صدیاں گزر گئیں آج برما میں وہ ہی بدھ بھکشو اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھانے کے لیے مسلم آبادی کو چن چن کر قتل کرتے گئے جو بچ گئے وہ سمندری میدان سے ڈرتے رہے۔ اُدھر اسلامی حکومتیں سونے کے کموڈ اور ہیرے کی کاروں کو عام کرنے کے لیے قانون پاس کر رہی ہیں۔ سونے کے باتھ روم بن رہے ہیں۔ شامی بچے ایلان جیسے لاکھوں بچے بھوک سے مر رہے ہیں۔ اسلام کے نام پر مسلمان مسلمان کو مار رہے ہیں۔

بدھا کا سوال آج بھی جواب مانگ رہا ہے۔ کہ اس دنیا میں لوگ ایک جیسی زندگی کیوں نہیں گزار سکتے۔ دنیا دکھوں کا گھر کیوں ہے؟

بدھی درخت کے پتے آہستہ آہستہ بین کر رہے تھے اور ہم واپسی کے لیے وہاں سے چل پڑے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ درخت آہستہ آہستہ جل رہے ہیں۔

تیسرا محلّہ

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

ہمارے ایک دوست کی رگوں میں آرام طلبی کچھ اس طرح گھر کر گئی کہ نوبت کمبل والے محاورے تک جا پہنچی یعنی وہ تو پلنگ چھوڑنا چاہتے تھے مگر پلنگ اُنہیں چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ کسی سیانے نے صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے دوست مذکور کو دو دونی چار کے دھندے پر لگا دیا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے دوست نہ صرف صاحبِ کرامات ہو گئے بلکہ ہانڈی گھما کر لوگوں کے گھروں بلکہ دل کا حال بھی بتانے لگے۔

آپ تو جانتے ہیں ہم ٹھہرے صدا کے آوارہ گرد، ہمارا کام ہی لوگوں کے گھروں میں تانک جھانک کرنا اور اُسے نمک مرچ لگا کر بیان کرنا ہے۔ آیئے! آج تیسرے محلے کی چوتھی گلی کے پانچویں گھر کی ٹوہ لیتے ہیں۔

☆

''اَئے میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں، گونگا ہو گیا ہے کیا؟'' صغریٰ چمٹا زمین پر مارتے ہوئے سیخ پا ہوئی۔ ''اَئے دیکھو، کیسا مگرا بنا بیٹھا ہے۔ اَئے اللہ مارے منہ سے کچھ تو پھوٹ، کہاں آئی توائی پھر کے آ رہا ہے۔ اور، وہ جو میں نے تجھ سے بتاشے منگوائے تھے، وہ جن کھا گئے یا بھوت؟''

''اری اللہ کی بندی کبھی تو اپنی جون میں رہا کر، ہر وقت لٹھ لے کر لونڈے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔'' صغریٰ کے شوہر نے خفگی کا اظہار کیا تو صغریٰ ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

''تم تو بیچ میں بولنا نہیں ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' لال پیلی ہوتی صغریٰ نے آٹے کا پیڑا پٹڑے پر مارتے ہوئے دھمکی دی تو اُس کا شوہر قدیر بھی آپے سے باہر ہو گیا۔

''بڑی آئی، مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا'' نقل اتارنے کے انداز میں ''ویسے تو تیری شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں نا''

''دیکھو فہیم کے ابّا! میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی، اس وقت میں اپنے لونڈے سے پوچھ رہی ہوں''

''جہیز میں لے کے آئی تھی؟''

''ہاں رے بول نا'' شوہر کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے ''اتنی دیر کہاں رہا، میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں گھُنّے؟'' فہیم کے بالوں کو مُٹھی میں پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے۔

''ابّا دیکھو ہر وقت امّاں میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں'' باپ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے۔

''ابے تو بک کیوں نہیں دیتا، کہاں دفان ہو گیا تھا؟''

''کہاں دفان ہو گیا تھا، جیسے خود نہیں جاتے'' منہ ہی منہ میں بُڑبُڑ کرتے ہوئے۔

''لو جی کر لو بات! اب تُو باپ کی برابری کرے گا، ہیں، باپ کی برابری کرے گا'' فہیم کی کمر پر دو ہتڑ مارنے کے بعد بیلن اٹھانے کو لپکتی ہے۔

''اری بس بھی کر بھلی مانس، کیوں جوان لونڈے پہ ہاتھ اٹھا رہی ہے۔''

''جوان لونڈا، اس کی جوانی تو میں ابھی چوٹیوں کے ذریعے نکالتی ہوں!'' منہ سے جھاگ نکلنے لگتے ہیں۔

''دیکھو امّاں میں بتائے دے رہا ہوں'' قمیض کے دامن سے ناک صاف کرتے ہوئے ''اگر تُم نے اب ہاتھ اٹھایا نا!''

''کیا کرے گا، کیا کرے گا بتا، ماں پر ہاتھ اُٹھائے گا، ماں پر ہاتھ اُٹھائے گا؟'' بیلن مارنے کو آگے لپکتی ہے تو شوہر درمیان میں آ کر بیچ بچاؤ کراتا ہے۔

''میں پوچھ رہا ہوں نا! بس کر، بس، جا، جا کے اپنی دوا کھا، خواہ مخواہ بلڈ پریشر بڑھا لیتی ہے سالی۔''

''خواہ مخواہ! اس کا مطلب ہے، اس گھُنّے نے کچھ نہیں کیا، اسے کچھ نہیں کہو گے اپنے لاڈلے کو جو اتنی دیر سے منہ میں گھُنگنیاں ڈالے بیٹھا ہے۔''

''چل بے چل، جلدی بتلا دے کہاں سے ایسی تیسی مارا کے آ رہا ہے؟''

''ابّا، وہ، میں، میں تو بتاشے لینے جا رہا تھا!''

''اچھا، پھر؟''

''وہ، وہ، اُنہوں نے آواز دے لی!''

''اُنہوں نے کہوں نے، کوئی نام پتا، ٹھکانہ بھی ہوگا نا اُن کا؟''

''میرا مطلب ہے!''

''دیکھ بے، دیکھ فہیم، اگر میرا میٹر پھِر گیا نا، تو تُو جانتا ہے میں غصّے کا کتا سؤر رہوں!''

''ابّا، وہ!''

''آگے بول، آگے''

''امّاں، وہ، میں، میں نا!''

''لو، سن لو، طوطا مینا کی کہانی، مَیں مَیں، اب بھونک بھی دے، تجھے پتا ہے نا کہ تیرا باپ!''

''اتنی دیر سے بتا تو رہا ہوں، وہ، خالہ فضیلت نے پان منگوائے تھے، وہی لینے گیا تھا''

''ہائے میں مَر گئی!'' پریشانی سے سر پکڑتے ہوئے۔

''کیا کہا بے، پھر سے کہہ؟''

☆

''ائے چکنے! کیا بات ہے، آج بڑی جلدی میں ہے؟'' دونوں ہاتھ مٹکا کر۔

''دیکھ حمیدہ! میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا ہے کہ مجھے چکنا نہ کہا کر، نہیں تو قسم خدا کی گھسیڑ کر رکھ دوں گا۔''

''ائے ہائے، آج تو بہت لال پیلا ہو رہا ہے؟ دھمکیاں ہی دیتا رہے گا'' گال پر چٹکی لیتے ہوئے ''یا کچھ کر کے بھی دکھائے گا! تجھ سے اچھے تو وہ ہیں، کہتے کچھ بھی نہیں اور کرتے سب کچھ ہیں'' منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اونچے گھر کی طرف اشارہ کر کے ''چل بہت ہو گئی مفت کی ٹُنٹنی'' ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ''جیب ڈھیلی کر، جیب۔''

☆

''کیا بات ہے میری جان! آج بہت پارہ چڑھا ہوا ہے، مار کھا کر آ رہا ہے یا جھاڑ؟''

''تُو تو جیسے کھاتا نہیں!'' کھسیانہ ہو کر۔

''چل چھوڑ، سچ سچ بتا، ہوا کیا؟''

''یار، وہ حمیدہ!''

''کیا کہہ رہا تھا، میرا مطلب ہے کہہ رہی تھی؟''

''چھوڑ یار! سالے نے موڈ خراب کر دیا۔''

''آپس کی بات ہے، حمیدہ کا دل آ گیا ہے تیرے اوپر!''

''اور کوئی بات نہیں کر سکتا تُو!''

''لو میری جان! اور بات کر لیتے ہیں، کل وہ ملا تھا، وہ، کیا نام ہے سالے کا، بَبّو''

''بَبّو؟'' تیوری پر بل ڈالتے ہوئے۔

''ابے ہاں بَبّو! وہی بھڑ بھونجوں کا لونڈا''

''اب کیا کھچلی ہو رہی ہے اُسے؟''

''قسم خدا کی، یہی، بالکل یہی بات میں نے اُس سے کی'' ہاتھ پر ہاتھ مار کر۔

''اچھا پھر!''

''پھر کیا یار! چکنا گھڑا ہے، چکنا گھڑا''

''ابے کہہ کیا رہا تھا؟''

''وہی کتّے کی ایک دُم، میچ رکھ لو، میچ رکھ لو، میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا، بیٹا! اب کے میچ کھیلے گے تو بَد کے، ورنہ نہیں''

''چل ٹھیک ہے، پھر ملیں گے''

''ابے سُن تو سہی!''

''اب کیا ہے؟''

''آج وہ ملی تھی!'' آنکھ مارتے ہوئے

''کون؟''

''وہی، تیری کتّو اور کون؟''

''چھوڑ یار! ابھی موڈ خراب ہے، پھر بات کریں گے۔''

''میری جان! سالی پہ ایسی ٹوٹ کے جوانی آئی ہے کہ قمیض کے ٹانکے بھی کھلنے لگے ہیں۔''

''شرم تو آتی نہیں بھابھی کے لیے ایسی باتیں کرتے!''

''لو بھئی اور سنو، بھابھی! واہ بیٹا واہ، اپنے منہ میاں مٹھو، بیٹا جی! بہت چالو مال ہے سالی، جس کا جی چاہے جو مرضی بنا لے، چابی ہونی چاہیے، چابی، سمجھ آیا، مال، میری جان مال!''

☆

''کسے بُلا رہی ہو خالہ، مجھے؟ اچھا اِسے، ئِینے، میرا مطلب ہے فہیم کو، لے بیٹا! سنبھل کے رہیو'' کنسنی میں کچھ کہتا ہے۔ ''کل رات کو ٹائم پر آئیو، بڑا زور کا گرم مصالحہ آیا ہے''۔

''گرم مصالحہ؟''

''ہاں گرم مصالحہ!'' ٹھمکا لگا کر سمجھاتا ہے۔

''ارے اِدھر تو آ، تُو تو ایسے ڈر رہا ہے جیسے میں تجھے کھا جاؤں گی!''

''نہیں خالہ، ایسی تو کوئی بات نہیں، میں ذرا امّاں کے لیے بتاشے لینے جا رہا تھا۔ آج جمعرات ہے نا، امّاں ولایت شاہ کے مزار پر جاتی ہے، جمعرات کے جمعرات''

''اچھا، اچھا! تُو صغریٰ کا پُوت ہے نا؟'' گال پر چٹکی لیتے ہوئے ''کتنے دنوں کے بعد دیکھا ہے تجھے، تُو نے تو بڑی جلدی رنگ روپ نکال لیا!''

''جی خالہ!'' گھبراتے ہوئے۔

''چل بتا! کیا کھائے گا؟''

''کچھ نہیں خالہ، میں ذرا وہ، امّاں، کے بتاشے''

''چلا جائیو، بتاشے لینے، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟'' گردن میں ہاتھ ڈال کر قریب کرتے ہوئے۔

''خالہ مجھے جانے دو، وہ امّاں کے، بہ، تا، شے!''

''ائے چلا جا، چلا جا، امّاں کے بتاشے لینے، میں کون سا روک رہی ہوں، میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں بتاشے لینے کے بعد، راجو کی دکان سے لے گا نا بتاشے!''

''جی خالہ، جی!''

''تو بس ٹھیک ہے، راجو کی دکان سے بتاشے لینے کے بعد، دین محمد پنساری سے آدھا پاؤ چھالیہ لیتا آئیو''

''وہ، خالہ، میں، امّی، کے!''

''ائے یہ مَیں، مَیں کیا لگا رکھی ہے، کتنی دفعہ بتلائے گا، امّاں کے بتاشے، امّاں کے بتاشے، واپسی میں خالہ کی چھالیہ لا دے گا تو کیا گھِس جائے گا؟''

''نہیں خالہ، ایسی تو کوئی بات نہیں؟''

''ائے لونڈے! ممیا کیوں رہا ہے، چھالیہ منگوا رہی ہوں، پوڈر تھوڑی منگوا رہی ہوں!'' بازاری مسکراہٹ کے ساتھ فہیم کے پیٹ میں کہنی مارتے ہوئے۔

''جی خالہ، لاؤ پیسے دو''

''لاؤ پیسے دو، دے رہی ہوں، پیسے دے کر منگواؤں گی، مفت تھوڑی منگواؤں گی!''

''جلدی دو پیسے''

''ائے یہ اللہ مارا، بٹوا کہاں کھو گیا؟'' تکیئے کے نیچے ٹٹولتے ہوئے ''ائے میں مرگئی، اوی اللہ، ہائے اللہ، اُچھل کود کرتے ہوئے''

''خالہ، خالہ، کیا ہوا خالہ؟''

''گن، کھجورا، گن کھجورا چڑھ گیا!''

''گن کھجورا؟''

''ہاں، گن کھجورا؟'' کمر پر دائیں بائیں ہاتھ مارتے ہوئے۔

''کہاں، کہاں ہے؟''

''یہاں!'' کمر کی نچلی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے''

''یہاں، یہاں، یہاں!'' جگہ بدل کر۔

''خالہ تُم نے تو پریشان کر کے رکھ دیا، کہیں بھی تو نہیں ہے!''

''ائے بچے، یہاں، ہاں، اوپر کی طرف!'' بغل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے۔

''یہاں، ہاں، آں، ذرا اوپر، بس، بس، تھوڑا اوپر، ہیں، یہ کیا کر رہا ہے تُو؟''

''میں، میں، میں تو خالہ، تم!''

''میں سب جانتی ہوں آج کل کے لونڈوں کو، عورت کو اکیلا دیکھا نہیں اور حرامی پن شروع!''

''نہیں خالہ، بالکل نہیں، قسم اللہ پاک کی، میں، میں تو!''

''چل، چل، زیادہ شرافت نہ جھاڑ، جلدی سے کنڈی لگا!''

''خالہ کیا کہہ رہی ہو تُم؟'' حیرانی سے منہ پھاڑتے ہوئے۔

''لگاتا ہے کنڈی یا بلاؤں صغریٰ کو!''

''خالہ، جیسی مرضی قسم لے لو، میں، میرا مطلب یہ بالکل نہیں تھا۔''

''تُو ایسے نہیں مانے گا!''

''خالہ تمہیں اللہ کا واسطہ!'' گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے منّت کرتے ہوئے۔

''ہائے! چچ، چچ، دیکھو تو سہی بچہ کیسے کانپ رہا ہے، ائے تُو تو خواہ مخواہ ڈر رہا ہے، میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آ بیٹھ'' ایک ہاتھ گلے میں ڈال کر دوسرے ہاتھ سے پیٹھ سہلاتے ہوئے ''شاباش، یہ ہوئی نا بات! باؤلا کہیں کا، تُو تو ایسے ڈر رہا تھا جیسے میں کوئی بھوتنی ہوں!''

☆

''تیری تو ماں کا۔۔۔ لکڑی اٹھاتے ہوئے، ابے مُردار باہر و باہر ہی آیا ہے، اندر تو نہیں گیا نا؟ مارنے کے لیے لکڑی ہوا میں بلند کر کے پھینک دیتا ہے۔ نہیں بھئی نہیں فہیم، جلدی سے بک دے، ورنہ آج تُو بچے گا، یا مَیں!''

''ہائے میرے اللہ، یہ تُو نے کس جرم کی سزا دے ڈالی؟ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کے وار کرتی ہے مگر اس چھینال کے منہ تو ایسا خون لگا ہے۔۔۔!''

پہلے تو صغریٰ کافی دیر فضیلت کی شان میں تبرّے پڑھتی رہی پھر فہیم کی طرف منہ کر کے وہ تمام گالیاں اور صلاوات بک ڈالیں جو پچھلے دنوں فہیم کے باپ کو بکی تھیں۔۔۔ ہکّا بکّا، فہیم حیرت سے کبھی ماں کی طرف دیکھتا تو کبھی باپ کی طرف۔۔۔!!!

بقیہ: قیدی نمبر ۲۳۴

''مان گیا وہ؟''

''ہوں۔ رقم دے کر کہہ دیا کہ باقی رہائی کے بعد دے دوں گی۔''

''میں تو کہتا ہوں ہمیں اتنی بڑی رقم پہلے نہیں دینی چاہیے تھی۔ اگر وہ چھُڑا نہ پایا تو یہ آخری پونجی بھی ڈوب جائے گی۔'' وشال نے دبے لفظوں میں اندیشہ ظاہر کیا۔

مگر اُسے رقم دینے کا کوئی ملال نہ تھا۔ اُسے نہ جانے کیوں یقین آ گیا تھا کہ وکیل سال کے اندر اندر اُسے رہا کروائے گا۔ وہ اپنی بات کا پکا لگ رہا تھا۔ وکیل کی چیل جیسی تیز طرّار آنکھوں میں چھپی ان کہی کہانی اُس کی چھٹی حس کو کچوکے دے رہی تھی مگر عزم کی پختہ لکیریں شکنوں کی صورت ماتھے پر نمایاں ہو کر اُس کے قدموں کو اعتماد بخش رہی تھیں، وہ آہستہ آہستہ لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وکیل کے دفتر سے باہر آئی اور چاروں اور نگاہ دوڑاتے ہوئے نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔

''خدا خیر کرے''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

سبز پرچم کا رہے مان، خدا خیر کرے
اِس کی دائم رہے یہ شان، خدا خیر کرے

کتنے مجبور تھے وہ کچھ بھی بتانے کے لیے
جان کر بھی رہے انجان، خدا خیر کرے

اپنے ہی گھر میں نظر آتے ہیں بیگانے سے
اپنے ہی گھر میں ہیں مہمان، خدا خیر کرے

عمر بھر جن کو گوارا نہ ہوئے ہم لیکن
اَب وہ آئے ہیں پشیمان، خدا خیر کرے

کر چکے ہیں تو خدارا نہ اُنہیں جتلائیں
کس قدر یاد ہیں اِحسان، خدا خیر کرے

ایک ہی ذات ہے اور سجدہ اُسے واجب ہے
ہو وہ بھگوان کہ رحمٰن، خدا خیر کرے

○

سیفی سرونجی

(بھارت)

دشمن ہمارے سامنے ہر دم اگر رہے
لازم ہے اس کے داؤ کی ہم کو خبر رہے

چھونے لگا ہے آسماں ہر شخص ہی آجکل
لیکن ہے ہم سے شرط زمیں پر نظر رہے

مانا حسنِ خواب میں بیٹھے بھی ہیں مگر
گاڑی نکل ہی جائے گی سوتے اگر رہے

دھوکا فریب جھوٹ سیاست قدم قدم
پھر بھی ہے تم کو شکوہ دعا میں اثر رہے

اک پل بھی مجھ سے دور نہ رہتے تھے تم کبھی
لیکن ملے ہو آج کہاں تھے؟ کدھر رہے؟

سیفیؔ فضا میں اڑنے کا انجام کچھ نہیں
غالبؔ رہے نہ حالیؔ نہ باقی ظفرؔ رہے

○

کرنل سید مقبول حسین

(راولپنڈی)

ماہِ تمام تیرا مقدر خراب ہے
یہ رات پچھلی رات سے بڑھ کر خراب ہے

اس میں تیری جفا کا نہیں ہے کوئی قصور
لگتا ہے جیسے میرا مقدر خراب ہے

آنکھیں خراب تھیں تو یہ منظر تھا پُر بہار
آنکھیں ہوئی ہیں ٹھیک تو منظر خراب ہے

پتّے گرائیں یا کہ جڑوں سے اکھیڑ دیں
اک گھونسلہ ہمارے شجر پر خراب ہے

مہنگا پڑا ہے عشق کسی سنگ زاد سے
سر پھوڑنے چلا ہوں تو پتھر خراب ہے

مقبولؔ زاویہ ہی غلط تھا اُڑان کا
پنچھی سمجھ رہا ہے کوئی پَر خراب ہے

○

کرشن پرویز

(روپڑ، بھارت)

جولوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں بس گئے — مٹی کی سوندھی خوشبو ہوا کو ترس گئے
محدود ہو کے رہ گئی کمروں میں زندگی — دلان دیوڑھی کھُلی چھت کو ترس گئے
کُولر تلے وہ بیٹھ کے کھانے لگے ہوا — پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں ہوا کو ترس گئے
الفت خلوص بھرے ریاکار بن گئے — نفرت کا ناگ ان دلوں کو ہیں ڈس گئے
کولر فریج اوون کے محتاج ہو گئے — چولہے کی نرم گرم وہ روٹی ترس گئے
وہ ماں کے گہنے بیچ کے پردیس تھا گیا — آیا نہ پھر وہ لوٹ کے کتنے برس گئے
پرویزؔ شور برپا تھا برسات کا مگر — صحرا میں جا کے اٹھے جو بادل برس گئے

○

تصور اقبال

(اٹک)

اُن کو بھول کے زندہ ہوں — خود سے بھی شرمندہ ہوں
مجھ ایسا دنیا بھر میں — میں ہی اک باشندہ ہوں
آپ چلائیں حکم سدا — میں تو اک کارندہ ہوں
آپ تو ماضی کہتے ہیں — لیکن میں آئندہ ہوں
میں نے کس کا خون کیا؟ — کیا میں ایک درندہ ہوں؟
کتنا روشن چہرہ ہے — چاند سے بھی تابندہ ہوں
جس نے سوز کو ساز کیا — میں ہی وہ سازندہ ہوں
اپنا وعدہ توڑ کے میں — آج بہت شرمندہ ہوں
خود سے پوچھ تصورؔ تُو — تجھ بن کیسے زندہ ہوں

○

نوید سروش

(میرپور خاص)

رفیقوں میں جو اپنا پن نہیں ہے — کوئی محفل میں کیا دشمن نہیں ہے
میں اپنے آپ میں الجھا ہوا ہوں — مجھے تجھ سے کوئی الجھن نہیں ہے
اُترتے کب ہیں، اُس گھر میں پرندے — کہ جس گھر میں کوئی آنگن نہیں ہے
دیے ماضی کے بجھتے جا رہے ہیں — کہ مستقبل بھی اب روشن نہیں ہے
درِ دل وا کیے بیٹھا ہوں میں تو — چلے آؤ جو کچھ قدغن نہیں ہے

○

نعیم الدین نظر
(میرپورخاص)

چل رہے ہیں وہ گھر میں ڈر ڈر کے
فرش سارے ہیں سنگِ مرمر کے

آپ ہی آپ جھک گئیں پلکیں
اس کو دیکھا نہیں نظر بھر کے

پھٹ چکی ہے انا کی چادر بھی
تھک گیا ہوں سوال کر کر کے

پھر سے غاروں میں چھپ گئی چڑیا
شہر کے حادثات سے ڈر کے

دن نشیب و فراز میں گذرا
رات کاٹی خدا خدا کر کے

کیسے فٹ پاتھ پر وہ سوئیں گے
جو کہ عادی ہیں نرم بستر کے

کس کے قدموں کی آہٹوں سے نظرؔ
چونک اٹھتے ہیں بام و در گھر کے

منظور ثاقب
(فیصل آباد)

مخدوش اس لیے مرے دل کا نگر ہے آج
(سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج)

وہ شام کے دھندلکے سے تو مختلف نہیں
صحنِ وطن میں جو مرے رنگ سحر ہے آج

اہلِ وطن کی آنکھ میں بھی معتبر تو ہو
ایوانِ اقتدار میں جو معتبر ہے آج

ممکن ہے استوار ہو کوئی بنائے نو
دنیائے ہست و بود کہ زیر و زبر ہے آج

ایوان ہائے سر بہ فلک کی الٰہی خیر
ارضِ وطن کا ہر جواں آشفتہ سر ہے آج

لگتا ہے بے قرار ہے منزل ترے لیے
تیرے لہو میں جس قدر ذوقِ سفر ہے آج

اس کی جڑوں کا بھی نہ ملے گا نشان کل
بے چینیوں کا نخل کہ جو بارور ہے آج

کردار کے جلو میں یہ پھیلے گی بے حساب
خوشبیوں کی داستاں جو بڑی مختصر ہے آج

وِشال کھُلّر
(لدھیانہ، بھارت)

سورج کے ساتھ ساتھ چلا روشنی سا میں
تارے اُگا رہا تھا، ہوا زندگی سا میں

اس کے وجود سے تو انائیں تمام ہیں
ورنہ دیارِ فن میں کہاں آدمی سا میں

رُکتا نہیں ہے چلتا ہے جب بھی یہ قافلہ
ملّت کے آئینے سے لگا تیرگی سا میں

اب بھی اداسیوں میں نمایاں ہوں رات دن
لبریز خواہشوں سے ہوا بے بسی سا میں

کتنی مٹھاس تھی ترے لب کی مٹھاس میں
مدّت ہوئی ہوا ہوں تری خامشی سا میں

اک تان پر ہے دونوں کے ہونے کا مرحلہ
تُو راگ ہو گیا تو ہوا راگنی سا میں

○

''چہارسُو''

سلیم ناز

(کراچی)

(ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال کے مصرعہ طرح پر لکھی گئی)

''امروز کی شورش کو اندیشۂ فردا دے''

امروز کی شورش کو اندیشۂ فردا دے — اس خوابِ پریشاں سے وجدان کو چونکا دے
طوفان بھی دم توڑے موجوں کا بھی خم نکلے — ٹوٹی ہوئی کشتی کو منجدھار سے لڑوا دے
یہ علم و ہُنر اپنے گُم گشتہ خزانے ہیں — جس قوم کا ورثہ ہے، اُس قوم کو لوٹا دے
رکھی ہے شہادت میں مسلم کی بقاء تُو نے — پھر خونِ مجاہد سے اس قوم کو نہلا دے
وہ ہیبتِ ایمانی طاغوت کی روباہی — ہے۔خوابِ کہن لیکن اس خواب کو دہرا دے
مرغانِ چمن چہکیں ہر شاخ پہ گُل مہکیں — تزئینِ گلستاں کی ہر دل کو تمنا دے

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

کوئی راحت سدا نہیں رہتی — ایک رُخ پر ہوا نہیں رہتی
جب خزاں و زیاں کا موسم ہو — صحنِ گلشن صبا نہیں رہتی
عالمِ یاس و بے قراری میں — یاد کوئی دعا نہیں رہتی
آدمی آدمی نہیں رہتا — آنکھ میں جب حیا نہیں رہتی
جس کا بارِ کرم ہو شانوں پر — یاد اُسکی جفا نہیں رہتی
جس کو خوفِ حساب و پُرسش ہو — اُس کے سر میں ہوا نہیں رہتی
ایک پل بھی نہیں ہے ایسا جب — ساتھ ماں کی دعا نہیں رہتی

شفیع ہمدم

(فیصل آباد)

چو رستے پہ کھڑا جو سوچتا ہے — وہی رستہ جو گھر کا کھو چکا ہے
اگرچہ وصل میں لذت بہت ہے — جدائی کا مگر اپنا مزا ہے
شکایت وہ بھی میری کر رہے ہیں — مجھے جن سے تغافل کا گلا ہے
جو مجھ سے بات تک کرتا نہیں ہے — مجھے اک بات اس سے پوچھنا ہے
وہ محتاجِ دوا ہوتا نہیں ہے — مریض شوق کی کتنی اَنا ہے
تعلق تجھ سے اتنا رہ گیا ہے — ترا جو ہے خدا میرا خدا ہے
مثالِ قیس گردش میں ہے سورج — کوئی اس کا بھی ہمدم کھو گیا ہے

○

شبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور، بھارت)

جب دل جلا تو گھر میں ذرا روشنی ہوئی
دیکھا مکان خالی تو شرمندگی ہوئی

جن میں ہمارے قتل کے رکھے ہیں کاغذات
ان فائلوں پہ دھول بہت ہے جمی ہوئی

رکھتا ہے دل کے ساز پر وہ انگلیاں غلط
اکثر ہمارے گیت کی لے بے سری ہوئی

کچھ ایسے فکر کرنے لگے زندگی کی ہم
جس کسی غریب کی لڑکی بڑی ہوئی

اب تک ہے میرے واسطے غم کا سبب شفیقؔ
کہنا کسی کا آپ سے ملکر خوشی ہوئی

○

سبیلہ انعام صدیقی

(لاہور)

اتنا بھی اُن کو حد سے گزرنے نہیں دیا
سانپوں کو آستین میں پلنے نہیں دیا

جس نے بُرا کِیا مرا ، اُن کا بھلا کِیا
ہر حال میں ضمیر کو مرنے نہیں دیا

یوں خواب ،آس ،پیار کے گل رنگ اُسے دیئے
مغموم دل میں یاس کو پلنے نہیں دیا

صدقے ہے زیست جس شجرِ سایہ دار کے
اُس محورِ حیات کو کٹنے نہیں دیا

آنسو سے جس نے زیست کے اوراق بھر دیئے
تحریر اُس نے درد کو کرنے نہیں دیا

لفظوں کے تیر نے مجھے گھائل بہت کِیا
وہ زخم پائے دل نے کہ ہنسنے نہیں دیا

یوں زندگی گزاری بہت احتیاط سے
یادوں کی کرچیوں کو بکھرنے نہیں دیا

سب سے الگ تھلگ رہی یوں اُس سے لو لگی
درویش دل سبیلہؔ بھٹکنے نہیں دیا

○

شریف شیوہ

(لاہور)

آنکھوں میں لہو دل کا اُچھل جائے تو اچھا
سیلاب کا ریلا ہے نکل جائے تو اچھا

رہنے دو رہِ شوق سے پتھر نہ ہٹاؤ
ٹھوکر سے اگر کوئی سنبھل جائے تو اچھا

اُن پر نہ کُھلے کاش بھرم میرے جنوں کا
اُن تک نہ اگر میری غزل جائے تو اچھا

ہیں راستے رُوپوش بڑا گھپ ہے اندھیرا
ایسے میں دِیا کوئی بھی جل جائے تو اچھا

وہ شوخ جو جانے پہ مصر ''آج'' ہے شیوہؔ
حالات بنیں یوں کہ وہ ''کل'' جائے تو اچھا

○

پسِ اشک

(ناول کا ایک باب)

انِل ٹھکّر

(ہَیلی، بھارت)

ہَیلی میں دیوان صاحب کے رسوخ سے مرزا کو بھنڈواڑ یہیں کی پتھر پھوڑ گلی میں رہنے کا ٹھکانہ تو مل گیا۔ گھر کا قفل کھولتے ہوئے مرزا نے سوچا۔ قسمت نے انہیں کہاں لا کر پٹکا ہے!! یہاں کسی گھر میں نہ آنگن ہے نہ پچھواڑا۔ مکانوں کی دیواریں ایک دوسرے سے ایسے مس ہو رہی ہیں جیسے کسی پیر، اولیاء کی درگاہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم جما ہوا ہو۔ انہوں نے اپنے احساس کا ردِّعمل ظاہر نہیں ہونے دیا۔ قفل کھول کر کُنڈ نکالی۔ کواڑ کھُلنے تک نغمہ نے اطراف میں نظر گھما کر دیکھا اور ناک بھوں سکوڑی۔ ایک دوسرے سے لپٹے کالے ٹوگیلو والے مٹی کے کچّے گھروں کو دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے گھر کے مالک گندے برتنوں کو دھو کر سُکھانے کے لیے کھلے میں رکھ دیا ہو۔ اس سے قبل وہ دو مرتبہ ہَیلی آئی تھی۔ پہلی بار ماموں کے بیٹے کے ختنہ میں شریک ہونے اور دوسری مرتبہ ایک نکاح میں شرکت کرنے۔ اس وقت وہ کم عمر تھی اور اب اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔ مرزا کی بیگم نے کوچہ میں قدم رکھا کہ کھِل اٹھیں۔ انہوں نے اپنا خوش گوار بچپن اور جوانی انہیں محلوں میں گزارے تھے۔ ایسی گلیوں میں ہی سہیلیوں کے ساتھ لنگڑی کھیل کر جوان ہوئی تھیں۔ ایسے ہی ایک گھر میں ان کے ہاتھوں میں مہندی رچائی گئی تھی۔

مرزا نے کواڑ کھولا۔ سب گھر میں داخل ہوئے۔ دروازہ کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ جس کی چھت پر ٹین کی چادریں ڈالی گئی تھیں۔ دائیں جانب کا حصّہ کھلا تھا۔ اس کے کونے میں ڈھلان لیے چھوٹا چبوترا کپڑے دھونے کے لیے بنایا گیا تھا۔ باقی کچھ حصّہ برتن دھونے کے لیے تھا۔ سامنے کی دیوار کو لگ کر لمبا چبوترا تھا۔ شاید گھر کی عورتوں کے بیٹھنے یا غلہ پھٹکنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ دو پائیدان چڑھ کر ایک اور دروازہ تھا جو ایک اونچے کشادہ کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کی چھت پر لال کویلو لگے ہوئے تھے۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ جس کے باہر دائیں جانب باورچی خانہ اور اس کے روبرو غسل خانہ جس کی دو طرف کی دیواریں اور دروازہ لکڑی کے تختوں سے بنائے گئے تھے۔ آگے کونے میں بیت الخلاء اور اس کی بغل میں پیچھے کی گلی میں کھلتا دروازہ۔ دروازے کے دوسری طرف خستہ حال لکڑی کا زینہ جو اوپر کے چھوٹے کمرے کو جوڑتا تھا۔ پورے گھر میں ہوا کے کھیلنے کے لیے ایک ہی کھڑکی، بڑے کمرے میں تھی۔

دوسرے روز فجر کی نماز پڑھ کر گھر لوٹنے کے بعد مرزا باہر کے کمرے میں اپنا شفاخانہ تیار کرنے لگے۔ الماری کہاں رکھی جائے، میز اور کرسیاں کیسے، کس سمت میں رکھی جائیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے ہر چیز اس موافق رکھنے لگے۔ بیگم نے باورچی خانہ سجانا، سنوارنا شروع کر دیا۔ چھوٹا سا باورچی خانہ، تنگ دائرہ، برتن بھانڈے ترتیب سے لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس آشفتہ حالی اور گڑبڑاہٹ میں ان کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر گرا۔ برتن گر کر ٹوٹا تو نہیں البتہ برتن کی کھنک سے نغمہ کی نیند ٹوٹ گئی۔ جگہ بدلنے سے پچھلی رات نغمہ نے کروٹیں بدل بدل کر رات گزاری تھی۔ تیسرے پہر اس کی آنکھ لگی تو اب برتن کے چھنا کے نے اسے بیدار کر دیا۔ چونک کر آنکھیں کھولیں۔ دیکھا دن نکل آیا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی، بدن کو توڑا۔ جسم سے لحاف ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بستر لپیٹ کر ایک طرف رکھا۔ غسل خانہ میں جا کر منہ پر چھینٹے مارے۔ کُلی کی اور باورچی خانہ میں جھانکا۔ ماں کو اپنے کام میں دیکھا تو باہر کے کمرے کی جانب گئی۔ وہاں ابّو اپنے کام میں محو تھے۔ باہر کے دروازے کی منڈیر پر دو تین کوّے نیچے احاطے میں جھانکتے ہوئے جھٹن کی تلاش میں کائیں کائیں کرتے نظر آئے۔ احاطہ میں کھانے جیسا کچھ نظر نہیں آیا تو شور مچاتے ہوئے اُڑ گئے۔ ہر صبح بُلبل کی شیریں آواز سننے کی عادی نغمہ کے کانوں میں کوؤں کی کائیں کائیں نے خلل ڈالا۔ اتفاقاً اسے کل رات ابّو کی کہی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا تھا ''اپنے گھر کی پچھلی گلی میں لڑکیوں کا اردو پرائمری اسکول ہے۔'' لڑکیوں کے لیے علیحدہ اردو اسکول!! رات کے اندھیرے میں تو اسکول دیکھنے کی خواہش کو اس نے دبا لیا تھا مگر اب وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ وہ پلٹی تیزی سے پچھواڑے کے دروازے پر پہنچی۔ کواڑ کھولے، وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اضطرابی نے اسے گھیر لیا، یہ کیا؟!! وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی۔

پچھواڑے کی چھوٹی سی تنگ گلی کے ایک سرے سے دوسرے موڑ تک اسکول کے احاطے کی دیوار اپنا وجود پسارے ہوئے تھی۔ دیوار کو لگ کر محلے کے بچّے اپنے بدن کا آنگن اور پچھواڑا کھلا رکھ کر ایک قطار میں بیٹھے غلاظت کر رہے ہیں۔ تبھی ایک بچہ اٹھا۔ دوڑ کر اپنے گھر کے دروازے پر گیا جہاں اس کی ماں پانی کا لوٹا لئے کھڑی تھی۔ ابھی وہ بچہ ماں کے پاس پہنچا نہیں کہ دو، تین ڈُکر اس گندگی پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں آنے والے بچّے کے لیے جیسے جگہ صاف کر کے ایک طرف ہٹ کر فرمانبردار خدمت گاروں کی طرح ٹھہر گئے۔

نغمہ نے پھٹاک سے کواڑ بند کر لیں اور پسا ہوا کوئلہ اور نمک لے کر دانت صاف کرنے بیٹھ گئی۔

نئے گھر میں آج پہلا دن تھا۔ تینوں اپنی ضرورت کی چیزوں کی آرائش میں مصروف تھے۔ نغمہ بڑے کمرے کے ایک کونے میں اپنے پڑھائی کی میز پر کتابیں قرینے سے رکھتے ہوئے خوش تھی۔ اس نے سوچا یہاں قندیل کی روشنی سے تو چھٹکارا مل گیا۔ یہاں تو بٹن دباؤ کہ بجلی کی روشنی پورا کمرا روشن کر دیتی ہے۔ نہ قندیل میں تیل بھرنے کی جھنجھٹ نہ قندیل کا شیشہ صاف کرنے کی

''چہارسُو''

زحمت۔ جب جی چاہا بٹن دباؤ، پڑھائی شروع۔ تبھی باہر کے دروازے پر گنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ مرزا اپنے کام کو بالائے طاق رکھ کر باہر آئے۔ دروازہ کھولا سامنے دیوان صاحب کو اپنے چھوٹے پوتے سہیل کا ہاتھ تھامے کھڑا دیکھا۔ دونوں نے سلام پیش کیا۔ مرزا نے آگے بڑھ کر اپنے سُسر کا ہاتھ پکڑا اور احتیاط سے انہیں اندر لے آئے۔ تب تک مرزا کی بیگم بیٹھک کی چوکھٹ پر آ گئیں تھیں۔ انہوں نے اپنے والد کو دیکھا تو خوشی سے آگے بڑھ کر ان کے قریب آئیں۔ کہا:

ابّا، آپ نے صبح صبح آنے کی تکلیف کیوں لی؟

دیوان صاحب نے اپنے پیچھے ٹھہرے پوتے کی جانب مڑ کر اس کے ہاتھ سے کپڑے میں لپٹا توشہ لیا اور بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

تمہاری امّی نے بھیجا ہے، ناشتہ ہے۔ کیا ہے۔ آج دونوں وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔

بیگم توشہ لے کر اندر گئیں۔ سہیل بیٹھک میں نغمہ کے پاس چلا گیا۔ مرزا اپنے سُسر کو باہر کے کمرے میں اپنا شفا خانہ دکھانے لے آئے۔ وہ جڑی بوٹیوں پر اپنی تحقیق کے سلسلہ میں کچھ کہنے جا رہے تھے کہ نغمہ ہاتھ میں لوٹا لے کر آئی، کہا۔

ابّو، امّی نے کہا ہے دودھ لا دیں چائے بنانی ہے۔

مرزا اٹھے، نغمہ سے لوٹا لیا دیوان صاحب بولے۔

چلو میں بھی چلتا ہوں، یہیں قریب میں ہے۔

دونوں گلی میں اُترے۔ دو تین گھروں کو پار کر کے بائیں مڑے۔ دیوان صاحب نے ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ وکیل صاحب کا گھر ہے، بڑے نامور ہیں۔''

مرزا نے دیکھا۔ گھر محلے کے دوسرے گھروں سے کچھ بڑا اور دبدبہ لئے نظر آیا۔ وہ آگے بڑھے تو راستے کے کنارے نالی کے پاس ایک بڑا چولہا نظر آیا۔ اس پر بڑی کڑاہی رکھی ہوئی تھی۔ چولھے کی آگ ٹھنڈی تھی۔ گھر کے چھپرے میں رسّی پر رنگا رنگ کپڑے سوکھنے کے لیے ٹنگے ہوئے تھے۔ وہاں ایک گٹھیلا شخص لنگی بنیان اور سر پر تاج پہنے، آنکھوں میں سُرمہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیوان صاحب کو دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔ دیوان صاحب نے سلام لیا تو اس نے پوچھا۔

مولوی صاحب، آج صبح صبح آپ اس طرف؟

ہمارے داماد یہاں آپ کے محلے میں رہنے آئے ہیں۔ انہیں دودھ کا بازار دکھانے لے جا رہا ہوں۔

آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں، یہاں بیٹھئے۔ لونڈے کو بھیج کر منگوا لیتے ہیں۔ دیوان صاحب جواب دیتے ہوئے آگے بڑھے۔ ''نہیں بھائی۔ ایک مرتبہ یہ دیکھ لیں تو آگے آسانی ہوگی۔ وہ گھر ریلوے اسٹیشن سے آنے والی سڑک کے نکڑ پر تھا۔ بائیں جانب مسجد اور سامنے کی طرف کھُلا میدان سا تھا۔ راستہ عبور کرتے ہوئے دیوان صاحب نے کہا۔

یہ رنگ ریز ہے۔ ویسے رنگ ریزی کا کام زیادہ تر اس کے اہلِ خانہ اور بچے سنبھالتے ہیں۔ اسے خود کو پہلوانی کا بڑا شوق ہے۔ اپنے ہنر میں اسنے بڑا نام کمایا ہے۔ دُور دُور سے کُشتی لڑنے بلایا جاتا ہے۔

وہ سڑک پار کر کے کھُلی جگہ پر آ گئے۔ مرزا نے دیکھا، اس میدان نما جگہ پر بہت سارے گوالے بھینسیں لیے قطار میں بیٹھے تھے۔ کوئی دودھ نچوڑ رہا تھا کوئی گاہک کے ساتھ مول تول کر رہا تھا تو کوئی گاہک کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ تبھی ایک نسوانی آواز آئی۔

میاں جی، آیئے۔

دیوان صاحب نے دیکھا ایک بوڑھی گوالن ان کو بُلا رہی ہے۔ وہ اس کے پاس گئے اور پوچھا ''کیسے دیا؟''

دو آنا سیر۔

یہ کیا؟ پچھلی بار آیا تھا تب تو ڈیڑھ آنا سیر تھا۔

کیا کریں صاحب۔ ہر چیز مہنگی ہوگئی ہے۔ دال، چاول تو مہنگا ہوا ہی ہے جانور کا چارا بھی آکاش چھو رہا ہے۔ کتنا دوں؟

آدھا سیر۔

بوڑھیا نے چارے کی ٹوکری بھینس کے قریب سرکائی۔ برتن میں رکھے پانی سے بھینس کے تھنوں کو دھویا، بچا ہوا پانی گرا کر دودھ نچوڑا۔

سُسر اور داماد دودھ لے کر گھر آئے۔

بیگم چائے بنائیں تب تک مرزا اپنے سُسر کے ساتھ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر جڑی بوٹیوں اور ان کے نئے نسخوں پر گفتگو کرتے رہے۔ مگر دیوان صاحب اندر سے متواتر اٹھ رہے شور وغل سے خلل محسوس کرنے لگے۔ ڈانڈیلی میں اسکول چھوٹنے کے بعد آج نغمہ کو کھیلنے کے لیے کوئی ساتھی ملا تھا۔ اس کی شوخی پورے شباب پر تھی۔ وہ زور زور سے سہیل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس کی بے بات ہنسی اور اُدھم دیوان صاحب کو ناگوار گزر رہا تھا انہیں فکر تھی۔ یہاں کی کچی دیواروں سے یہ کنواری کھلکھلاہٹ اس پار گئی تو محلے والے کیا سوچیں گے! یہ ہنسی مذاق یہاں کی تہذیب اور معاشرے کی روایت کے خلاف ہے۔ اس عمر میں نغمہ کا جنگلی ہرنی کی مانند قلانچیں بھرنا ان دیواروں کی بنیاد ہلا کر رکھ دیں گے۔ ان کے دل میں آیا نغمہ کو بلا کر نصیحت کریں۔ پھر سوچا آج کی نسل پر نصیحت بے اثر ہوگئی ہے۔ انہیں وقت ہی سکھا سکے تو سکھائے۔

چائے ناشتہ سے فارغ ہو کر سب لوگ دیوان صاحب کی رہائش پر جانے کے لیے تیار ہوئے۔ مرزا نے گھر کو قفل لگایا، بیگم نے سر پر چادر ڈال کر اس کا ایک حصّہ آدھے چہرے کو ڈھانپنے کے لیے استعمال کرتے ہوئے باقی کا حصہ پیچھے شانہ پر ڈال دیا۔ مرزا نے اپنے سُسر کا ہاتھ تھاما اور آگے چلنے لگے۔ بیگم کے

دائیں بائیں نغمہ اور سہیل ان بزرگوں کے پیچھے چلنے لگے۔گلی ، کوچوں سے گزرتے ہوئے ان کا قافلہ آگے بڑھا۔سہیل کا جی نغمہ سے باتیں کرنے کو بے چین ہو رہا تھا۔مگر دونوں کے درمیان پھوپھی تھیں۔نغمہ بھی گلی، کوچوں کے طرح طرح کے مکان اور لوگوں کو دیکھنے میں گُم تھی۔کوئی تانگا گزرتا تو حسرت سے دیکھتی۔جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو سہیل اپنے آپ کو روک نہ سکا۔اس نے آہستہ سے پھوپھی سے ہاتھ چھڑایا اور دبک کر نغمہ کی بغل میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔وہ اپنے بھائی، بہن پر رعب جمانا چاہتا تھا کہ اس نے ان سے پہلے نغمہ کو دیکھا۔صرف دیکھا ہی نہیں اس سے دوستی بھی کر لی۔

دیوان صاحب کی رہائش گاہ پر ہر کوئی ان کے آنے کے انتظار میں تھا۔بطور خاص ہر فرد نغمہ کو دیکھنے کا منتظر تھا۔گھر کے بچوں کے لیے وہ اجنبی تھی۔ نانی امّاں اور میمونہ مُمانی نے بھی اسے تب دیکھا تھا جب وہ چھوٹی تھی۔مہمان گھر پہنچے تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔مرزا کی بیگم نے لپک کر اپنی امّی کو گلے لگایا۔نغمہ نے جھک کر نانی امّاں کی خدمت میں سلام پیش کیا۔نانی امّاں نے اسے ننگے سر دیکھا تو ان کے ماتھے پر شکن پڑ گئی مگر وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے چُپ رہیں۔ انہوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے ماتھے کو چوما۔بلائیں لیتے ہوئے دعائیں دیں۔نغمہ نے اپنی مُمانی کو سلام کیا۔ممانی نغمہ کو دیکھتی رہ گئی۔ جتنا اس نے سوچا تھا اس سے زیادہ وہ خوبصورت نظر آئی۔تبھی بیگم نے اپنی بھابی کو گلے لگایا۔گھر میں اس وقت ماموں جان کی لڑکی اور ایک لڑکا موجود تھے۔انہوں نے نغمہ کو گھیر لیا۔بڑا بیٹا دھارواڑ کالج گیا ہوا تھا۔ماموں کورٹ کے لیے نکل گئے تھے۔دیوان صاحب اور مرزا ایک طرف کرسیوں پر بیٹھے، ایک ہی کمرے میں سب اپنا اپنا حلقہ بنا کر باتوں میں لگ گئے۔نانی امّاں کی کھٹیا کے کنارے بیگم بیٹھی ہوئی تھیں۔پاس میں ان کی بھابی میمونہ کھڑی ماں، بیٹی کی باتیں سن رہی تھیں۔ تبھی موقع دیکھ کر نانی امّاں اپنے دل کی بھڑاس بیٹی کے سامنے نکالے بغیر رہ نہ سکیں، انہوں نے کہا۔

رابعہ، تو تو سر پر چادر ڈال کر آ گئی۔ایک اور چادر یا شال نہیں تھی جو اپنی بیٹی کو ننگے سر سارے گاؤں میں گماتے ہوئے لے آئی۔لوگ کیا کہیں گے؟

بیگم اپنی ماں کی بات سن کر سکتے میں آ گئیں۔ان کی نظر میں تو نغمہ آج بھی چھوٹی بچی ہی تھی۔نانی امّاں کی نظروں نے اسے بالغ کیسے دیکھ لیا!! وہ اس پر مزید سوچیں اس سے قبل پاس کھڑی میمونہ نے ٹکڑا جوڑتے ہوئے کہا۔

امّی سچ کہہ رہی ہیں۔ یہاں کے لوگ خباست پسند ہیں۔طرح طرح کی باتیں کریں گے۔میمونہ کی آواز بھاری اور اونچی ہونے سے سب کے کان کھڑے ہو گئے۔سب نے خاموشی اختیار کر لی اور کان اس طرف کر لئے۔ میمونہ نے اپنا کلام جاری رکھا۔

اس پر لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ آپ نے ڈانڈیلی سے آ کر خاص طور پر نغمہ کی آگے کی پڑھائی کے لیے یہاں گھر بسایا ہے، تو اللہ جانے کیسی کیسی باتیں ہوں گی!!

یہ سن کر نغمہ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔دیوان صاحب نے محسوس کیا کہ غلط وقت پر ان کی اہلیہ نے یہ موضوع چھیڑا ہے اور میمونہ اس بات کو ہوا دے رہی ہے۔انہوں نے اس موضوع کو رفع دفع کرنے کے لیے زبان کھولی۔

میمونہ، باتیں بعد میں کرنا، پہلے ہمارے لیے چائے تو بناؤ۔

دیوان صاحب نے کہا چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی میمونہ کو جانا پڑا مگر نانی امّاں کی بھڑاس ابھی مکمل طور پر نکلی نہیں تھی۔انہوں نے سلسلۂ نصیحت جاری رکھا۔

میمونہ نے صحیح کہا۔اس کی پڑھائی کو لے کر چہ مگوئیاں تو ہوں گی ہی۔ بعد میں اس کی شادی بیاہ کے وقت بھی کئی مسئلے کھڑے ہوں گے۔دیکھو، میں لڑکی کی تعلیم کے خلاف نہیں ہوں مگر اس حد تک حامی بھرتی ہوں کہ وہ اتنا پڑھے کہ اپنی اصلاح اور اعلیٰ اخلاق کو بنانے میں اپنی تربیت کر سکے۔

مرزا اپنی بات کہنے کے لیے زبان کھولنے کو تھے کہ ان کے ہونٹوں کی جنبش دیکھ کر نانی امّاں نے روکتے ہوئے کہا۔

تم چپ رہو بیٹے۔ جب بات نکلی ہی ہے تو کہتی ہوں۔ پھر بھی تم اپنی بیٹی کو پڑھانا چاہتے ہو تو بے شک پڑھاؤ مگر امتحان دلوا کر گاؤں بھر میں ڈھنڈورا مت پیٹو۔اعلیٰ تعلیم دلوا کر اس سے نوکری کروانی ہے کیا؟

دیوان صاحب نے اپنی اہلیہ کو روکنا چاہا مگر ہمت نہیں بٹا پائے۔ جوانی میں مرد جورو پر جتنا چاہے ہاتھ یا منہ سے زور آزما لے۔بڑھاپے میں بولتی بیوی کو چپ کرانا اس کے بس میں نہیں رہتا۔ان کی اہلیہ بولتی رہیں۔سب سنتے رہے انہوں نے رابعہ سے سوال کرتے ہوئے کہا۔

کیوں، ہم نے تمہیں نہیں پڑھایا؟ اتنا پڑھایا جتنا مناسب تھا، بس پھر چار بول پڑھوا کر تمہیں مرزا کی تحویل میں دے دیا۔۔۔

نانی امّاں ضرب پر ضرب لگا رہی تھیں۔نغمہ انہیں جھیل رہی تھی۔وہ اٹھ کر جانا چاہے تو بھی نہیں جا سکتی تھی۔اسے معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں کوئی گوشہ ایسا بھی ہے، جہاں جا کر وہ ٹھسوے بہا سکے۔مرزا اور دیوان صاحب کو بھی یہ ناگوار گزر رہا تھا مگر نانی امّاں کی زبان کو لگام کون لگائے! یہاں نانی امّاں کا زبانی گھوڑا اپنی رفتار میں تھا۔دوسری جانب رسوئی میں چولھے پر پک رہی چائے کے ساتھ میمونہ کے ذہن میں کچھ اور ہی پک رہا تھا۔اس نے نغمہ کو دیکھا تو پہلی نظر کا سابقہ ہی اسے نغمہ کا گرویدہ کر گیا۔لمبا قد، صحت مند کاٹھی، گورا چٹا رنگ، نکیلی ناک، انگوری آنکھیں اور رخساروں پر چمکتے پسینے کے قطرے۔جیسے مغلائی خون اس کے حصّے میں آیا ہو۔اس طرف ایسی قد کاٹھی، تیز طرار ناک نقشہ اور سرخ رنگ لڑکیوں کو کم کم نصیب ہوتا ہے۔شمال میں تو نوخیز مغلوں نے حکومت کی تھی۔۔۔میمونہ نے فوراً طے کر لیا۔اس کے بڑے بیٹے اختر کے لیے نغمہ مناسب جوڑی ہے۔ ماشاء اللہ میرا بیٹا دو تین سال میں بی۔اے کر لے گا۔اس کے ابّا

وکیل ہیں۔کہیں نہ کہیں سرکاری افسری پر لگا دیں گے۔رہی بات نغمہ کی پڑھائی کی تو اس پر نانی امّاں کے رسوخ سے روک لگائی جاسکتی ہے۔

شام ہوتے ہوتے گھر کا ماحول معمول پر آ گیا۔اختر کالج سے لوٹا تو میمونہ نے خاص طور پر اس کا تعارف نغمہ سے کرایا۔اختر کے والد آج کورٹ کے بعد اپنے دفتر نہ جا کر اپنی بہن رابعہ سے ملنے گھر چلے آئے۔سب نے مل کر ہنسی خوشی رات کا کھانا کھایا۔گپ شپ ہوتی رہی۔کھانے کے دوران میمونہ بڑھ چڑھ کر نغمہ کو کھانے کے لیے زور کرتی رہی۔اس بیچ نانی امّاں نے بیٹی رابعہ کے کانوں میں نغمہ کی تربیت کے گُر کب پھونک دیے اس کی کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

رات کے کھانے کے بعد دیوان صاحب نے اپنے وکیل بیٹے عطاء اللہ کو تانگا منگوانے کے لیے کہا۔نانی امّاں نے اپنے ٹرنک سے شال نکال کر رابعہ کو دی اور کہا۔

نغمہ کو ننگے سر مت لے جا۔یہ شال اس کے سر پر ڈال۔

تانگا آیا۔نغمہ کا جی چاہا کہ اچھل کر آگے کی نشست پر بیٹھے۔پھر یہ سوچ کر رُک گئی کہ ایسا کرنے سے جانے نانی امّاں کے غصّے کی کونسی چٹان اس پر ٹوٹے۔وہ اپنی امّی کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئی مرزا صاحب آگے بیٹھے۔ہر کسی نے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا۔

تانگا گلی کوچوں سے ہچکولے لیتا ہوا گامزن تھا۔کوچبان وقت بے وقت عادتاً ہلکے ہلکے گھوڑے کی پیٹھ پر چابک ایسے مارتا جیسے مچھر اُڑا رہا ہو۔گھوڑا اس کی اس مہربانی سے بے نیاز ایک لَے میں ٹاپ دیتا ہوا اپنی چال پر قائم تھا۔تانگے پر سوار ہر کوئی اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔کوچبان گھر جانے سے پہلے گھوڑے کے لیے چارا لے جانے کی جُگاڑ میں تھا۔مرزا اپنی ساس کی باتیں یاد کر کے بیٹی کی تعلیم کے منصوبوں کو نئے سرے سے ترتیب دینے میں لگے ہوئے تھے۔نغمہ تانگے کے ہچکولوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے خیالوں میں گم تھی۔نانی امّاں کی دی ہوئی شال سر سے پھسل کر شانہ پر آ گئی تھی۔جب بیگم اپنی فکر میں ڈوبی ہوئی گاہ بہ گاہ نغمہ کی گردن کی جانب دیکھ رہی تھیں۔وہ پریشان اس بات کو لے کر تھیں کہ ان کی امّی نے جو بھی تلقین کی تھی ویسا کچھ بھی نغمہ کو دیکھنے سے نظر نہیں آ رہا تھا۔گھر پہنچ کر بھی انہوں نے کوشش کی مگر وہ اپنی ماں کی رائے سے متفق نہ ہو سکیں۔ایک طرف امّی کی پارکھی نظر، دوسری جانب خود کی ناکامی، رات کو ان کا سونا دوبھر ہو گیا۔

صبح وہ جاگیں تو رات کی فکر بھی ان کے ساتھ ہی بیدار ہو گئی۔انہوں نے دیکھا نغمہ اپنی کُرسی پر بیٹھ کر پڑھائی کر رہی تھی۔انہوں نے اسے باورچی خانہ میں بلانے کی سوچی۔پھر یہ سوچ کر خیال مسترد کر دیا کہ یہاں بجلی کی روشنی کم ہے باہر احاطہ میں اسے بلانا چاہیے۔تھوڑے وقفہ کے بعد وہ برتن مانجھنے کے لیے احاطہ میں آئیں۔برتن مانجھے اور نغمہ کو آواز دی۔۔۔

بیٹی، یہ برتن سوکھنے کے لیے وہاں چبوترے پر رکھ دے۔تب تک میں یہ فرش دھو لیتی ہوں۔

برتن اٹھانے نغمہ جُھکی۔بیگم نے اس کے گریباں میں جھانکا۔انہیں اپنی امّی کی بات صحیح نظر آئی۔نغمہ کے گریباں میں اس کے سینے کی گولائیاں صاف نظر آئیں۔انہیں اپنی امّی کی بات یاد آئی۔''بیٹی، اپنی چھوری کی قمیض کا گریباں گردن کے نیچے مت رکھا کرو۔اس کی بڑھتی عمر ہے، اب دھیان نہیں دو گی تو پھر نظرِ بد سے بچانا مشکل ہوگا۔''

وہ یک بیک پریشاں ہو گئیں۔انہوں نے بیٹی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

تم کیا کر رہی تھی۔

پڑھائی کر رہی تھی۔

تم جاؤ، پڑھائی کرو، میں یہ کر لوں گی۔

انہوں نے بیٹی کو واپس بھیج دیا۔انہوں نے سوچا۔آم پر بور لگ چکے ہیں۔اب قدرتاً اطراف خوشبو پھیلے گی۔۔۔پھل لگیں گے۔۔۔نظروں کی سنگ باری ہوگی۔۔۔

یک لخت بیگم پسینے سے شرابور ہو گئیں۔عالم اضطراب میں کھڑی ہو کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ان کی سانس تیز چل رہی تھی۔

کستوری

کہانیوں کی دنیا میں میری آمد ۱۹۹۶ء میں پہلی کہانی ''پرچھائیاں'' لکھ کر ہوئی جو ہندسماچار جالندھر میں چھپی اور اُس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ہندوستان اور پاکستان کے مختلف جرائد میں میری کہانیاں تسلسل سے چھپنے لگیں۔بنیادی طور پر میں اردو کی کہانی کار ہوں اور اب تک میری کہانیوں کے چھ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔اردو کے قاری اور نقّاد سے مجھے اس قدر حوصلہ افزائی اور توجہ ملی کہ میرے لیے بیان کرنا ممکن نہیں مگر ہندی قاری کے لیے یہ میرا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جسے میں اس اُمید کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں کہ آپ اردو قاری اور نقّاد کی طرح نہ صرف میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے بلکہ میری تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی بھی نہایت فراخدلی سے کریں گے۔

(ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر رینو بہل کے ہندی میں پہلے افسانوی مجموعے ''کستوری'' کے پیش لفظ سے اقتباس)

(اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۰۰، دستیابی، اکھر پبلیشرز، دہلی، بھارت)

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط.....۷

درد آگیں تخلیقات

میوزیم کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں کسی فنکار کی گیلری میں اس کے Instalation کی نمائش تھی۔ دیواروں کے اندر پیوست کیے گئے وہی کپڑے، برتن اور کتابیں تھیں جو صرف آدھی نظر آتی تھیں اور جو اس فنکار کے ڈسٹرکٹ 6 کے گھر کی نشانیاں تھیں۔ دیواروں سے جھانکتی ہوئی یہ اشیاء ساعت رفتہ کی کہانیاں سنا رہی تھیں جو کبھی اُس کے بسے ہوئے گھر کی زینت تھیں۔ دوسری گیلری میں وہاں کے ایک مشہور مصور کی تخلیقات چیخ چیخ کر اپارٹ ہائیڈ کے تشدد کے قصے سنا رہی تھیں۔ اُس مصور کا نام Kenneth Baker لکھا ہوا تھا جو ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۹۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس فنکار نے ہی سب سے زیادہ ڈسٹرکٹ 6 کو مصور کیا تھا۔ وہاں کی خوشیاں اور وہاں کے غم۔۔۔ اور پھر۔۔۔ غم ہی غم۔۔۔

نور کے اندھیرے

میوزیم کے گراؤنڈ فلور پر ایک گوشے میں کتابوں کی دکان نے پروین کو اپنی طرف بلا لیا تھا۔ وہ دکان اس کے لیے ایک مقناطیس ثابت ہوئی تھی۔ وہاں سب کتابیں اپارٹ ہائیڈ کے ظلم وستم پر مبنی تھیں۔ خواہ وہ نثر ہو یا شاعری۔ ڈسٹرکٹ 6 کی تباہیوں پر نثری اور شعری تخلیقات تھیں۔ وہ ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہی تھی جس کا نام تھا۔۔۔ My Life is District Six۔۔۔ ''Noor's Story'' (''نور کی کہانی'' ۔۔۔ ڈسٹرکٹ 6 میں میری زندگی) یہ نور ابراہیم کی خودنوشت تھی۔ بے حد دلچسپ۔ خوشیوں سے پر بھی، زندگی کے المیوں سے معمور بھی۔ جب اُس کو ڈسٹرکٹ 6 سے نکال دیا گیا تھا۔ کئی پشتوں سے بسے ہوئے اس کے خاندان کو کس طرح تباہ کیا گیا تھا۔ وہ اُس کتاب میں ابھی غرق ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔۔۔ پروین نے مڑ کر اسے دیکھا۔۔۔ وہ ایک منحنی سا عمر رسیدہ شخص تھا۔ سر پر ٹوپی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''میں اس کتاب کا مصنف ہوں'' پروین کو حیرت انگیز خوشی ہوئی اس کتاب کے مصنف سے مل کر۔ اس میوزیم کے اسٹاف ممبران میں نور ابراہیم بھی تھا۔ نور کے چہرے کی ان گنت جھریوں میں ماضی کی کراہیں چھپی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب سی اداس سنجیدگی تھی۔ پچھلی اذیتوں کی پرچھائیاں اُس کی آنکھوں میں تھیں۔ پروین نے اُس سے کئی سوالات کر ڈالے تھے۔ کیونکہ ڈسٹرکٹ 6 کا رہنے والا ان ساٹھ ہزار لوگوں میں سے ایک تھا، اُن بے بس لوگوں میں سے ایک جس کا گھر بھی بل ڈوزر نے تباہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی درد بھری داستان سنا رہا تھا اور پروین ہمہ تن گوش تھی۔۔۔ وہ ڈسٹرکٹ 6 میں پیدا ہوا تھا۔ اُس علاقے کا نام ڈسٹرکٹ 6 اس لیے تھا کیونکہ وہ کیپ ٹاؤن کا چھٹا میونسپل ڈسٹرکٹ تھا۔ یہاں تقریباً ستر ہزار لوگ، دوست بن کر رہا کرتے تھے اور پھر۔۔۔ وہ دن آج تک کوئی نہیں بھولا۔۔۔ ۱۱ر فروری ۱۹۶۶ء کا دن۔۔۔ وہ صبح جو تباہی کی سیاہی لے کر آئی تھی۔۔۔ جب سارے اخبارات ایک جان لیوا اعلان سے بھرے پڑے تھے کہ ڈسٹرکٹ 6 صرف گوری نسل کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ وہاں کے باشندوں کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی تھی اور نور ابراہیم کی دنیا بھی ۱۹۷۵ء میں بکھر گئی تھی۔ اندھیرا چھا گیا تھا جب ایک دن وہ کام سے فارغ ہو کر روز کی طرح اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو دیکھا بڑا سا بل ڈوزر اس کی سڑک پر تمام گھروں کو، دکانوں کو توڑ توڑ کر گرا رہا تھا۔ وہ دیکھتا رہا لیکن کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ ہر روز بل ڈوزر اس کے گھر کے قریب آتا جا رہا تھا۔ اور ہر روز اس کے دل کے ایوان کو بھی درد کا بل ڈوزر ڈھا رہا تھا اور ایک دن اس کے گھر کی باری بھی آ گئی تھی۔ گورنمنٹ نے اسے ایک ماہ کا وقت دیا تھا گھر خالی کرنے کے لیے۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس کے معصوم بچے اس درد کو محسوس کرنے کے لیے بہت چھوٹے تھے۔ ایک ماہ میں اُسے اُس علاقے میں جانا تھا رہنے کے لیے جہاں کوئی سہولت نہیں تھی۔ سب سامان سمیٹ کر جب وہ اپنی گاڑی میں دوسرے بے حد بدحال علاقے کے لیے نکل رہا تھا تو جاتے جاتے بغیر ارادے کے گاڑی روک کر آخری بار اپنے گھر کو تک رہا تھا۔ جس کا نام ونشان مٹنے والا تھا۔ آنسو اتنے بہہ چکے تھے پھر بھی رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بے بسی کے شعلے اُسے جھلسا رہے تھے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہ ہر روز یہاں آ کر بے بسی سے اپنے گھر کو روز تھوڑا تھوڑا بکھرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ پانچ دنوں میں بہت کچھ ٹوٹ بکھر گیا تھا لیکن دروازے پر سائن بورڈ تب بھی لگا ہوا تھا جس پر درج تھا 247 Caledon Street ۔۔۔ شام کے ملگجے اجالے میں اکیلا آہستہ آہستہ چل کر اپنے نیم ایستادہ گھر کے قریب اس نے جا کر اس بورڈ کو اتار لیا تھا۔ گھر کے اندر وہ ہر ہر گوشے میں گیا تھا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اب تک وہاں اس کی بسی ہوئی دنیا کی خوشبو موجود تھی۔ اس نے ہر دریچے پر پیار سے ہاتھ رکھا تھا پھر الوداعی نظر ڈال کر نکل گیا تھا۔ ایک ہفتہ بعد دوبارہ جب وہ وہاں پہنچا تو اس کا گھر غائب تھا۔ صرف ملبے پڑے ہوئے تھے۔ سب کچھ بکھر چکا تھا۔ اُس کے گھر کی ٹوٹی ہوئی دیواروں کے ملبے پر کچھ پرندے بیٹھے ہوئے تھے۔ نور کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اس سے پوچھ رہے ہوں۔۔۔ کہاں ہے وہ گھر؟ کہاں ہیں وہ خوش حالیاں؟ وہ چہل پہل؟ وہ کھانوں کی خوشبو؟ وہ بچوں کی ہنسی؟ وہ محبتوں کے نغمے؟ وہ پھولوں کے حسیں رنگ اور پتوں کی ہریالیاں؟ کہاں گئے وہ سب؟ نور اپنی کہانی

سنا رہا تھا۔ پروین بہ ظاہر خاموشی سے کھڑی ہمہ گوش تھی۔ لیکن اپنے اندر کچھ ٹوٹنے کی آواز بھی سن رہی تھی۔ تیز سیلاب کو باہر اُبلنے سے بھی روک رہی تھی۔ کسی اور کا درد اُس کا درد بن گیا تھا۔ کوشش کے باوجود اندر بپھرے ہوئے سیلاب کی کچھ ضدی لہریں آنکھوں کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ احساس کی شاخوں پر درد کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور خالی اپنی دردناک کہانی سنا رہا تھا کہ۔۔۔ ایک ہفتہ بعد جب وہ پھر اپنے گھر کی طرف آیا تھا تو وہاں اب وہ ملبہ بھی نہیں تھا۔ سپاٹ زمین تھی۔ وہ اس پر کھڑا ہو کر خالی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ اب وہ جگہ جہاں وہ پلا بڑھا تھا، برسوں تک۔۔۔ اس بسی ہوئی دنیا کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ جگہ جہاں اس کا دادا محمد حسین ابراہیم اور دادی مریم ابراہیم جو انیسویں صدی میں یہاں آئے تھے۔ نور کا چچا اسمٰعیل گوروں کے لیے کام کرتا تھا اور خود کو شادی شدہ بتا کر اپنے بچوں کے نام سے پرانے کپڑے مانگ لیا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ غیر شادی شدہ ہی تھا۔ نور ان کپڑوں کو فروخت کر کے اپنی ماں زہرہ کو پیسے دیا کرتا تھا جو روٹی روزی کے کام آتے تھے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ گھر میں کھانا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس صورت حال میں ڈسٹرکٹ 6 کے ہم سائے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ جہاں نسل کی کوئی قید نہ تھی۔ سب ایک تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب یا تہذیب کے ہوں۔ گھر کی خستہ مالی حالت اور ماں کی تگ ودو دیکھ کر نور ابراہیم نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا اور نوکری کر لی تھی۔ والدین کی مرضی کے خلاف۔۔۔ پندرہ سال کی عمر میں۔۔۔ نور کے سنجیدہ چہرے پر خوشی کی لہر نظر آئی تھی۔ جب وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی اُمید کے خلاف یہ میوزیم قائم ہوا تھا جس نے اسے بھرپور خوشیاں دی تھیں۔ اس کی زندگی کو ایک مقصد مل گیا تھا کیونکہ میوزیم ڈسٹرکٹ 6 کی زندگیوں کے نشیب وفراز کا ایک نمائندہ تھا۔ نور کی کہانی سننے کے بعد وہ گہری اُداسی میں ڈوب گئی تھی۔

پروین دوبارہ کتابیں دیکھنے لگی تھی۔ نور اس کی رہبری کر رہا تھا۔ یکا یک اُس کی نظر ایک کالے شاعر کی کتاب پر رک گئی تھی جسے اس نے پہلے بھی کبھی پڑھا تھا۔ وہ کالا شاعر اور مصنف James Mathews (1929) تھا۔ جس کو اپارٹ ہائیڈ گورنمنٹ نے یہ سزا دی تھی کہ وہ تئیس سالوں تک پاسپورٹ رکھنے کا حق گنوا چکا ہے۔ اس شاعر کی کچھ کتابیں ممنوع قرار دی گئی تھیں جیسے Cry Rage, Pass me a Meatball Jones اور Black Voices Shout جیمس میتھیوز نے ساؤتھ افریقہ میں پہلی کالوں کی آرٹ گیلری اور Publishing House قائم کیا تھا۔ وہ James Mathews کی شاعری کے مجموعے No Time For Dreams کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اُس کی یہ نظمیں دل میں اُترتی جا رہی تھیں:

(۱)

میں کیا کہوں
اپنے بیٹے سے
جو آسمان کی طرف دیکھتا ہے
اور کہتا ہے
ڈیڈی! میں چاہتا ہوں جہاز اڑانا
یا۔۔۔ چلانا چاہتا ہوں ٹرین
میں سنتا ہوں
اور میرے اندر غصہ بھڑک اٹھتا ہے
اور میں اُسے دبا کر
بڑی نرمی سے
سرگوشی کے انداز میں بتاتا ہوں
بیٹا! یہ سب تم نہیں کر سکتے
کہ تم کالے ہو
میری آواز کا دھیما سُر
چھپا لیتا ہے میرا درد
جب ہم کسی باغیچے کی بینچ کے پاس سے گزرتے ہیں
ہم اس پر نہیں بیٹھ سکتے
تب میرے منہ سے سفید (فام) کے لیے نکلتی ہے بددعا
اس خدا کے حضور جس کے سامنے ہوتا ہے وہ سربہ سجود
یا پھر بڑھوں اور اپنے ہاتھوں سے اسے مار ہی کیوں نہ دوں؟

(۲)

آزادی
میری کالی جلد کا مقسوم نہیں ہے
میرا کالا پن محض ایک غلاف ہے
جو نمائشی طور پر
ظاہر کرتا ہے
کہ میں آزاد ہوں
کیونکہ میں نے گوارہ کر لی ہے اپنی محکومی
آزادی
کالے رنگ میں رچا ہوا خواب ہے
یہ وقت خواب دیکھنے کا نہیں ہے
آزادی کا کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا
وہ صرف خون ہی ہے
جو آزادی لا سکتا ہے
ایک دوسرے کے لیے رفاقت پر ایمان رکھنے والی
بہت سی جانوں کی قربانی کا نام ہے آزادی

یہ وقت خواب دیکھنے کا نہیں ہے
(۳)
(یہ) چھوٹا سا کالا لڑکا کک
اسکندریا میں
برآمدے میں بیٹھا ہوا
ٹکٹکی باندھے ہوئے
دیکھ رہا ہے چاند
آسمان پر گڑی ہوئی ہیں اس کی نظریں
اور تلاش میں ہیں
ان مناظر کی جو اس نے دیکھے نہیں ہیں
پراگندہ ہے اس کا دماغ
جو ایسی چیزوں کے بارے میں بھی اسے بتاتا ہے
جو مبہم ہیں
اس کی مسرت ناقابل فہم ہے
ان بچوں کے لیے
جو گزر رہے ہیں اس کے قریب سے
کھی کھی کر کے ہنستے ہوئے
اور ایک کالا آدمی
اپنی پرانی سائیکل پر سوار
شفقت بھری میٹھی نظروں سے
دیکھتا ہے ان کی طرف
اور پیڈل پر مار کے
نکل جاتا ہے آگے

(ترجمہ: پروفیسر عتیق اللہ)

ان نظموں میں بے بسی اور درد کی دنیا بسی ہوئی تھی۔ ان نظموں کی کراہوں نے اس ہلا دیا تھا۔ اس میوزیم نے اس کی لاعلمی کے سیاہ پیمانے کو آگہی کے نور کے قطروں سے جگ مگا دیا تھا۔ یہ صرف میوزیم ہی نہ تھا۔ ایک احساس تھا، ایک صدمہ تھا۔ ایسا جاں گسل احساس جسے کسی ڈراؤنے خواب میں محسوس کیا جاتا ہے۔ اس میوزیم میں ہر وہ لمحہ زندہ ملا تھا جو مر چکا تھا۔ جب لوگ ڈسٹرکٹ 6 میں انسانی حقوق سے مالا مال تھے۔ آزاد زندگی گزارتے تھے۔ اس میوزیم میں پوری تہذیب ہے۔ ہزاروں کہانیاں زندہ ہیں آج بھی۔ ساٹھ ہزار باشندوں کی درد بھری داستان جنہیں ڈسٹرکٹ 6 سے زبردستی ہٹا کر ان کے گھروں کو بے نشاں کیا گیا تھا۔ پورے شہر کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ جہاں خوشیاں تھیں۔ اس میوزیم میں پوسٹرز تصویریں، ٹی وی اور کتابیں مل کر اپارٹ ہائیڈ کے مظالم کی داستان سناتے ہیں۔

نور ابراہیم اپنی دردناک آپ بیتی سنا رہا تھا۔ اس کے الفاظ سنگ ریزے بن کر دل کی جھیل کے نازک چہرے پر درد کی لہروں کی خراشیں ڈال رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ جس دن زبردستی اسے گھر سے نکالا گیا تھا وہ دن اُس کی زندگی کا سب سے اندھیرا دن تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ جیسے آسمان کی آنکھیں بھی درد سے جل تھل تھیں۔ نور اُس وقت سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ وہ سوچتا رہا تھا۔ پریشان ہوتا رہا تھا۔ گھبراتا رہا تھا۔ لیکن کوئی چارہ نہ تھا۔ ڈسٹرکٹ 6 سے سبھی کو ایسی جگہ رہنے کو بھیجا گیا تھا جہاں بنیادی ضرورتوں کی اشیاء ندارد تھیں۔ جیسے بجلی، پانی، اسکول، اسپتال اور نوکری۔ نور سوچتا رہا تھا کہ اُسے وہاں کیوں جانا ہے؟ لیکن جانا ہی تھا۔ نور کے نئے گھر میں صرف دو کمرے تھے اور اس کا خاندان بہت بڑا تھا۔ باتھ روم تین گھروں کے لیے ایک تھا۔ ایک ہی نل کا پانی بھی کئی گھروں کے لیے تھا۔ آپ بیتی سناتے وقت نور کے چہرے پر گھنی اُداسی کے رنگ آ جاتے تھے۔ اُس نے بتایا تھا کہ اگر کوئی گوروں سے زیادہ قابل ہوتا تو اُسے پراسرار طریقے سے غائب کر دیا جاتا تھا۔ کالے سیاسی لیڈروں کو لامحدود وقت کے لیے گرفتار کیا جاتا تھا اور اکثر اُسی قید خانے میں اذیت کے تحت اُنہیں موت آ جاتی تھی۔ جب ساٹھ ہزار لوگ ڈسٹرکٹ 6 سے نکالے گئے تھے ۱۹۶۶ء میں تو انہیں رہنے کے لیے صرف تیرہ فیصد جگہ دی گئی تھی جبکہ اسی فیصد ہونی چاہیے تھی۔

نور ابراہیم بولتا رہا اور پروین گم سم سنتی رہی۔ سچی داستان جھوٹی کہانی محسوس ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران نور اُسے طرح طرح کی کتابیں بھی شیلف سے نکال کر دکھاتا رہا تھا۔ سبھی کتابیں۔۔۔ شاعری یا فکشن۔۔۔ اپارٹ ہائیڈ کے ظلم کی دستاویزی تھیں۔ ڈسٹرکٹ 6 سے نکال دیئے جانے کے بعد نور کی ملازمت کا مقام بہت دور ہو گیا تھا اور آمد و رفت کے کرائے بھی بہت زیادہ تھے۔ ''اپارٹ ہائیڈ کے دوران بھی۔۔۔ اتنے تناؤ میں بھی بہت عمدہ ادب تخلیق ہوتا رہا تھا لیکن اس میں سے اکثر کو Band کر دیا جاتا تھا۔'' نور ایسے دکھ بھرے قصے بھی کہتا جا رہا تھا اور اپنے ملک کے ادبی المیے پر بھی باتیں کرتا جاتا تھا۔

وہ ایک اور کتاب کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ ساؤتھ افریقہ کی پہلی تخلیق کار تھی جس کو انتہائی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اُس کا نام Olive Schreiner تھا جو ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئی تھی اور ۱۹۲۰ء میں چل بسی تھی۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور ناول The Story of an African Farm تھا جو اس نے ۱۸۸۳ء میں لکھی تھی۔ وہ ایک دانشور تھی۔ اس نے جنگ کے خلاف کتابیں لکھی تھیں۔ نور پروین کو کتابیں بھی دکھا رہا تھا اور وہاں کے معروف شاعروں اور ادیبوں کی اہم معلومات سے فیضیاب بھی کر رہا تھا۔ افریقہ کے بڑے ادیب Alan Stewart Paton کی کتاب Cry, The Beloved Country دیکھ کر پروین چونک پڑی تھی کیونکہ اس پر بنائی گئی فلم۔۔۔ نسلی تعصب پر وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ ایلن پیٹن ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۱۹۸۸ء میں وفات پائی تھی۔ اس کا یہ ناول اتنا پسند کیا گیا تھا پوری دنیا میں اس کی

پندرہ ملین (Million) کا پیاں فروخت ہوئی تھیں۔ غیر جانبداری سے لکھی گئی اس کتاب کا موضوع نا انصافی، روحانی کشمکش، غربت، جرم، معاشرے کے ڈھانچے کے خلاف احتجاج ہے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان سطروں کو وہ بار بار پڑھتی رہی تھی۔۔۔

''اے پیارے ملک! تم اس بچے کے لیے آنسو بہاؤ جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ جسے وراثت میں ہمارا خوف ملے گا۔ اُس بچے کو اس زمین سے بہت زیادہ محبت نہ کرنے دو۔ اس کو زیادہ خوشی سے ہنسنے نہ دو۔ جب اس کی انگلیوں کے درمیان پانی بہتا ہے۔ اور نہ چپ کھڑے رہو جب ڈوبتا سورج میدان کو سرخ بنا دیتا ہے آگ سے۔ اُسے زیادہ محفوظ نہ ہونے دو جب اس کی زمین کے پرندے نغمے سنائیں۔ ناہی پہاڑوں اور وادیوں سے اُس کے دل کو بہت زیادہ قریب کرو۔ کیونکہ خوف اس سے یہ سب کچھ چھین لے گا اگر وہ انہیں بہت زیادہ دے گا۔''

ایک شیلف پر وہ کتاب بھی رکھی ہوئی تھی جس کا ذکر کینن نے کیا تھا۔ ادیب اور ناولسٹ Solomon Tshekisho Plaatje ساؤتھ افریقہ کے سب سے پہلے کالی نسل کے تخلیق کار کی کتاب Native Life in South Africa یہ ایک ایسا ادیب تھا جس نے اپنے ملک اور اپنی قوم کو آزاد کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔

نور کہہ رہا تھا کہ ڈسٹرکٹ 6 میوزیم وہ مرکز ہے جہاں غم کے مارے جو بے گھر کر دیے گئے تھے، جنہوں نے ستم سہے تھے آ کر اپنا درد بانٹتے ہیں۔ اپنی پر درد داستان ایک دوسرے کو سنا کر دل ہلکا کر لیتے ہیں۔ اپنی یادوں کے جہاں میں ایک دوسرے کو لے جاتے ہیں۔ ماضی اور حال کو ایک دوسرے سے باندھ دیتے ہیں۔ اُس نے نور ابراہیم کی کتاب Noor's Story My life in District 6 خرید لی تھی۔ جس میں نور کے اندھیرے زیادہ ہیں اجالے کم۔۔۔

وہی دنیا

کتابوں سے فارغ ہو کر پروین ایک کمرے میں داخل ہوئی تھی جہاں کسی عورت کی وہی پرانی دنیا سانس لے رہی تھی۔ وہاں وہی آزادی کی سانسوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جب وہ ڈسٹرکٹ 6 میں رہا کرتی تھی۔۔۔ وہ کمرہ اسی طرح برقرار تھا۔ وہی بستر، وہی کرسی، وہی صوفہ، وہی الماری، چھوٹا سا میز جس پر لکھنے پڑھنے کا سامان اور ایک گوشے میں کچن، دوسرے گوشے میں شیلف پر رکھے ہوئے کچھ سوٹ کیس۔۔۔ یہ سب کے سب ان لمحات کو سنبھالے ہوئے تھے جب وہ عورت اپنی زندگی آزادی سے جی رہی تھی۔ سکون اور خوشیوں کی درمیان اُس عورت نے اپن دنیا بسائی تھی۔ لیکن بل ڈوزوں نے اس کی حسین دنیا مسمار کر دی تھی۔ پروین دیکھ رہی تھی۔۔۔ ٹیبل پر چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی اور ایک کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی جیسے وہ عورت وہاں اب بھی بیٹھی ہوئی سکون سے چائے پی رہی ہو اور کتاب پڑھ رہی ہو۔۔۔ بستر کے قریب چھوٹے سے ٹیبل پر گھڑی کی ٹک ٹک جاری تھی۔ دیواروں پر اُس عورت کے خاندان کی تصویر تھی۔ اس کمرے کی دنیا سے اطمینان ٹپک رہا تھا۔ وہاں کی ہر ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس عورت کا گھر سکون کا گہوارہ تھا جس کی چاپ پروین سن رہی تھی۔ دیوار پر اُس کے خاندان کی کہانیاں لکھی ہوئی تھیں۔ جو ہاتھوں سے لکھی ہوئی فریم میں باتیں کرتی تھیں۔ وہ سب کچھ پروین پڑھ رہی تھی کہ کس طرح یہ بسی بسائی دنیا اجاڑ دی گئی تھی۔ انہیں اپنا شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ یہ کہانیاں ان لمحات کو یوں زندہ کر رہی تھیں جیسے پروین بھی ان میں سے ایک تھی۔ ان کے گھروں پر بے دردی کے ساتھ چلتے ہوئے بل ڈوزر کی تصویروں نے پروین کے دل پر بھی بل ڈوزر چلا دیا تھا۔

درد کے بھاری پتھر

کیپ ٹاؤن کے ہوٹل More Quarters کی رسپشنسٹ (Receptionist) ایک بے حد خوش مزاج، خوبصورت سی لڑکی تھی۔ سینڈی۔۔۔ بے حد مددگار اور ملنسار۔ لاؤنج میں آتے جاتے پروین اکثر اُس کے پاس بیٹھ کر اس کے ملک اور تہذیب کے متعلق باتیں کیا کرتی تھیں۔ اپارٹ ہائیڈ کے مظالم کے متعلق سینڈی کہہ رہی تھی۔۔۔ ''کالے لوگ بہتر گھنٹوں سے زیادہ گوروں کے علاقے میں نہیں رہ سکتے تھے۔ انہیں ہر وقت اپنا ID (شناختی کارڈ) ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ کسی بھی وقت پولیس ان کا شناختی کارڈ ان سے طلب کر سکتی تھی۔ جب وہ فوراً مہیا نہیں کرتے تھے تو گرفتار کر لیے جاتے تھے۔ گوروں کو کسی شناختی کارڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جہاں چاہتے جا سکتے تھے لیکن کالوں کو ہر جگہ جانے کی اجازت نہ تھی جب تک اجازت نامہ نہ ہو۔ جہاں نوکری آسانی سے مل جاتی تھی وہاں کالوں کو نوکری تلاش کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ صرف گوری نسل کا حق تھا۔ کالوں کو کہیں نوکری ملتی تھی تو انہیں اپنے بیوی بچوں سے الگ ہونا پڑتا تھا۔ دور جانا ہوتا تھا اور بیوی بچے اکیلے رہتے تھے۔ کسی کالے کو ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی اور کسی کالے ڈاکٹر کو گورے مریض کا علاج کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہی اتنی ہی تعلیم دی جاتی تھی کہ زیادہ ترقی نہ کر سکیں۔ ان کے اسکولوں کا Syllabus گوروں سے مختلف اور کم تر تھا۔ بجٹ بھی بہت کم تھا۔ اچھے استاد اور اچھی سہولتیں مہیا نہ تھیں۔ ان کے اسکولوں میں باتھ روم کی سہولت بھی نہیں تھی۔ گوروں کے ساتھ کسی بھی مقابلے کی اجازت نہ تھی۔ انسانی حقوق کی بھرپور خلاف ورزی ہو رہی تھی۔'' سینڈی یہ باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی جذباتی بھی ہو جاتی تھی۔ پروین سینڈی کی آوازیں سننے کے ساتھ ساتھ دل کے گہرے گڈھے میں بھاری پتھر گرنے کی آوازیں بھی سنتی جا رہی تھی۔ درد کے یہ وزنی پتھر اندر اور اندر گرتے جا رہے تھے۔ کسی طرح اس نے ان کا رخ اندر کی طرف موڑ دیا تھا جو ایک کٹھن کام تھا۔ پھر سینڈی کو شب بخیر کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھی تو نیند ہاتھ چھڑا کر کہیں دور چلی گئی تھی اور پھر۔۔۔ وہ وزنی پتھر اپنا رخ بے ساختہ باہر کی طرف موڑ رہے تھے۔

بوسہ

(انٹان چیخوف)

ترجمہ: ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

تقریباً کوئی رات کے آٹھ بجے شمالی بریگیڈ کی بٹالین آٹھ نے اپنے مستقر پر پہنچنے سے پہلے رات گذارنے کی غرض سے ایک چھوٹے سے گاؤں ''مس ٹچ چی'' میں چرچ کے نزدیک مرکزی چوک میں پڑاؤ ڈال دیا ابھی ٹھہرنے کے انتظامات مکمل نہیں ہوئے تھے اور بٹالین میں عجب افراتفری کا عالم تھا۔توپچی اپنی توپوں اور گولہ بارود کو محفوظ کرنے، سپاہی اپنی بندوقوں کو ٹھکانے لگانے اور باورچی اپنی دیگیں سنبھالنے میں مصروف تھے کہ ایک شخص جو شہری لباس میں ملبوس تھا ایک نہایت خوبصورت اور تنومند گھوڑے پر سوار نمودار ہوا۔گھوڑا اپنا پُرغرور سراونچا کئے اگلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر کبھی ایک جانب اور کبھی دوسری جانب مڑتا تھا یوں لگتا تھا کہ وہ رقص کر رہا ہے۔سب لوگ اپنا کام چھوڑ کر اس سوار کی جانب متوجہ ہو گئے۔جب وہ سوار قریب پہنچا تو اس نے ادب سے اپنا ہیٹ اتارا اور اعلان کیا کہ وہ عزت مآب جنرل وان ریبک کا پیغام لایا ہے کہ اگر اس بٹالین کے افسران اب سے تھوڑی دیر بعد جنرل کے ساتھ چائے نوش فرمائینگے تو جنرل صاحب کو نہایت مسرت ہوگی۔یہ کہتے ہی سوار ایک ادائے بے غرضی سے مڑا اور اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگا کر واپس چل دیا۔کچھ افسران حیران تھے، کچھ بڑبڑا رہے تھے کہ یہ کیا حماقت ہے۔ہم تھکے اور نیند سے بوجھل ہیں۔ہم تو جلد ہی سو جانا چاہتے تھے۔یہ کون جنرل ہے؟؟ یقیناً ایک ایسا جنرل جو سبکدوش ہو چکا ہے اور اب ہمیں اپنی جوانی اور بہادری کے قصے سنا سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا ہے۔انہیں یاد تھا کہ ایسے ہی کچھ دن پہلے کسی اور جنرل نے انہیں بلایا تھا اور چائے کے بعد قصے سنا سنا کر صبح کر دی تھی۔مگر فوجی روایات کا تقاضہ تھا کہ وہ اس دعوت کو قبول کریں، اس لئے بھی کہ انہیں گمان ہوا کہ کئی سال پہلے شاید یہی جنرل ان کی بریگیڈ کو کمان کر رہا تھا۔

انہیں بتایا گیا تھا کہ جنرل کی حویلی کو دو راستے جاتے ہیں ایک کھیتوں سے گزرتا ہوا اور دوسرا دریا کے کنارے ذرا نشیب کی طرف۔انہوں نے کھیتوں کے درمیان کا راستہ چنا اور کوئی ایک میل کے بعد انہیں درختوں سے چھپی ایک عظیم الشان حویلی کی روشن کھڑکیاں نظر آئیں۔وہ تجسس میں تھے کہ انہیں کس قسم کا ماحول ملے گا۔لیفٹننٹ روبٹلو جو بمشکل پچیس سال کا خوبرو نوجوان تھا اور جو اپنے طویل قد اور پرتمکنت چال کی وجہ سے سب سے نمایاں تھا کہنے لگا میں محسوس کرسکتا ہوں کہ چائے کہ ساتھ چند حسین اور دلربا خواتین کے بھی دیدار نصیب ہونگے۔اس خیال نے سب کو ایک انجانی مسرت سے ہمکنار کیا۔

حویلی کے صدر دروازے پر جنرل وان ریبک نے، جو ایک شاندار شخصیت کا طویل القامت شخص تھا اور جسکی سفید مونچھیں بڑی با رعب تھیں، انکا استقبال کیا۔ساتھ ہی اس نے تاسفانہ طور پر کہا کہ کل ہی اسکی دو بہنیں اور چند عزیز اس کے یہاں آئے ہیں اس لئے اس کی حویلی کا ہر کمرہ گھرا ہوا ہے اس لئے وہ انہیں رات گذارنے کو نہیں کہہ سکتا۔اسے معلوم نہ تھا کہ اس بیان سے افسران در اصل خوش ہوئے کہ انہیں یہاں اس بوڑھے کی داستان سنتے ہوئے پوری رات آنکھوں میں نہیں کاٹنی پڑیگی۔داخلی ایوان سے ایک گول زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے افسروں کو احساس ہوا کہ ایسی حالت میں جب کے جنرل کا گھر مہمانوں سے بھرا ہے شاید اس نے بھی انہیں اس لئے مدعو کیا ہے کہ اسکو اپنی سماجی اور فوجی رویات کو نبھانا تھا۔

دوسری منزل پر ڈرائینگ روم کے دروازے پر ایک معمر خاتون نے جو انتہائی خوبصورت تھیں اور اپنی تمکنت اور وقار میں ملکہ یوجینیا سے کم نہیں تھیں انکا ستقبال کیا اور ایک بار پھر اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ وہ انہیں مہمان کے طور پر نہیں ٹہرا سکتیں۔کچھ وقفے کے بعد انہیں ڈائینگ روم میں لیجایا گیا جہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔جنرل نے کہا، حضرات آپ مجھے معاف فرمائینگے کہ میں اتنے لوگوں کا تعارف نہیں کرواسکتا آپ لوگ خود ہی ایک دوسرے سے مل کر اپنا تعارف کروٹیں اور بے تکلف ہو جائیں جس پر مختلف ۱۱افسران نے میزبانوں سے اپنا تعارف کر کے چائے اور لوازمات کی طرف قدم بڑھائے۔ان افسران میں سے کچھ پُر اعتماد تھے، کچھ خوش مزاج اور کچھ لئے دئے مگر اس پورے گروپ میں جو افسر سب سے زیادہ پریشان اور گھبرایا ہوا تھا وہ ''ریابووچ'' تھا۔ریابووچ چھوٹے قد کا منحنی سا فرد تھا جس کی آنکھوں پر گول شیشوں کا چشمہ چڑھا تھا اور اس کے کندھے جوانی میں بھی جھکے ہوئے تھے۔اس پر طرہ یہ کہ اسکی مونچھیں مضحکہ خیز تھیں۔اوپری ہونٹ پر گھنی مونچھوں کے بجائے ہونٹ کے دونوں کناروں پر پانچ لمبے بالوں کا ایک گچھا تھا جسکی وجہ سے اسکے ساتھی اسے باگڑ بلا کہتے تھے۔وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ''میں ہی اس تمام محفل میں سب سے زیادہ شرمیلا ہوں۔مجھ پر کوئی توجہ نہیں دیگا۔دے بھی کیوں، پوری بٹالین میں، نہیں پوری بریگیڈ میں سب سے کم توجہ کے لائق میں ہی ہوں۔میز پر بیٹھ نے کے بعد اس کی نظریں کھوئی کھوئی تھیں۔اس میں کسی چہرے پر نظریں جمانے کی ہمت نہیں تھی۔محفل میں فانوس کی جگمگاتی روشنی، چاندی کے برتنوں کی چمک، شراب کے بلوریں جاموں کی جھلملاہٹ اور لباسوں کی رنگینی سے اس کو کوئی واسطہ نہ تھا بلکہ یہ سب اس کے احساس کمتری میں اضافہ کر رہے تھے۔اس ماحول میں اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں چھپ جائے اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے۔کچھ دیر بعد جب وہ ماحول سے کچھ مانوس ہو گیا تو اس نے اپنے گرد جنرل کے کنبے کے طرف نظر

ڈالی۔ جنرل کی بیگم اپنے فرشی لباس میں اس کے داہنی جانب تھیں، سامنے دو معمر خواتین تھیں شاید جنرل کی بہنیں جو مہمان آئی تھیں۔ میز کے کونے پر ایک نوجوان اور نہایت پرکشش لڑکی، شہزادیوں جیسا ہلکا جامنی لباس پہنے تھی جس میں اسکے مرمریں شانے عریاں تھے۔ یقیناً یہ جنرل کی بیٹی تھی اور آخیر میں سرخ چہرے والا ایک نوجوان جسکی داڑھی بھی سرخ تھی بیٹھا تھا یہ یقیناً جنرل کا بیٹا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ یہ سب کیسے گفتگو میں پرجوش حصہ لے رہے تھے۔ خاص طور سے جنرل کی بیٹی بہت پرجوش تھی اور وہ اپنا نکتہءنظر بیان کرتے اپنے سر کو ایک خاص زاویہ پر گھماتی تھی جس سے اس کے نیم تراشیدہ سرخ بال اسکے شانوں پر جھولنے لگتے تھے۔ ریابووچ یہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا مگر اس سارے ڈرامے میں اسکا اپنا کوئی حصہ نہ تھا۔ خوردونوش کے بعد انہیں دوبارہ ڈرائینگ روم کی طرف لے جایا گیا۔

''روبٹ کو'' کی چھٹی حس صحیح تھی یہاں کئی نوجوان، خوبصورت اور خوش لباس لڑکیاں اور چند نوجوان شادی شدہ خواتین ماحول کو رونق بخش رہی تھیں۔ روبٹ کو نے جلد ہی ایک خوبصورت اور پرکشش لڑکی کو جو سیاہ لباس زیب تن کئے تھی اور جس کی سیاہ پلکیں اسکے دہکتے رخساروں پر اٹھتی جھکتی تھیں اپنی گفتگو میں الجھالیا وہ جھک جھک کر اور ایک دلکش انداز میں اسے شاید اپنی کسی فرضی بہادری کا قصہ سنا رہا تھا۔ اس کے ذرا سا جھک کر اٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ تلوار چلا رہا ہو۔ ریابووچ کے دل میں ایک حسد کی چنگاری بھڑکی مگر اس کے احساس کمتری نے فوراً! ہی اسے بجھا دیا۔ اسے معلوم تھا کہ رنگ و بو کے اس سیلاب میں وہ کسی کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ اسی وقت پیانو پر کسی نے ساز چھیڑ دیا۔ کھلی کھڑکیوں سے اولیں بہار کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ میگنولیا، گلاب اور گل لالہ کی مہک اندر آرہی تھی۔ ایسا لگا کہ اچانک سب کو خیال آیا کہ یہ موسم بہار ہے۔ مسوسمی پھولوں کی قدرتی خوشبو، خواتین کے لباس اور انکے عطریات کے ساتھ مل کر ماحول کو مزید پرکشش بنا رہی تھی۔ پیانو نواز نے اب 'والٹز' بجانا شروع کر دیا۔ وان ربیک کے بیٹے نے ایک سادہ سی لڑکی کو بانہوں میں لے کر رقص شروع کر دیا۔ روبٹ کو نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر جامنی لباس میں ملبوس محفل کی سب سے خوبصورت لڑکی کو رقص کی دعوت دی اور وہ ایک ادائے دلبری کے ساتھ اس کی بانہوں میں جیسے تیرتی ہوئی چوبی فرش پر رقص میں شامل ہوگئی۔ اب کئی جوڑے رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ریابووچ کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا یہ سب کچھ دور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اس تقریب کا حصہ نہیں ہے۔ اس نے پوری زندگی کبھی رقص نہیں کیا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ مستقبل میں بھی اسے اس بات کا کبھی موقعہ نہیں ملے گا کہ وہ کسی حسین و باوقار خاتون کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرے اور وہ خاتون پیار سے اپنا سر اسکے کاندھے سے ٹکا دیں۔ یہی زندگی ہے، یہی اسکی زندگی ہے۔ اس خیال نے اس پر ایک بے نام سی افسردگی طاری کر دی۔

کچھ دیر بعد جنرل نے ان لوگوں کو جو یا تو رقص سے تھک گئے تھے یا مزید رقص کرنا نہیں چاہتے تھے بلیرڈ کھیلنے کی دعوت دی۔ ریابووچ کو بلیرڈ بھی کھیلنا نہیں آتا تھا مگر اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لئے وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ کئی کمروں اور راہداریوں سے گذرتے ہوئے وہ بلیرڈ روم میں پہنچے۔ کھیلنے والوں نے جوش سے کھیلنا شروع کیا۔

ریابووچ نے زندگی میں تاشوں کے علاوہ کوئی کھیل نہیں کھیلا تھا۔ کھیلنے والے جوش میں میز کے ادھر ادھر ہوتے تھے تو وہ ان کے درمیان آجاتا تھا۔ کبھی وہ اس سے کہتے ''معاف کرنا'' کبھی وہ اپنی کمان سے اسے آہستہ سے چھو کر کہتے ''بھئی بیچ سے ہٹو'' وہ بار بار شرمندہ ہوتا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں مخل ہو رہا ہے اس لئے بہتر ہے کہ واپس ڈرائینگ روم میں چلا جائے۔

مگر واپسی میں اسے ایک عجب حادثے سے واسطہ پڑا۔ وہ جس راستے سے آیا تھا اسے اسکا اندازہ تھا مگر کئی کمروں سے گذرتے ہوئے بھی اسے وہ راہداری نہیں ملی جو ڈرائینگ روم کی طرف جاتی تھی۔ شاید اس نے غلط موڑ لے لیا تھا۔ وہ پلٹا اور واپس ہوا مگر اب تو وہ بلیرڈ روم کا راستہ بھی نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔ جنرل کی حویلی ایک بھول بھلیاں تھی اور اس وقت بہت سے کمرے نیم تاریک یا مکمل طور پر تاریک تھے۔ اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے اسی گھبراہٹ میں اسکے سامنے جو پہلا دروازہ تھا کھولا اور اس کے اندر گھس گیا مگر یہ کمرہ تو مکمل طور پر تاریک تھا اس قدر تاریک کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سراسیمہ حالت میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا مگر چند ہی سیکنڈز میں اسے اس تاریکی میں نرم قدموں کی تیز تیز چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی اسے کسی لباس کی سرسراہٹ اور خوشبو کا احساس ہوا۔ پھر ایک نسوانی آواز نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا ''آخرکار'' اور دوسرے ہی لمحے کسی نے دو نرم، ٹھنڈی اور کنول کے دھنطلون جیسی بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر اسکے گال پر اپنے نم ہونٹ رکھ دئے۔ مگر فوراً ہی ایک حیرت زدہ دبی دبی چیخ نکلی اور وہ جو بھی تھی ڈر کر اس سے دور ہوگئی۔ وہ خود بھی حیران و شرمندہ تھا۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر اس دروازے کا رخ کیا جس کی جھری سے ہلکی سی روشنی اندر آرہی تھی۔

جب وہ واپس ڈرائینگ روم میں پہنچا تو اس کا دل ایسا دھڑک رہا تھا کہ وہ پسلیاں توڑ کر باہر آجائیگا اور اس کے ہاتھ اس قدر کپکپا رہے تھے کہ اسے ڈر تھا کہ لوگ اس کی چوری پکڑ لینگے۔ اس لئے اس نے اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لئے۔ اسے لگ رہا تھا کہ ساری دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ ابھی ابھی اسے کسی نسوانی وجود نے لپٹایا ہے اور اسے بوسہ دیا ہے۔ مگر جب کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ سب رقص و سرود میں کھوئے ہیں اور کسی کو اسکی پروا نہیں تو وہ اس آگہی کے نشے میں چور ہو گیا کہ ابھی ابھی وہ ایک ایسے تجربہ سے دوچار ہوا ہے جس سے وہ آج تک محروم تھا۔ اسے اپنی پوری زندگی کسی نسوانی قرب کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے کبھی کسی نے بوسہ نہیں دیا تھا۔ وہ ایک عجیب اور انجانے احساس سے دوچار ہو رہا تھا۔ اس کی گردن جہاں کچھ دیر پہلے خوشبو میں بسی دو نرم و نازک بانہیں حمائل ہوئی تھیں ابھی تک اس خوشبو میں بسی تھی۔ اسکا دایاں رخسار جہاں ایک گرم اور نم بوسہ ثبت

ہوا تھا اب بھی اس لمس سے سرشار تھا وہاں بہت ہلکی، بہت ہلکی سی لذت آمیز جلن تھی جیسے پیپر منٹ کھا کر زبان پر ہوتی ہے۔ وہ اسے ہاتھ سے رگڑتا تھا مگر یہ جلن مٹنے کی بجائے اور بڑھ جاتی تھی۔ اگرچہ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ حادثہ تھا مگر پھر بھی اس تجربہ نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اسکا دل چاہتا تھا کہ وہ رقص کرے قہقہے لگائے۔ دوڑ کر باغ میں چلا جائے اور کلیوں اور پھولوں سے باتیں کرے۔ وہ بالکل بھول گیا تھا کہ وہ ڈھلے ہوئے کاندھوں والا پستہ قد اور باگڑ بلے جیسی مونچھوں والا شخص ہے۔ اس کی خود اعتمادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ جب جنرل کی بیگم اس کے پاس سے گذریں تو وہ ان سے باتوں میں الجھ گیا، معمولی سی گفتگو، انہوں نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور صرف اخلاقی تقاضے سے اس کے ساتھ کچھ لمحے گزار کے معذرت کر کے آگے بڑھ گئیں۔

کھانے کے بعد جب وہ اطمنان سے صوفے پر بیٹھا سگار کا مزہ لے رہا تھا اس نے اس کیفیت کا تجزیہ کیا۔ ظاہر ہے کہ کسی لڑکی یا نوشادی شدہ خاتون نے اس کمرے میں کسی سے چھپ کر ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ وہاں دیر سے اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی۔ اس اندھیرے میں جب وہ داخل ہوا تو انتظار اور ملن کی بیتابی میں وہ اسے اپنا محبوب سمجھ کر اس سے لپٹ گئی۔ یہ بات واضح تھی۔۔۔ یہ بوسہ اس کے لئے نہیں تھا پھر بھی اس تجربہ نے اسے ایک ایسی خوشی، ایک ایسے لطف سے آشنا کیا تھا جو اسے پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ کون تھی؟ اسکا تجسس قدرتی تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تمام خواتین کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے سوچا وہ یقیناً جوان تھی کیوں کہ عمر رسیدہ خواتین چھپ کر ملاقات کا وقت طے نہیں کیا کرتی ہیں، اور وہ یقیناً ایک اونچے طبقے کی باوقار خاتون تھی، اسکا لباس، اسکی مدھر اور قیمتی خوشبو اور اسکی آواز کی شائستگی سب اس کی گواہی دے رہے تھے۔ اس نے ایک بار پھر خواتین پر نظر ڈالی، اس کے سامنے جامنی لباس والی لڑکی بیٹھی تھی اس کی خوبصورتی اس وقت بھی نگاہوں کو چکا چوند کر رہی تھی۔ اس نے سوچا یقیناً یہی وہ لڑکی ہے۔ اس کا دل خوشی و غرور سے بھر گیا مگر پھر اس نے دیکھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ ہنس رہی ہے اور وہ کبھی کبھی عجب انداز سے اپنی ناک سکوڑتی ہے، یہ شاید اسکا انداز دلبرانہ تھا مگر اسکی یہ حرکت اسے پسند نہیں آئی اور وہ اسکے دل سے اتر گئی۔ اس کے بعد اس نے اس کالے لباس والی لڑکی پر نظر ڈالی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسکو روبٹ کو کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر اسے حسد ہوا تھا۔ اسکی آنکھیں قدرتی طور پر نشیلی تھیں اور اسکی بھنویں محراب دار تھیں۔ اوہ یہی تھی، کیا خوب، وہ کتنا خوش قسمت ہے مگر جب اس لڑکی نے اپنا چہرہ موڑ کر کسی کی طرف دیکھا تھا اسے لگا کہ اسکا چہرہ تو بالکل سپاٹ ہے، کوئی کشش نہیں! اس نے اس پر سے نظریں ہٹالیں اور مزید چہروں کی تلاش میں لگ گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اگر جامنی لباس والی کے شانے اور کمر اور سیاہ ولباس والی کی آنکھیں اور بھنویں جمع کر کے ایک شکل تشکیل کی جائے تو شاید وہ لڑکی تخلیق کی جاسکے جس نے مجھے بوسہ دیا تھا۔ بدقسمتی سے ایسی کوئی لڑکی اس محفل میں نہیں تھی پر تکلف کھانے، کافی اور برانڈی کے بعد محفل برخواست ہوئی جنرل اور انکی بیگم انہیں چھوڑنے باغیچے کے پھاٹک تک آئے ایک بار پھر انہوں نے رات نہ ٹھہرانے پر معافی مانگی اور افسروں کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے انکی دعوت قبول کی۔ یہ افسر خوشی میں سرشار تھے۔ انہوں نے پلٹ کر اس شاندار حویلی پر نظر ڈالی اور سوچا وقت کے ساتھ ہوسکتا ہے وہ بھی کبھی ایسی حویلی کے مالک ہوں اور ایک اچھا وقت گذاریں۔ واپسی میں انہوں نے وہ راستہ لیا جو دریا کے کنارے کنارے چلتا تھا۔ رات میں کچے شگوفوں کی مہک تھی اور دریا کی سطح پر چاندنی پگھلی ہوئی چاندی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پھر ایک پر کیف شام کے ساتھ قیمتی شراب کے نشے نے ان نوجوانوں میں ایک تازگی اور بالیدگی کا احساس جگا دیا تھا واپس پہنچ کر اس کے ساتھیوں نے جلد لباس تبدیل کیا اور اپنی اپنی کاٹ پر لیٹ کر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ مگر ریابووچ کی آنکھوں سے نیند دور تھی۔ اس نے خیمے کی چھت کو تکتے ہوئے پھر سوچا کون تھی وہ؟؟۔ اسکی گردن پر اب بھی وہی معطر احساس اور اس کے رخسار پر ابھی تک وہ بے نام سی لذت تھی۔ کبھی اس کے تصور میں وہ جامنی لباس والی حسینہ کا تصور ابھرتا تو کبھی سیاہ لباس والی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی، وہ انہیں پکڑنے کی کوشش کرتا مگر یہ ہیولے تھے جو اسکی گرفت میں نہیں آسکتے تھے اور گھڑی کی گھڑی میں تحلیل ہو جاتے تھے۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو اسے نسوانی لباس کی سرسراہٹ اور تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دیتی، وہ گھبرا کر آنکھیں کھولتا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس نے آخر کار کمبل اپنے سر تک گھسیٹ لیا، کچھ دیر اسکی بند آنکھوں میں سائے تیرتے اور الجھتے رہے پھر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نیند کی آغوش میں چلا گیا لیکن نیند میں بھی اسے ایسا لگا کہ اس کے ساتھ ایک غیر معمولی تجربہ ہوا ہے اور جس کی لذت اور مسرت سے اسکا دل لبریز ہو گیا ہے۔

جب وہ سو کر اٹھا تو اگرچہ اس کی گردن اور رخسار سے وہ احساس مٹ گیا تھا مگر پھر بھی اسکا ذہن اس انجانی خوشی سے سرشار تھا جو اس کو ایک رات پہلے حاصل ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کو دیکھا جو اس کے خیمے میں سنہرا رنگ بکھیر رہی تھیں۔ باہر، کھڑکی کے پاس سپاہی اور افسر عام قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ جونیئر کمانڈرز حسب عادت ماتحتوں کو اونچی آواز میں احکامات دے رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد بٹالین اپنی منزل کی جانب راوانہ ہو گئی۔ جب انکی بٹالین کھیتوں سے ہوتی ہوئی ایک سرخ چھت والے کھلیان کے پاس سے گذری تو ریابووچ نے داہنیں جانب حویلی کی طرف دیکھا۔ تمام کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے اور عمارت خاموشی میں ڈوبی تھی۔ ظاہر ہے کہ تمام لوگ ایک ہنگامہ خیز رات کے بعد ابھی تک سو رہے تھے۔ ریابووچ نے سوچا وہ، جس نے کل رات اسے چوم کر زندگی کے ایک ناقابل فراموش تجربہ سے روشناس کرایا تھا وہ بھی سو رہی ہوگی۔ اس نے اسے تصور میں لانے کی کوشش کی، کمرے کی کھلی کھڑکی، جن پر تاڑ کے درخت کی شاخیں جھکی ہونگی، مسہری کے نزدیک ایک چھوٹی میز، کونے میں سنگھار کا آئینہ ایک کرسی اور اس پر بے ترتیبی سے پھیلی اس کی اسکرٹ اور فرش پر دو چھوٹے چھوٹے سلیپرز۔۔۔ یہ سب تخیل میں آسکتا تھا مگر وہ چہرہ؟؟ انسان کی سب سے اہم شناخت، وہ اسکی گرفت میں

نہیں آتا تھا، ایک پارے کی طرح وہ بار بار اسکی انگلیوں سے پھسل جاتا تھا۔ انہی خیالوں میں اس نے آدھے میل کا سفر طر کرلیا مگر ابھی اسے اور آگے جانا تھا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پتھر کا بنا قدیم چرچ، گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکان اور چھوٹی سی ڈھلان کے ساتھ بہتا دریا صبح کی دھوپ میں نہائے ہوئے تھے دریا کے سرسبز کنارے اور گہرا نیلا آسمان ایک تصویر کی مانند لگ رہا تھا۔ اس نے ''مس ٹی چچ'' پر بہت محبت سے ایک آخری نظر ڈالی جس کے ساتھ اس کے دل میں ایک میٹھی سی ٹیس اٹھی جیسے وہ اپنی کسی بہت پیاری چیز سے جدا ہو رہا ہو۔

بٹالین اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کوئی نئی چیز نہ تھی، وہی سرسوں اور گندم کے کھیت، وہی سپاہیوں کے دستے، فوجی گاڑیاں، توپوں کی قطاریں اور جنرل اور اسکے ماتحتوں کی کرخت آواز میں مختلف احکامات۔ اس نے چلنے سے پہلے فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کے واقعہ کو بھول جائیگا۔ وہ واقعہ ہی کیا تھا ایک معمولی سی غلط فہمی مگر پھر بھی چلتے چلتے وہ انہی خیالوں میں کھو جاتا، پھر کسی سارجنٹ میجر کی چیختی آواز جیسے، بریک لگاؤ، دیکھ کے، ہشیار رہو اسکے خیالات کے سلسلے کو توڑ دیتی۔ وہ اسی طرح دن میں خواب دیکھتا جا رہا تھا کہ کسی نے چیخ کر کہا ایک طرف ہٹو، اس نے دیکھا کہ کمانڈنگ جنرل کی گاڑی اپنے پیچھے دھول اڑاتی تیزی سے گذر رہی تھی۔ جنرل اب موٹا اور بھدا ہو گیا تھا اس کی مونچھیں نیچے لٹک گئی تھیں جسے دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کبھی یہ بوڑھا جنرل بھی محبت میں مبتلا ہوا ہوگا، اسے بھی کسی نے چاہا ہوگا، پھر اسکی شادی ہوئی ہوگی، اس کا کنبہ بنا ہوگا اور پھر یہ ایک نہ ایک دن اس دنیا سے گذر جائیگا۔ اس نے سوچا یہ تو عام بات ہے سب کو کبھی نا کبھی محبت ہو جاتی ہے، شادی بھی ہو جاتی ہے اور انکا اپنا کنبہ بن جاتا ہے۔ یہی عام آدمی کا مقدر ہے۔ اس کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے چاہے وہ کس قدر معمولی تھے کیپٹن واٹر کی بڑی توند ہے، اسکی گدی پر بل پڑے ہیں اور وہ کافی بدشکل ہے مگر اسکی بھی ایک بیوی ہے، ایک کنبہ ہے یہ سوچ کر اسے گونا اطمنان ہوا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے اور اسکے ساتھ بھی دیر یا سویر یہی کچھ ہونا ہے۔ اسے اس لحاظ سے خوشی ہوئی کہ وہ ایک عام انسان ہے وقت اسے بھی زندگی کی یہ اہم نعمتیں کبھی نا کبھی مہیا کر ہی دے گا۔

جب بٹالین نے اگلی منزل پر پڑاؤ ڈالا اور کھانے کے بعد وہ اپنے قریبی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیوں میں مشغول ہوا تو اس نے یکا یک اپنے دوستوں سے کہا ''میرے ساتھ جنرل وان ریبیک کی حویلی میں عجب واقعہ پیش آیا'' پھر اس نے بڑی گرم جوشی سے وہ تمام واردت بڑی تفصیل سے دہرائی۔ اسے خیال تھا کہ شاید یہ واردات اتنی اہم تھی کہ اسے بیان کرنے میں صبح ہو جائیگی مگر اسے حیرانی ہوئی کہ یہ تو چند منٹوں ہی میں ختم ہوگئی۔ اس کے قریبی دوست نے قہقہہ لگا کر کہا ''خوب! تو اس عورت نے اندھیرے میں نام لئے اور پوچھے بغیر کسی کی گردن دبوچ لی۔۔ مجھے تو وہ کوئی حواس باختہ یا پگلی لگتی ہے''۔ ریابووچ کو ٹھیس پہنچی مگر اسے بھی خیال آیا کہ واقعہ تو حقیقت میں بہت معمولی تھا۔ اسی طرح باقی ساتھیوں نے بھی اسکا مزاق اڑایا اور پھر اسے اس موضوع کو بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر بھی جب وہ سونے لگا تو اسے مس تیخ چی کا چھوٹا سا گاؤں، وہ گھڑ سوار، پرانا چرچ اور دریا بری طرح یاد آئے۔

کچھ ہفتوں کے بعد اس کو بٹالین کی چند پلاٹون کے ساتھ واپس اسی گاؤں جانے کا حکم نامہ ملا۔ اسکا دل مسرت سے سرشار ہو گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ پھر اسی چرچ کے سامنے مرکزی چوک پہنچ گئے اور خیمہ زن ہوئے۔ پرانے چرچ پر ڈوبتے سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہی پراسرار گھڑ سوار آئیگا اور وان ریبیک کا دعوت نامہ انہیں سنائیگا۔ فوج کا حکم تھا کہ پلاٹون کے افراد جلد سے جلد آرام کریں کہ دوسرے دن انہیں مزید مشقت کرنی تھی۔ وقت گذرتا جا رہا تھا مگر کوئی سوار یا کوئی دعوت نامہ نہیں آیا۔ ریابووچ کی بیقراری بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جیسے ہی جنرل وان ریبیک کو انکے آنے کی خبر ملے گی وہ فوراً انہیں مدعو کریگا۔ مگر اس کی امیدیں بر آور نہ ہو سکیں اور سورج غروب ہونے لگا۔ اپنی بیقراری میں وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور حویلی کی جانب روانہ ہوا، باغیچے کے پھاٹک کے نزدیک پہنچ کر اس نے حویلی پر نگاہ ڈالی، ہر طرف مکمل اندھیرا تھا۔ باغ میں لگے سفیدے اور شاہ بلوط کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ وہ مایوس ہو گیا اسے یقین ہو گیا کہ اس دفعہ جنرل کے یہاں سے کوئی گھڑ سوار پیغام بر نہیں آئے گا۔ اسکی ساری امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اس نے گھوڑا موڑ لیا۔ واپسی میں وہ دریا کے کنارے کنارے بے مقصد دور نکل گیا۔ پہلے کی طرح دریا پر چاندنی نے ایک روپہلی چادر بچھا دی تھی۔ پانی اسی طرح بہہ رہا تھا، ہمیشہ کی طرح، نہ جانے کتنے سالوں سے۔ اس نے سوچا یہ پانی یہاں سے سمندر میں مل جاتا ہے، پھر بھاپ اور بادل بن کر برس جاتا ہے اور دوبارہ دریا میں مل جاتا ہے۔ اسی طرح اانسان کی زندگی ہے وہ پیدا ہوتا ہے، اپنا فرض نبھاتا ہے اور پھر نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے۔ اسے یہ ساری زندگی ایک بے مقصد ڈرامہ لگی ایک ایسا ڈرامہ جس کا کوئی مقصد کوئی انت نہیں مگر ایک ایسا المیہ جو خود کو دہراتا رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ وہ کتنا احمق ہے ایک معمولی واقعہ جس کی کوئی بھی اہمیت نہ تھی اس کے ذہن سے ایسا چمٹ گیا ہے جسے وہ بھولے نہیں بھولتا۔ پھر بھی ایک بیتی یاد اسکے دل میں ایک کسک بن کر اٹھی۔

وہ گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا واپس اپنے کیمپ کی طرف آیا یہاں ایک سناٹا تھا معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی افسروں میں وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اسکے اردلی نے اسے بتایا کہ کچھ دیر پہلے، جیسے ہی وہ یہاں سے گیا تھا جنرل وان ریبیک کا پیغام بر گھوڑے پر سوار آیا تھا جنرل نے سب کو وہاں مدعو کیا ہے اور اب وہ سب وہاں گئے ہوئے ہیں۔ ایک لمحے کو ریابووچ کے دل میں مسرت کی چنگاری بھڑکی اس کے دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اسکا گلا گھونٹ دیا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جنرل کے یہاں نہیں جائیگا۔ وہ اپنی کاٹ پر پیر پھیلا کر لیٹ گیا، کمبل سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور سونے کے لئے تیار ہو گیا۔

''مٹی کا پیکر''

تو صورت اور ہو جاتی

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

وہ جس نے اصل 'میں' کے سامنے
اپنی 'انا' رکھی
خود اپنی ہی
بڑائی کی
اور اپنی 'میں' کو عظمت دی
کہا ''میں آگ کے شعلے کی لو سے ہوں۔''
کہا ''آدم'' تو
ادنیٰ خاک کا پتلا ہے
مٹّی کا پیکر ہے۔
بہت وہ مجھ سے کم تر ہے
میں اپنے سے کسی کم تر کو سجدہ
کر نہیں سکتا
یہی وہ حکم ہے جس کو میں پورا
کر نہیں سکتا

اگر وہ 'میں' کی منطق درمیاں
لائے بنا کہتا
''مرے آقا
میں تیرے حکم کا بندہ ہوں لیکن ماسوا تیرے
کسی بھی 'غیر' کو
سجدہ ادا کرنے سے قاصر ہوں
مری جانب سے
یہ انکارِ سجدہ بھی
مرے ایمانِ محکم کی شہادت ہے
مرے مولا!''

تو صورت اور ہو جاتی۔۔!!

دوہے

انور سدید
(لاہور)

جیون تجھ کو سمجھائے گا، کیا پایا، کیا کھویا
کاٹ اب اپنے کھیت سے وہ سب جو تُو نے ہے بویا

○

بھگت کبیر نے شہر میں آ کر دیکھے شہر کے لوگ
روشن چہروں کے باطن میں اُگے ہوئے تھے روگ

○

زر کا لوبھی نگری کے ہر بندے سے ٹکرائے
لیکن وقت کی دیمک آخر اس کو بھی کھا جائے

○

سب لوگوں کو لگتی ہے یہ دنیا اک گلزار
لیکن دنیا آپ ہے ان سب لوگوں سے بیزار

○

بستی بستی پھرا مسافر، ہر بستی ویران
سونی گلیاں کہتی جائیں اپنا آپ پہچان

○

میں نے اس نگری میں دیکھا ہر بندہ بیمار
سُکھ کا گاؤں شاید انور ہے آنکھوں کے پار

○

آدھی ادھوری ایک نظم،
تمہارے لیے

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

میں نے چاہا تھا نہ لکھوں
کہ تم۔۔۔صحرائے غمِ درد سے گزرے ہو ابھی
آبلہ پا ہو، درد و آلام سے رنجور بھی ہو،
بظاہر خوش دِکھتے ہو مگر
بہ باطن زخم خوردہ ہو
غمِ فرقت بھی، تازہ تازہ ہیں ابھی
تیری اشکوں سے لبریز آنکھوں میں
درد و کربِ ہجر کے لہراتے ہیں سائے ابھی
اس لیے میں نے سوچا تھا کہ نہ لکھوں،
کہ میری نظمیں
ترے زخمِ دل ہرا کرتی ہیں
بھیگ جاتی ہیں تمہاری آنکھیں پڑھ کر جن کو
نظمیں بھیج کر، تمہیں اور غم گین نہ کروں
مگر، تم تو ہر حال میں
بضد رہے، نہ جانے کیوں؟

سچ ہے، کہ رنجیدہ ہوں بہت،
پریشاں بھی ہوں، زخمِ فرقت بھی تر و تازہ ہے ابھی
مگر تم
ہمدرد ہو، غمخوار ہو، اور سچے بھی تو ہو۔
دل کی گہرائیوں میں اُترنے میں ماہر بھی تو ہو
تیرے الفاظ کا مرہم پاتے ہیں تو لگتا ہے
سانسیں چلتی ہیں کہ ہم زندہ ہیں ابھی

تیری نظم کا ہر لفظ میرے غموں کا مداوا ہے
اے ہمدرد!
اس لیے لکھو، خوب لکھو، لکھتے رہو
جب تک قرطاس و قلم و سیاہی دم توڑ نہ دے
تم لکھتے رہو۔
آہ! کوئی بھی نہ ملا، کوئی بھی تو نہ تھا
ماسوا تیرے، جو میرے دل کے درد کی تہہ میں اُترا ہو کبھی
اور سنے، محسوس کرے درد کے نالے اِس دلِ رنجور کے
گاہے محسوس ہوتا ہے مجھے اکثر
کہ میری خاموشیوں میں نہاں درد کو جان لیا ہے تم نے
منکشف ہو گئے ہیں تم پر میرے راز بھی
اس لیے مجھکو یقین ہے کہ تم
جو بھی لکھو گے سچ لکھو گے، جو طوفانِ بلا نازل
ہوا ہے مجھ پر، اُس کی روداد لکھو، اُس کے
پل پل کا احساس لکھو، کہ تم
سچّے ہو، غمخوار ہو، ہمدرد بھی ہو
تمہارا لکھتے رہنا بے حد ضروری ہے ابھی
زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے تیرا ہر لفظ مجھے
اس لیے لکھو، خوب لکھو، لکھتے رہو
جب تک تیری قرطاس و قلم چلے، لکھتے رہو
کہ تیری نظمیں میرے غموں کا مداوا ہیں، غمخوار میرے

○

جذبے صادق

کرشن گوتم

(چندی گڑھ، بھارت)

وہ زمیں پر نہ کہیں زیرِ زمیں ہوتے ہیں
دردِدل جس میں ہو اُس دل میں مکیں ہوتے ہیں

کچھ مہربان تو ہوتے ہیں وہ مجھ پر لیکن
یہ ضروری نہیں جتنے وہ حسیں ہوتے ہیں

دو دلوں ہی میں تو ہر بات بنا کرتی ہے
ہوں اگر تین تو جھگڑے بھی وہیں ہوتے ہیں

رخنہ اندازی بہر طور شیوہ جن کا
وہ امن دوست کسی طور نہیں ہوتے ہیں

بات کو تہ نہ کرو، طے کرو اک دن ہم سے
جذبے صادق کبھی ناکام نہیں ہوتے ہیں

ہوسِ زر ہو کہ زن ہو کہ زمیں اے جانم!
اس کے مارے ہوئے زندہ بھی کہیں ہوتے ہیں؟

رہے لوگوں میں امن ہے یہ رضا مولا کی
اس پہ قائم ہیں جو فرخندہ جبیں ہوتے ہیں

وہ جو انسان ہیں، بندے ہیں خُدا کے گوتم!
اُن کے شیطان سے اطوار نہیں ہوتے ہیں

○

''خاکی وردی''

(ضربِ عضب ''غازی وادیٔ تیرہ'' کرنل رفعت اللہ صاحب
کے جذبۂ حُب الوطنی کے نام)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

قائدؒ کی عظمتوں کے پاسدار آپ ہیں۔۔۔
پھر پاک فوج کے بھی وفادار آپ ہیں۔۔۔
ناموسِ ملک وقوم کے جی دار آپ ہیں۔۔۔
حبِ وطن کے واسطے سرشار آپ ہیں۔۔۔
اِن ساری ترجیحات پہ ہو قوم کا سلام۔۔۔!
وانا، سوات اور دیگر معرکوں کے بعد۔۔۔
لوٹے ہیں تیرہ وادی سے افسردہ اس لیے۔۔۔
کہ کامیاب آپریشن کے بھی باوجود۔۔۔
جامِ شہادت وہ نہیں ہیں نوش کر سکے۔۔۔
یونٹ کے سب جوان ملی شان رکھتے ہیں۔۔۔
اور آپ کے کہے کا کتنا مان رکھتے ہیں۔۔۔
اس صلے میں وہ قوم سے انعام پاتے ہیں۔۔۔
غازی شہید ہو کے وہ مقام پاتے ہیں۔۔۔
خواہش دفاعِ وطن کا رہے جاں سے بھی عزیز۔۔۔
وعدہ جو خاکی وردی سے ہے آپ نے کیا۔۔۔
ہر قطرۂ خوں سے ہو پھر حق اس کا بھی ادا۔۔۔
نذرانہ جسدِ خاکی، ارضِ پاک کو قبول۔۔۔
مولا کی بارگاہ میں یہ ایثار ہو قبول۔۔۔
سارے وطن کی ہواؤں کا آپ کو سلام۔۔۔
سارا وطن آپ کو کہتا رہے سلام۔۔۔!

○

لغزشوں کا حال

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

ہم کبھی ایسے تغافل کے روا دار نہ تھے
دل سے مجبور ہیں ہم پھر بھی تمہیں کو چاہیں

وہ دل میں بس رہے ہیں مگر اجنبی سے ہیں
ہم دل کی دھڑکنوں کو کیسے اُنہیں سنائیں

شمع جلتی ہے تو پروانے کھینچے آتے ہیں
پر جلاتے ہیں وہ مرجاتے ہیں بھر کر آہیں

وہ بدگماں رہے ہیں وفا پر میری سدا
اُن کا خلوص انکی محبت کہاں سے پائیں

وہ چل دیئے سنا کے میری لغزشوں کا حال
خود سے اُلجھ گئے ہیں کیسے اُنہیں منائیں

جو داستانِ محبت تھی آج ختم ہوئی
آؤ ذرا کہ حالِ محبت تمہیں سنائیں

کہاں گئے وہ جو سارے چمن کی زینت تھے
ہیں وہ نایاب کہاں ڈھونڈنے انکو جائیں

سفر طویل وکھٹن زادِ راہ کچھ بھی نہیں
اس راہِ پُر خطر میں خجالت کہاں چھپائیں

خود کو پایا روزِ محشر میں نے یوں تنہا ریاضؔ
دست و پا بوے مخالف بند پائیں ساری راہیں

نقوشِ مصوّر

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

جو بزم مصطفیٰ کا تھا طائر چلا گیا
شہرِ سخن کو چپ لگی شاعر چلا گیا

جلتا نہ تھا چراغ کوئی جس کے سامنے
وہ یادگارِ حضرت ساحر چلا گیا

دن بھی بہت عظیم مہینہ بہت عظیم
کتنی تھی اس کی روح مطاہر چلا گیا

جگنو پکارتے ہیں اُسے رو میں تتلیاں
آیا تھا اک چمن میں مسافر چلا گیا

لوگوں نے ساری عمر نبھائی عداوتیں
لکھ کر محبتوں کے مناظر چلا گیا

چاہے اگر کوئی تو مٹے گا نہ اس کا نام
وہ چھوڑ کر نقوشِ مصوّر چلا گیا

بیدل کی محفلوں کی نشانی تھا شہر میں
اپنے خدا کے ہو گیا حاضر چلا گیا

کس کا سدا قیام رہا ہے یہاں عدیلؔ
جانا تھا اس کو ایک دن آخر چلا گیا

○

(بیادِ مظہر اختر)

انتباہ

مجیب شہزر
(علی گڑھ، بھارت)

بھرم ہی تھا سوچنا تمہارا
تمہارے ہجر میں مرجائیں گے
تمہاری پوجا کرنے والے
اسی بھرم میں رہ کر تم نے
اُن کے دلوں کو بہت دُکھایا
ستایا اور بے حد تڑپایا
درد بسا کر ان کے دل میں
رات رات بھر انہیں جگایا
رُلایا ان آنکھوں کو تم نے
تھیں جو تمہاری دید کی پیاسی
شیشہ دِل پر تم نے ان کے
دستِ غرور سے مارے پتھر
دل کے کومل جذبوں پر
اور روح کی نازک رگ پہ تم نے
چلائے خنجر
تمہارے عاشق
پاس وادب کے متوالوں نے
خندہ پیشانی سے سہا
ہر ظلم تمہارا
ستم تمہارا
لیکن تم کو خبر نہیں ہے
کہ جو تمہارا دم بھرتا ہے
انا کا بھی جوہر ہے اس میں
جاگ اٹھی گر اس کی انا تو
پارہ پارہ ہو جائے گا
تمہارا جادو
پھر وہ تم سے ملنے کا ارمان بھلا کر
ہجر کا جام بھی پی لے گا وہ
بنا تمہارے جی لے گا وہ!

عارفاں دے سلطان

حنیف باوا (جھنگ)

باہو
ہُو داسنگی
ہُو۔
اک خوشبُو داناں
جھیڑی
چاواں دی کھُونٹاں۔
چگ دیاں مسیحاوے
ہُو اک بُوٹی
مرشد من وچ لائی
اندر بُوٹی مشک مچایا
جاں پھُلاں تے آئی
ہُو۔
اک علم سمندر
باہو پیتا
پی ڈکار نہ لیتا
کدی کتاباں
بغل نہ چائیاں
کدی نہ علم دی ڈونڈی پٹّی
علم سمندر پی کے عارف
بناں تاڑیوں
اُڈن ہارا پچھی ہویا
ہُو۔
دھرتی دے وِچ لُکیا توں
باہو لبھیا
تاہیوں تاں
عارفاں دے سلطان
چنگا چوکھا ویکھ کے وی
لمی آئت نہ چھوئی
ہوُ۔
نہ مُلاں نا قاری اندر
ہُو دا کھوٹھا
عارف دا دِل ہویا
باہو دا دِل ہویا

''اردو ناول کا دیو''

فخر زمان
(لاہور)

یہ ساٹھ کی دہائی میں جون کی ایک جھلساتی ہوئی سہ پہر کا ذکر ہے۔ میری تعیناتی گوجرانوالہ بہبودآبادی میں بطور ضلعی افسر کے طور پر ہوئی تھی۔ میرے دفتر کا ایک ایئر کنڈیشنر خراب تھا جسے ایک مکینک ٹھیک کر رہا تھا۔ میں کسی فائل میں کھویا ہوا تھا جب اچانک ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ''ہیلو، فخر'' میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی یہ محمد خاں تھے۔ میں فوراً ہی اپنی کرسی سے اُٹھا میز کا چکر کاٹ کر اُن تک پہنچا اور بغلگیر ہوا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ اتنے سال کہاں رہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک سیمنٹ فیکٹری میں ملازمت مل گئی تھی جب کہ وہ صنعتی تعلیم کیمسٹری میں اعلیٰ تعلیم کے لئے کینیڈا چلے گئے۔ اب ڈنڈوٹ سیمنٹ فیکٹری میں واپس آچکے تھے۔ ہم گجرات، ''زمیندار کالج'' اور وہاں کے اساتذہ کے بارے میں بات کرتے رہے۔ تب اچانک انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ اُردو شاعری کی ہے، اور کچھ مضامین انگلش، اردو رسالوں کے لئے لکھے جنھیں ایوب دور میں بند کر دیا گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ انھی دنوں میں ایک ناول ''اداس نسلیں'' کے عنوان سے پڑھا تھا جسے عبداللہ حسین نامی کسی شخص نے تحریر کیا تھا۔ اس تاریخی ناول میں تاریخ کو از سرِ نو پیش کیا گیا ہے اور لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو یاد کیا گیا ہے۔ محمد خان نے شرماتے ہوئے مسکرا کر کہا 'میں ہی عبداللہ حسین ہوں۔'

میری حالت ایسے شخص جیسی تھی جس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ ''مجھے علم نہیں تھا کہ آپ لکھتے ہیں۔ آپ نے اپنا نام کیوں بدلا؟'' وہ پھر سے مسکرائے اور بولے ''میرے ناشر نے مجھے نام بدلنے کو کہا عبداللہ حسین اسی کا تجویز کردہ نام ہے۔ میرا ہی ہم نام ایک ڈاکو ''محمد خان'' بھی مشہور ہے۔' یہ کہتے ہوئے وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ ہم دیر تک سیاسی، سماجی اور ذاتی نوعیت کے معاملات پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ پھر سے آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اس کے بعد میں لاہور منتقل ہو گیا۔ وہ ہماری مہرباں بھابھی ڈاکٹر فرحت کی وجہ سے زیادہ تر فیصل آباد میں رہتے تھے۔ لاہور آتے تو مجھے ضرور ملتے۔ ہم نے موسیقی سننے اور قومی اور بین الاقوامی امور پر بحثیں کرتے ہوئے کئی شامیں اکٹھی گزاریں۔ ان محفلوں میں ہمارے مشترکہ دوست مستنصر حسین تارڑ، ریاض چیمہ، مشتاق بٹ، دل نواز دل، حسین شاد، محمد نثار حسین اور ظہور اقبال بھی شامل ہوتے تھے۔ اسی دوران میں نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا گھر خریدا۔ وہ اپنے بھتیجے سے ملنے آتے جو کہ میری ہی گلی میں رہتا تھا تو مجھ سے بھی ملتے۔ اور یوں ہم نے دوستوں کے ساتھ اور کبھی اکیلے ہی کئی شامیں گزاریں۔

اس دوران میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا اور سیاسی طور پر سرگرم تھا۔ مجھے اُن کا خط ملا کہ وہ لندن منتقل ہو گئے تھے۔ 80 کی دہائی میں تین چار بار اُن سے لندن میں ملاقاتیں ہوئی اور میں اُن کے پاس جا کر ٹھہرا۔ محمد خان اعلیٰ حس مزاح کے حامل تھے اور بہت باعلم آدمی تھے۔ انگریزی پر اُنھیں غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ایک بار لندن میں ایک تقریب کے دوران مشہور مستشرق ''ڈاکٹر این میری شمل'' سے اُن کی گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ ایک قابل قدر عالم ہیں لیکن ان سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ پاکستان جائیں اور جنرل ضیاء الحق سے ملاقاتیں کریں۔ اس سے آمر کو تقویت ملتی ہے۔ ڈاکٹر شمل کو یہ بات پسند نہ آئی اور وہ اپنا دفاع کرنے لگیں۔ اس واقعہ کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں تا کہ یہ بتا سکوں کہ محمد خاں ایک جمہوریت پسند، لبرل، سیکولر، ترقی پسند اور انسان دوست انسان تھے۔ انھوں نے کبھی موقع پرست لکھاریوں کی طرح جن کی آج بھی ادب کے شعبے میں کمی نہیں ہے، اپنے الفاظ کو غلط استعمال نہیں کیا اور نہ ہی اپنی عزت نفس کا سودا کیا۔ اسٹیبلشمنٹ اور غیر جمہوریت پسند قوتوں کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے۔

چند سال پہلے میں نے اُنھیں دعوت دی کہ وہ گجرات چلیں جہاں وہ طویل عرصے سے نہیں گئے تھے۔ وہ بہت پر جوش تھے۔ وہاں وہ میرے گھر میں رہے اور اپنے آبائی گھر بھی گئے۔ وہ گھر اُنھوں نے اندر سے پورا دیکھا۔ وہاں رہنے والوں سے بات چیت کی اور پھر واپس آئے تو مجھے اُن کی آواز بھرّائی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اُنھیں اپنے گھر کے سامنے سڑک کا ایک حصہ دکھایا جہاں میں اپنے سکول کے ساتھیوں کے ساتھ کرکٹ اور ہاکی کھیلا کرتا تھا۔ وہ برابر کے محلے سے بائیسکل چلاتے ہوئے آتے کہ اپنے لمبے قد کی وجہ سے پیڈل مارنے میں انھیں دشواری ہوتی تھی۔ وہ ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتے اور اپنی آبائی زمین کی طرف چلے جاتے جو گجرات شہر کے قریب واقع تھی۔ دو سال پہلے ہم گجرات یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور میرے دوست ڈاکٹر نظام الدین کی دعوت پر گجرات یونیورسٹی میں ایک تقریب میں گئے۔ انہوں نے اپنی مخصوص بے تکلفی، حس مزاح اور قطعی لہجے میں طلبہ اور اُساتذہ سے خطاب کیا۔ طلبہ اُن کی آمد پر بہت خوش تھے کیونکہ عبداللہ حسین ایک بڑے لکھاری ہی نہیں ہیں بلکہ اُس مٹی سے بھی اُن کا تعلق ہے۔

1995 میں مجھے اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین بنایا گیا تو میں نے اُنھیں اکادمی میں آنے کی دعوت دی نہ صرف یہ کہ وہ میری دعوت پر اکادمی آئے بلکہ انہوں نے اکادمی کے رائٹرز ہاؤس میں لمبے عرصے کے لئے قیام کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ مکمل تنہائی میں اپنے ناول ''ناداروگ'' پر کام مکمل کرنا چاہتے

تھے۔ وہ دن رات لکھتے تھے اور جب کچھ ہوا بدلی کا ارادہ ہوتا تو میرے دفتر آجاتے، کافی کا کپ پیتے اور باتیں کرتے۔ میرے دوست طارق خورشید بھی وہیں ان گفتگوؤں میں شامل ہوتے۔ اُنھیں اُن کی کتاب ''سوئے دار'' پر جوان کی شان دار سوانح حیات ہے، صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی بھی ملا۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں وہ آٹھ سال زیر حراست رہے پھر وہ لیبیا چلے گئے تھے بعد میں فوجی حکومت نے ان پر مقدمہ چلایا اور اٹک قلعہ میں بند کر دیا۔

اُسی دور میں پاکستانی اہل قلم کا ایک وفد میں چین لے کر گیا جس میں محمد خان کے علاوہ فہمیدہ ریاض، عطا شاد، پروفیسر غلام مصطفے بھی شامل تھے۔ وہاں انھوں نے چائنیز رائٹرز یونین کے منتظمین اور چینی اہل قلم سے عالمی ادب، چینی ادب اور پاکستانی ادب پر طویل مکالمے کئے۔ چینی اہل قلم نے ان کا نہایت خوش دلی سے استقبال کیا کیونکہ وہ ''اداس نسلیں'' چینی زبان میں پڑھ چکے تھے۔ میں اسلام آباد واپس آیا تو یونیسکو کے سفیر خواجہ شاہد حسین کا فون آیا کہ یونیسکو کسی نمائندہ پاکستانی کتاب کو شائع کرنا چاہتی ہے۔ میں نے خواجہ صاحب کو ''اداس نسلیں'' کی کاپی بھجوادی۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ اُسے انگریزی میں ترجمہ کر کے چھاپنا چاہتے ہیں۔ میں نے محمد خان سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ وہ خود اسے انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے باکمال انداز میں کیا۔ یہ ناول یونیسکو کے تعاون سے لندن کے پبلیشرز پیٹر اُوون نے "The Weary Generations" کے نام سے شائع کیا۔

2004 میں ورلڈ پنجابی کانگرس کو ہریانہ کے وزیر اعلیٰ روپی چاولہ نے ایک وفد انڈیا لانے کی دعوت دی۔ میں نے محمد خان سے درخواست کی کہ وہ وفد میں شامل ہوں کیونکہ اس سے ہمارا وقار بڑھے گا۔ ہم نے چند دن کروکھیشتر (جہاں مہابھارت لڑی گئی تھی) میں ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ وہاں سے ہم اکٹھے دہلی گئے اور ہریانہ ہاؤس میں ٹھہرے۔ مجھے یاد ہے کہ دہلی جاتے ہوئے راستے میں میں نے اُن سے ذکر کیا کہ میرے بھتیجے کو کینیڈین ویزہ حاصل کرنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ وہ بولے کہ میں اپنی ہونہار بیٹی نور سے بات کروں گا شاید وہ اسلام آباد میں ہماری کچھ مدد کر سکے۔ ہم نے گاڑی ایک PCO کے ساتھ روکی اور انھوں نے اسلام آباد نور سے بات کی۔ میں ہمیشہ اُن کی محبتوں کا زیر بار رہا جو اُن کی شخصیت کے امتیازی اوصاف ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار لندن سے، جو ہمیشہ سے مجھے پسند ہے، انھوں نے مجھے خط لکھا کہ اگر میرا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو میں خواہش کرتا کہ وہ تم جیسا ہوتا۔

ورلڈ پنجابی کانگرس نے دسمبر 2013 میں امن پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ وہ ہمارے معزز مہمانوں میں شامل تھے۔ اہل قلم اور امن کے موضوع پر انہوں نے ایک یادگار تقریر کی۔ اسی سال فروری میں میں نے انھیں قومی پنجابی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ خرابی صحت کے باوجود تشریف لائے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انھیں فخر ہے کہ وہ پنجابی ہیں، اور یہ کہ ان کی مادری زبان پنجابی ہے اور اُن کی خواہش ہے کہ وہ پنجابی میں ناول اور کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے پنجابی اہل قلم پر زور دیا کہ وہ خالص پنجابی لکھنے اور غیر معروف اور قدیم الفاظ لکھنے کے رویے سے خود کو بچائیں۔ انھوں نے یہ بھی اصرار کیا کہ مڈل کلاس کے قارئین کی پنجابی کے خلاف مزاحمت ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایسے الفاظ استعمال کریں جو ہماری روزمرہ زبان سے موافق ہوں۔

اپنی وفات سے کوئی دو ہفتے پہلے میں نے انھیں فون کیا تو انھوں نے اپنی بیماری کی تفصیلات مجھے بتائیں۔ قدرتی طور پر یہ سن کر میں بہت پریشان ہوا۔ ہماری دوستی کئی دہائیوں پر محیط تھی۔ میں ان سے مل کر ان کی ڈھارس بندھانا چاہتا تھا لیکن وقت نے اس کی مہلت نہ دی۔ ایک عالیشان ادیب محمد خان، جو برصغیر کا سب سے اہم ادیب تھا، اب ہم میں نہیں رہا۔ اس ادیب نے جو شعبہ ادب میں نہایت قدر و منزلت کا حامل ہے، کئی نسلوں کو اپنی تحریروں سے متاثر کیا۔ میرے لیے وہ محمد خان ہیں جب کہ دنیا کے لیے عبداللہ حسین۔ آپ اردو ادب کی پہچان بن کر اور انسان دوستی، تحمل اور لبرل ازم کے علم بردار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

''حیراں ہوں''

ورلڈ پاپولیشن پراسپیکٹس کے مطابق دنیا کی کل آبادی سات ارب تیس کروڑ ہوگئی ہے جس میں نوّے کروڑ دس لاکھ ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کے بزرگوں پر مشتمل ہے جو کُل آبادی کا بارہ فیصد بنتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق دنیا کی آبادی میں ایک اعشاریہ اٹھارہ فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے جبکہ بزرگوں کی آبادی تین اعشاریہ چھبیس سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔

پاکستان میں ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کے لوگوں کی تعداد چھ اعشاریہ چھ فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے جبکہ آنے والے دنوں میں اسّی سال یا اس سے زائد عمر کے افراد دوگنا ہو جائیں گے۔

یورپ دنیا کا سب سے بزرگ خطہ ہے جہاں ان کی تعداد چوبیس فیصد یعنی ہر چوتھا فرد ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کا ہے۔ لاطینی امریکہ اور کریبین کی ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کے لوگوں کی آبادی ۲۰۱۵ء میں گیارہ فیصد سے بڑھ کر ۲۰۵۰ء تک چھبیس فیصد ہو جائے گی۔ ایشیاء کی بارہ فیصد سے بڑھ کر پچیس فیصد، شمالی امریکہ کی اکیس فیصد سے اٹھائیس فیصد، مجموعی طور پر دنیا میں ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کی تعداد ۲۰۳۰ء میں ایک اعشاریہ چار ارب جبکہ ۲۰۵۰ء میں دو اعشاریہ ایک ارب تک پہنچ جائے گی۔

جی آیاں نوں

(محکمہ واپڈا کے متعلقین کے لیے بطور خاص)

آپا جمیلہ شبنم

(اسلام آباد)

بارش کی نوازش سے گرمی کا غصہ کچھ کم ہو گیا تو ہم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بستر میں گھُس گئے اور خوابوں کی نگری میں پہنچ گئے کہ کسی نے ہولے سے ہمارے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں جگاتے ہوئے کہا'' کیا بات ہے ہر وقت خواب دیکھتے رہتے ہو''۔ ہم نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ کیا نام ہے تمہارا۔۔۔کس نام سے پکاروں؟ اس نے کہا۔ زندگی کی راہ میں ایسے بھی ہیں مہربان۔۔۔جب ملے یوں ملے جیسے جانتے نہیں۔۔۔خیر تم پاکستانیوں میں بس یہی عادت بری ہے۔ بارش شروع ہوئی اور تم بُکل میں منہ دے کر سو جاتے ہو۔۔۔ بھیگے ہوئے موسم کا مزہ کیوں نہیں لیتے۔ وہ ہمارا ہاتھ تھامے باہر برآمدے میں لے آئی۔ بادلوں کی اُوٹ سے چاند ہمیں چھپ چھپ کر دیکھنے نکلا تو اس نے ہمیں کہا۔ چلو دلدار چلو۔ چاند کے پار چلو۔۔۔

ہم نے ترنت کہا۔ ہم ہیں تیار چلو۔۔۔چاندنی میں نہائی ہوئی اجنبی لڑکی کو دیکھا تو ہماری چیخ نکل گئی۔ کوئل کی طرح سریلی آواز اور کوئل کی طرح کالا سیاہ رنگ۔۔۔کالی کالی بڑی بڑی آنکھیں، کالے کالے گھنگریالے بال، کالا گھاگھرا، کالی چولی، سولہ سنگھار کئے ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ ہم نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا''تم چڑیل ہو'' اس نے کہا اللہ پاک کی قسم میں چڑیل نہیں ہوں۔ میرے پاپا ماما افریقہ کے جنگلوں سے پاکستان آئے تھے۔ پاپا کا نام''بلیک آؤٹ'' تھا۔ ۶۵ء اور اے کی جنگوں کے بعد میرے والدین یعنی مسٹر اینڈ مسز بلیک آؤٹ کو واپس ان کے وطن بھیج دیا گیا۔ میری پیدائش پاکستان میں ہوئی تھی۔۔۔ مجھے تو پاکستان ریذیڈنٹ ویزہ مل گیا ہے۔ اب میں نے پاکستان میں ہی رہنا ہے۔ جینا یہاں، مرنا یہاں۔۔۔اس کے سوا جانا کہاں۔

ہم نے اُس سے پوچھا''مس لوڈشیڈنگ تم ہر وقت کالا لباس کیوں پہنتی ہو۔۔۔؟'' وہ زور سے ہنسی اور سوائے اس کے سفید دانتوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ بولی۔۔۔تم اتنے فیشن سے لاعلم ہو کہ تمہیں پتا نہیں کہ بلیک رنگ تو آج کل بالکل (IN) ہے۔ ٹی وی پر شیخ رشید صاحب بھی کالا لباس پہن کر آئے تھے بزم طارق عزیز میں طارق عزیز بھی کالے کپڑے پہنتے ہیں۔ میں تو فلم سٹار نرگس کی طرح سوہا جوڑا پہن کر آنا چاہتی تھی مگر''ان'' کا کہنا ہے''تو کالا جوڑا پا ساڈی فرمائش تے'' ہم نے پوچھا لوڈشیڈنگ تمہارے''ان'' کا کیا نام ہے۔۔۔؟ وہ ذرا شرما کر بولی۔۔۔ان کا نام واپڈا ہے۔ واپڈا ہی میرا گھر والا ہے۔ تم تو کوئی خلائی مخلوق لگتے ہو کیوں کہ پاکستان میں سب جانتے ہیں کہ لوڈشیڈنگ کا گھر والا واپڈا ہے۔ پھر تمہیں کیوں معلوم نہیں کہ دل میرا اور دھڑکن واپڈا کی۔۔۔ہم نے بے زار ہوتے ہوئے کہا چُپ۔۔۔تم کتنی باتونی ہو ہم سب نے کل ہی شمشان گھاٹ جا کر تمہاری چِتا سے پھول پتیاں چن کر چھوٹی ٹکی میں بند کر کے اوپر لال کپڑا ڈال''لئی ندی'' میں بہائی تھی۔ پھر لوڈشیڈنگ تمہارا دوسرا جنم اتنی جلدی پھر ہو گیا۔۔۔وہ کیسے اور کیوں۔۔۔؟''

اس نے کہا تم سٹار پلس کے ڈرامے بہت دیکھتے ہو۔ تم خواہ مخواہ میرے مرنے کا خواب دیکھتے ہو۔ واپڈا میرا گھر والا جب تک زندہ ہے میں بھی زندہ رہوں گی۔ ہم نے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی ہیں۔ اب اگر تم نے میرے مرنے کی بات کی تو میں تمہارا گلا دبا کر تمہاری زندگی کی لوڈشیڈنگ کر دونگی۔ اس نے لمبے لمبے کالے ہاتھ میری گردن پر رکھ دیے پھر وہ جاتے جاتے کہنے لگی۔''ہر وقت مجھے کوستے رہتے ہو کبھی مجھ کو اپنا تو کہہ کر دیکھو۔ میرے فوائد گِنو اور دیکھو فوائد کا پلڑا بہت بھاری ہوگا۔ ہم نے ڈراؤنے خواب سے جاگتے ہوئے کمرے میں نظر دوڑائی ہر طرف اندھیرا تھا۔ لوڈشیڈنگ جا چکی تھی ہم نے لوڈشیڈنگ کے کہنے پر اس کے فائدے گننا شروع کیے۔

(۱) چار چار گھنٹے لوڈشیڈنگ کی وجہ سے بجلی نہ آئے گی تو بل شرطیہ کم ہوگا۔ پچاس یونٹ سے جتنے یونٹ بڑھتے جائیں گے اتنی ہی قیمت بڑھ جائے گی۔

(۲) بجلی سے چلنے والی سب چیزیں مثلاً فریج، ٹی وی، استری لوڈشیڈنگ کو دعا دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان کو تھوڑا آرام کا موقع مل جاتا ہے اور ان کی زندگی کے دن بڑھ جاتے ہیں اور پنکھے لوڈشیڈنگ سے خوش ہیں بلکہ بہت خوش ہیں وہ ہر وقت چھت سے الٹے لٹکے ہوئے ہم سب کو کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی ہوا دیتے ہیں۔ لوڈشیڈنگ ہوتی ہے تو پنکھے بھی سُکھ کا سانس لیتے ہیں۔

(۳) لوڈشیڈنگ کی وجہ سے خاندانوں میں یک جہتی ہو گئی ہے۔ فیملی ٹائم پرانے وقتوں کی طرح لوٹ آیا ہے۔ پاپا اپنے کمپیوٹر کے سامنے سے اُٹھ جاتے ہیں۔ بچے وڈیو گیم بند کر دیتے ہیں۔ ماما سٹار پلس بند کر دیتی ہیں اور گرمیوں میں سب اپنی اپنی چھت پر بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں اور یوں لوڈشیڈنگ نے فیملی ٹائم ہمیں لوٹا کر Lack of Communication ختم کر دی۔ لوڈشیڈنگ نے خاندان کے سب افراد میں پیار کا رشتہ مضبوط کر دیا۔

(۴) لوڈشیڈنگ نے بزرگوں کی اہمیت اجاگر کر دی ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی بچے کبھی دادی اماں اور کبھی نانی اماں سے کہانی سننے کے لیے آجاتے ہیں اور بڑی ماں کہتی ہیں ایک تھا چڑا اور ایک تھی چڑی۔ نئی پود باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ سیکھ رہی ہے اور یہ احسان لوڈشیڈنگ کا ہے۔

(۵) سینئر سٹیزن جن کو گھر کے کونے میں الگ ڈال دیا جاتا تھا ان کو بھی

لوڈشیڈنگ کی وجہ سے چھت پر خاندان کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ورنہ ہر خاندان کا فرد اپنی اپنی دنیا میں مصروف رہتا تھا اب یہ بزرگ کہہ رہے ہیں کہ لوڈشیڈنگ نے ہماری بلّے بلّے کرادی۔ واہ واہ شاباش لوڈشیڈنگ۔

(۶) لوڈشیڈنگ سے ''آنکھیں'' بہت خوش ہیں۔ انہیں گھنٹے آدھے گھنٹے کے لیے سہی تیز روشنی سے چھٹی مل جاتی ہے کیوں کہ نہ لکھنا نہ پڑھنا، نہ ٹی وی نہ کمپیوٹر۔۔۔ نہ سینما نہ پرونا۔ سب سے چھٹی۔ بصارت کو مکمل آرام، اکھیاں لوڈشیڈنگ کی شکرگزار ہیں تبھی تو ہر وقت گاتی رہتی ہیں۔

اکھیاں پکاردیاں۔۔۔ دل واجاں ماردا۔۔۔ آجا پردیسیا واسطہ ای پیاردا۔۔۔

آجاتینوں اکھیاں پکاردیاں۔

(۷) ہمارے ہاں بے روزگاری دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ لوڈشیڈنگ نے موم بتیوں کے روزگار کو بہت فروغ دیا ہے۔ پہلے تو موم بتیاں برتھ ڈے کیک پر ہی نظر آتی تھیں۔ ہائی سوسائٹی اور فائیو سٹار ہوٹل میں لوگ ڈنر بھی کینڈل لائٹ میں کرتے تھے مگر اب تو گھر گھر میں عوام بھی موم بتیاں جلا کر ڈنر یعنی کھانا کھانے کا لطف اُٹھاتے ہیں۔۔۔ اور یوں خاص و عام بڑا ہی رومانٹک ڈنر کرتے ہیں۔

(۸) لوڈشیڈنگ کا ایک بڑا احسان طالب علموں اور خصوصی طور پر چھوٹے بچوں پر ہے مائیں وقت سے پہلے ہی بچوں کو ہوم ورک کروا دیتی ہیں اور لوڈشیڈنگ کے وقت بچے اپنے والدین کے ساتھ بزرگوں کے ساتھ فیملی ٹائم گزارتے ہیں اور معلومات و پہیلیاں پوچھتے ہیں۔ کوئیز کھیلتے ہیں اور اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دیتے ہیں۔

(۹) لوڈشیڈنگ نے ہاتھ کے پنکھوں کی صنعت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ مرد بھی ہاتھ کا پنکھا ''جھل'' رہے ہیں۔ ہیر کی روح کتنی خوش ہورہی ہوگی ورنہ پنکھا جھلنے کی ڈیوٹی سدا ''ہیروں'' کی تھی۔ لوڈشیڈنگ کی وجہ سے اب گھر گھر میں رانجھے گاتے ہیں۔ ''ہیر ہیر کردے آسی آپے ہیر ہوئے یارو سانوں ہیر آکھو۔۔۔ رانجھانہ آکھو کوئی''

ہیر کی طرف سے لوڈشیڈنگ کو بے بہا پیار۔

(۱۰) لوڈشیڈنگ سے ہماری صحت بہت اچھی ہوتی ہے۔ گرمی کی وجہ سے پسینہ آتا ہے جس سے جسم کے مسام کھل جاتے ہیں۔ بلڈ پریشر بھی نارمل ہو جاتا ہے۔ چربی بھی کم ہو جاتی ہے۔ کولیسٹرول بھی کم ہو جاتا ہے۔

(۱۱) لوڈشیڈنگ میں بیٹری سے چلنے والے ریڈیو کو بھی بہت فروغ ملا ہے سامعین حالات حاضرہ، خبریں، مذاکرے اور دیسی پروگرام بھی ریڈیو پر سننے لگ گئے ہیں۔

(۱۲) لوڈشیڈنگ نے ہمیں اتنے فائدے پہنچائے ہیں اور اس نے ہمیں رب کا شکر کرنا سکھا دیا ہے۔ وہ یوں کہ ایک گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کے بعد جوں ہی بجلی لوٹ کے آتی ہے ہم سب پاکستانی اتنے خوش ہوتے ہیں کہ مسلمان بھائی بہن کہتے ہیں ''شکرالحمدللہ''۔۔۔ مسیحی بہن بھائی کہتے ہیں زور سے ''ہیلو'' دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے کہ ربا تیرا شکر۔ ذرا ٹھنڈے ذہن سے غور کریں کہ اتنے فائدے۔۔۔ لوڈشیڈنگ تو ہماری اپنی اپنی لگتی ہے۔۔۔ اور واپڈا جو بقول لوڈشیڈنگ اس کا گھر والا ہے وہ بھی ہمارا اپنا واپڈا ہے۔ تو پھر دوستو پرابلم۔۔۔

ہم سب لوڈشیڈنگ کو ''جی آیاں نوں'' کہتے ہیں۔

ذرا سب مل کر کہو ''جی آیاں نوں'' ذرا زور سے بولو

''جی آیاں نوں''

دعا ہے واپڈا اور لوڈشیڈنگ کی جوڑی سدا سلامت رہے۔

واہ واہ رام جی جوڑی کیا بنائی۔

..... دُھندبھری حیرانی .....

خاور وحید ایسا باکمال اور باجمال شاعر ہے کہ شعر کی گدڑی پہن کر یہ شاعر بجھی روحوں اور بے چین دلوں سے کلام کرتا ہے اس کے مصرعوں اور غزل کا وار خالی نہیں جاتا۔ سہلِ ممتنع کا کمیاب شاعر، جس کی شاعری افسانوی جھرنوں سے دُھلی ہوئی ہے اور پڑھنے والے کو ساوی کہاوت لگتی ہے۔ یہ شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کوئی چیز دُھندلی نہیں، سب کچھ صاف و شفاف ہے اس کی شخصیت اور اس کے دل کی طرح۔

اس کے شعروں میں گداز، درد مندی، سادگی اور تاثیر زمانے اور اشک کو دل گیر کرتی ہے، میں خود اس کے شعروں کا اسیر ہوں۔

خاور وحید کا ایک شعر دیکھئے:

میرے لوٹ آنے پر تم کو کیسی حیرت ہے
ساحلوں پہ آئے گا ساحلوں کا پانی تو

عامر سہیل

اشاعت: ۲۰۱۵ء،

قیمت: ۳۰۰،

دستیابی: بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور۔

☆

ایک صدی کا قصہ
شاہد لطیف
دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ایک زمانہ تھا جب مشہور رائٹر عصمت چغتائی کو لوگ شاہد لطیف کی بیوی کے نام سے جانتے تھے۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ایک زمانہ وہ بھی آیا جب شاہد لطیف کو لوگ عصمت چغتائی کے شوہر کے طور سے جاننے لگے۔ شاہد لطیف بذات خود ایک قلم کار تھا۔ اُسکی پیدائش گیارہ جون 1913 کو یو۔ پی کے ایک دور افتادہ گاؤں چندوسا میں ہوئی۔ اُسنے اپنی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی میں پوری کی۔ 1941 میں اُسکی شادی عصمت چغتائی سے ہوئی۔ وہ خود ایک بہترین رائٹر تھا۔ وہ ایک لیکھک کے طور پر فلموں میں قسمت آزمائی کرنے بمبئی پہونچا۔ خوش قسمتی سے اُسے پہلا بریک ملا۔ ایک مکالمہ نگار کے طور پر۔ فلم تھی ''نیا سنسار''۔ کچھ دنوں بعد اُسے دو اور فلمیں لکھنے کو ملیں۔ یہ فلمیں تھیں ''جھولا'' اور ''انجان''۔ یہ تینوں فلمیں سن 1941 میں یکے بعد دیگرے ریلیز ہوئیں۔ تینوں فلمیں کامیاب رہیں۔

شاہد لطیف رائٹنگ پر ہی بس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے پنکھ پھیلا کر اونچی اُڑان بھرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنی بیگم عصمت چغتائی کی ایک کہانی بیحد پسند تھی جسے وہ پردہ سیمیں پر اُتارنا چاہتا تھا۔ اُسنے کئی پرڈیوسروں کو یہ کہانی سنائی۔ کہیں بات بنی نہیں۔ آخر ''بمبئی ٹاکیز'' اس فلم کو پرڈیوس کرنے کے لئے تیار ہوگئی مگر شرط یہ رکھی کہ وہ یہ فلم ایک محدود بجٹ میں پوری کرلے گا۔ شاہد لطیف نے بلا تامل اُن کی یہ شرط قبول کی۔ وہ کاسٹنگ کی تگ و دو میں کئی مہینوں تک اُلجھا رہا۔ ہیرو کے لئے کوئی مناسب چہرہ مل نہیں رہا تھا۔ وہ کسی نامی اداکار کو فلم میں لینے کی حالت میں نہیں تھا کیونکہ بجٹ اتنا کم تھا کہ کسی نامور اداکار کو لینے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ وہ اسی ادھیڑبُن میں ایک دن چرچ گیٹ ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا کہ اُسنے دیوآنند کو چلتی ٹرین کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اُسنے اُسے آواز دیکر روکا۔ وہ شاہد لطیف کو اچھی طرح سے جانتا تھا اسلئے وہ اُسے دیکھ کر رک گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ دونوں باہر ایک ایرانی ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دیوآنند ایک نیا نیا کلاکار تھا۔ وہ آدھی درجن سے زیادہ چھوٹی چھوٹی فلموں میں کام کر چکا تھا مگر کوئی مقام حاصل نہ کر پایا تھا۔ وہ اب بھی جدوجہد کے دور سے گزر رہا تھا۔ شاہد لطیف کو لگا کہ یہ لڑکا اُس کی فلم کے لیے موزوں رہے گا اسلئے اُسنے دیوآنند کو یہ مژدہ تو سنایا مگر اُسکی خوشی یہ بات سنتے ہی کافور ہوگئی کہ آخری فیصلہ پرڈیوسر کا ہوگا۔

اگلے روز شاہد لطیف نے دیوآنند کو ''بمبئی ٹاکیز'' کے آفس پہونچنے کے لئے کہا۔ دیوآنند فوراً اُنکے دفتر پہونچا۔ اُسکا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ اُمید و بیم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ''بمبئی ٹاکیز'' کے مالک اُسے پسند کریں گے کہ نہیں کریں گے بس اسی اُدھیڑبُن میں وہ پڑا تھا۔ شاہد لطیف گیٹ پر کھڑا اُسکا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ جب وہاں پہونچا تو شاہد لطیف اُسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ اُن کے لئے چائے بھجوادی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ چائے کا پہلا سپ لیتا اُس سے کہا گیا کہ وہ دوسرے روم میں جا کر بیٹھ جائے۔ وہ جونہی دوسرے کمرے میں گھسا تو یہ دیکھ کر وہ حیران و ششدر رہ گیا کہ اس کمرے میں دادا منی اشوک کمار بیٹھا تھا۔ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا پڑا تھا۔ دیوآنند پہلی بار دادا منی سے مل رہا تھا اسلئے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ اشوک کمار نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے دیوآنند سے پوچھا۔ ''دیو میری فلم میں کام کروگے؟'' دیو حیران تھا کہ اشوک کمار خود اتنا بڑا اسٹار ہے۔ وہ اُس سے اس فلم میں کام کرنے کے لئے کیوں کہہ رہا ہے۔ خیر اُسکی ہمت نہ ہوئی پوچھنے کی اور اس طرح دیوآنند کو فلم ''ضدی'' میں کاسٹ کیا گیا دیو کا کہنا ہے کہ جب فلم سیٹ پر چلی گئی تو شاہد لطیف اور عصمت چغتائی اُس سے اتنی ریہرسلیں کرواتے تھے کہ وہ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ وہ اس فلم میں کام کرتے کرتے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ وہ اس فلم کو چھوڑنے کا من بنا رہا تھا۔ ایک دن وہ اشوک کمار سے ملا اور اُس سے کہا کہ ''دادا اب مجھ سے نہیں ہو رہا ہے۔ اچھا رہے گا کہ آپ مجھے اس فلم سے الگ کر دیجئے۔'' اشوک کمار دیوآنند کی یہ بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے دیو سے پوچھا کہ بات کیا ہے تو اُس نے سب کچھ بیان کیا۔ اشوک کمار نے دیوآنند سے وعدہ کیا کہ وہ کل خود سیٹ پر آئے گا اور دیکھے گا کہ وہ کہاں پر غلط کر رہا ہے۔ اگلے روز وہ حسب وعدہ اشوک کمار سیٹ پر پہونچا۔ جب شاٹ چل رہا تھا تو شاہد لطیف دیوآنند کو پہلے اپنے ڈھنگ سے سین کو ادا کر کے دکھانے لگا۔ دادا جو سیٹ پر موجود تھے، شاہد لطیف پر بگڑ گئے۔ وہ شاہد لطیف سے کہنے لگے کہ رنگ ماسٹر کی طرح ایکٹر کو اپنے اشاروں پر نچاؤ مت۔ ایکٹر کو اپنے حساب سے کام کرنے دو نا۔ تم اس پر اپنا اسٹائل کیوں تھوپ رہے ہو۔ شاہد لطیف کے لئے دادا کا اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ اُس نے دیوآنند کو اب کھلی چھوٹ دے دی۔ جب دیوآنند نے اپنے ڈھنگ سے شاٹ دیا تو دادا منی کو شاٹ بہت اچھا لگا اور اس طرح دیوآنند اس عذاب سے خلاصی پا گیا۔ اس فلم کی موسیقی کھیم چند پرکاش نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں پہلی بار کشور کمار نے لتا منگیشکر کے ساتھ پہلا دوگانا گایا تھا۔ اس فلم میں اُس وقت کی مشہور ہیروئن کامنی کوشل تھی۔ ساتھ میں پران سکند بھی تھا۔ یہ فلم سن 1948 میں ریلیز ہوئی۔ فلم زبردست ہٹ ہوئی۔ دیوآنند راتوں رات اسٹار بن گیا۔ اسی سال شاہد لطیف کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''شکایت'' تھا۔ اس فلم کے ستارے تھے آغا، راج مہرہ، رام شکال، بی بی شکنتلا، نگار سلطانہ، شیام اور سنہہ پردھان۔ اس فلم کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی تھی۔ فلم ''ضدی'' کی کامیابی میں یہ

فلم کہیں کھوکر رہ گئی۔

''ضدی'' کی کامیابی اور ''شکایت'' کی ناکامی کے بعد شاہد لطیف کو ہیتن چودھری نے اپنی فلم ''آرزو'' کے لئے سائن کیا۔ اس فلم کے لئے دلیپ کمار، کامنی کوشل اور ششی کلا کو سائن کیا گیا۔ اس فلم کی کہانی بھی عصمت چغتائی نے لکھی تھی۔ اس بار وہ اس فلم میں کوئی کمی پیشی رکھنا نہیں چاہتا تھا اسلئے اس فلم کے لئے اُس دور کے سب سے کامیاب موسیقار انل بسواس کو اس فلم کا سنگیت دینے کے لئے راضی کر لیا۔ اس فلم کے گانے جان نثار اختر، پریم دھون اور مجروح سلطان پوری نے لکھے۔ انل بسواس نے اس فلم کو اپنی مدھر دھنوں سے اس طرح آراستہ کیا کہ آج بھی اس فلم کے گانے سن کر سننے والے پر کیف وسرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس فلم میں پہلی بار ڈانسر ککو کو پردہ سیمیں پر پیش کیا گیا۔ یہ فلم شاہد لطیف کی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی۔

''آرزو'' کی کامیابی کے بعد شاہد لطیف نے ایک اور فلم پر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ فلم تھی ''بزدل''۔ اس فلم کے لئے نمی، پریم ناتھ، کنہیا لال، کشور ساہو اور ککو کو سائن کیا گیا۔ اس فلم میں شاہد لطیف نے ایس ڈی برمن کو سائن کیا۔ ایس ڈی برمن کا شمار اُس دور میں چوٹی کے موسیقاروں میں کیا جاتا تھا۔ برمن دا نے اس فلم کو ایسی مدھر اور مدہوش کرنے والی دھنوں سے آراستہ کیا کہ آج بھی ان گانوں کو سن کر من میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ یہ ہندوستانی موسیقی کا سنہرا دور تھا۔ ''بزدل'' سن 1951 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم سے اُردو کے مشہور شاعر کیفی اعظمی نے فلمی گیت کاری کی ابتدا کی۔ یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔

اس کے بعد شاہد لطیف کی زندگی میں اُتار چڑھاو آتے رہے۔ کامیابی کے بعد ناکامی سے وہ کئی بار ہمکنار ہوتا رہا۔ ''بزدل'' کے بعد اُس نے ایک اور فلم پر کام کرنا شروع کر دیا جس کا نام ''شیشہ'' تھا۔ انیل پکچرس کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے کلاکار تھے۔ ناصر خان، نوتن، گوپ، کشور ساہو، گلاب اور کلدیپ کور۔ اس فلم کی موسیقی موسیقار روشن نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم سن 1952 میں ریلیز ہوئی۔ اُس وقت نوتن کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ فلم کچھ خاص نہ چلی البتہ نوتن کی دم دار اداکاری نے فلمی شائقین کو اس سانولے رنگ کی دبلی پتلی پر دراز قد کی اداکارہ کا گرویدہ بنا دیا۔

1953 میں شاہد لطیف کی ہدایت میں بنی ایک اور فلم ریلیز ہوئی۔ اس فلم کا نام ''فریب'' تھا۔ اس فلم کے اداکاروں میں کشور کمار۔ للتا پوار، شکنتلا، امر، مایا داس، زہرہ سہگل قابل ذکر تھے۔ اس فلم کو فمنا کے بینر تلے پروڈیوس کیا گیا تھا۔ اس فلم کو بھی انل بسواس نے اپنی مدھر دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔ یہ فلم بھی فلم بینوں کے معیار پر کھری نہیں اُتری۔ اس فلم کی ناکامی کے بعد شاہد لطیف نے چھوٹی چھوٹی فلمیں بنائیں۔ سن 1954 میں فلم ''دروازہ'' اور سن 1955 میں فلم ''سوسائٹی'' ریلیز ہوئیں۔ ان فلموں کو دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے شاہد لطیف جیسا نابغہ روزگار ہدایت کار وقت کی بھیڑ میں کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے۔

شاہد لطیف نے کبھی ہار نہیں مانی۔ اُس کی کہانی اُس چیونٹی سے خوب ملتی تھی جو ایک پیڑھ پر چڑھنے کی دھن میں کئی بار گری، کئی بار چڑھی۔ وہ تب تک کوشش کرتی رہی جب تک وہ پیڑ پر چڑھ نہیں پائی۔ شاہد لطیف نے بھی حالات کے سامنے کبھی گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ایک بار وہ پھر سے پر تولنے لگا۔ اس بار وہ عصمت چغتائی کی ایک اور کہانی پر فلم بنانا چاہتا تھا۔ یہ فلم تھی ''سونے کی چڑیا''۔ اس فلم کے لئے اُس نے طلعت محمود کو ہیرو کے لئے سائن کیا۔ اُسکے مقابل نوتن کو چنا گیا۔ ساتھ میں بلراج ساہنی، محمود اور بی بی ممتاز تھے۔ یہ وہی ممتاز ہے جو بعد میں ہندی فلموں کی بہت بڑی اسٹار بن گئی۔ اس فلم کے سنگیت کار او۔ پی۔ نیر تھے جب کہ گیت کار ساحر لدھیانوی تھے۔ یہ فلم ''فلم انڈیا کارپوریشن'' کے بینر تلے بنی تھی۔ یہ فلم 1958 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی خاص بات نوتن کی اچھوتی اداکاری اور او۔ پی۔ نیر کا سحر انگیز سنگیت تھا۔ یہ وہ سال تھا جس میں طلعت محمود کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''مالک'' 'لالہ رخ'' اور ''سونے کی چڑیا''۔ ناظرین نے اُسے ایکٹر کے طور پر کبھی تسلیم نہیں کیا جس کا احساس طلعت محمود کو بہت دیر بعد ہوا۔ 1958 اُسکی اداکاری کا آخری سال ثابت ہوا۔ اُسکے بعد اُسنے ایکٹنگ سے توبہ کر لی۔ کے۔ ایل۔ سہگل اور کشور کمار کو چھوڑ کر کوئی اور گلوکار، گائیکی کے ساتھ ساتھ اداکاری کے میدان میں کامیابی نہ پا سکا۔

1966 میں شاہد لطیف کی ایک اور فلم ''پکنک'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے اداکاروں میں منوج کمار، شوبھا کھوٹے، مراد، کلپنا، ڈیوڈ اور آنند بخشی نمایاں رولز میں تھے۔ اس فلم کی موسیقی ایس۔ مہندر نے ترتیب دی تھی اور گانے مجروح سلطانپوری نے لکھے تھے۔ یہ فلم بھی پھسڈی ثابت ہوئی۔ شاہد لطیف کی قسمت کا ستارہ ایک بار پھر محو گردش تھا۔

گورودت نے اپنے بینر تلے ایک فلم شروع کی تھی جس کا نام ''بہاریں پھر بھی آئیں گی''۔ اس فلم میں وہ اداکاری کے ساتھ ساتھ ڈائرکشن بھی خود ہی کر رہا تھا۔ یہ فلم گورودت کے چہیتے رائٹر ابرار علوی نے لکھی تھی۔ اس فلم میں گورودت کے علاوہ گورودت گروپ کے کلاکار جیسے مالا سنہا، رحمان اور جانی واکر تو تھے ہی ساتھ میں تنوجہ بھی تھی۔ اس فلم کا مہورت بڑے تزک واحتشام سے ہوا۔ کئی دنوں کی شوٹنگ بھی ہوئی۔ فلم آدھی سے زیادہ بن چکی تھی کہ گورودت نے زندگی کو الوداع کہہ دیا۔

اچانک ایک دن گورودت پروڈکشن میں زلزلہ آ گیا جب یہ خبر باہر آ گئی کہ گورودت نے خودکشی کر لی ہے۔ جن غریب ٹیکنیشنوں کی روٹی روزی گورودت سے جڑی ہوئی تھی اُن کے سروں پر تو بجلی گر گئی۔ گورودت پروڈکشن میں تو کہرام مچ گیا۔ گورودت کے چلے جانے سے وہ سب یتیم ہو چکے تھے۔ گورودت کی بے وقت موت سے فلم ''بہاریں پھر بھی آئیں گی'' کی شوٹنگ رک گئی۔ گورودت کے قریبی لوگ اس صدمے سے اسقدر ہلے ہوئے تھے کہ اُنہیں اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا۔

گورودت کا چھوٹا بھائی آتما رام آگے آیا اور اُسنے اس فلم کو مکمل کرنے کا من بنالیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کی ڈائرکشن کون کرے گا۔ عام رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس فلم کی ڈائرکشن شاہد لطیف کرے گا۔ شاہد لطیف کے لئے بھی یہ ایک سنہرا موقع تھا جب وہ یہ ثابت کرسکتا تھا کہ وہ بھی گورودت سے کم نہیں ہے۔ چونکہ فلم کا ہیرو وہی چلا گیا تھا اس لئے پچھلی شوٹنگ کو ضائع کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ساتھ ایک نئے ہیرو کی تلاش شروع ہوگئی۔ تلاش دھرمیندر کے پاس جاکے رک گئی۔ دھرمیندر گورودت کا زبردست مداح و پرستار تھا۔ اُس نے بنا کوئی شرط باندھے اس فلم میں کام کرنے کے لئے حامی بھر لی۔ شوٹنگ از سرنو شروع ہوئی۔ شاہد لطیف نے اسکرپٹ میں بھی بہت ساری تبدیلیاں کروائیں۔

فلم دھیرے دھیرے بنتی چلی گئی۔ جب فلم مکمل ہوئی تو فلم کے رشز دیکھ کر سب کو مایوسی ہوئی۔ جب گورودت کے شوٹ کئے ہوئے رشز دیکھے گئے تو یہ دیکھ کر سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ آخر گورودت میں ایسی کیا بات تھی کہ ہر سین جاوداں لگتا تھا۔ برعکس اُسکے شاہد لطیف کا ہر سین کمزور اور پھیکا لگ رہا تھا۔ ایکٹروں میں نہ وہ جوش تھا نہ ولولہ۔ مالا سنہا، رحمان اور جانی واکر جو کہ گورودت کی ہر فلم کی جان ہوا کرتے تھے اس فلم میں ایسے نظر آرہے تھے جیسے وہ بھیڑ میں کہیں کھو کر رہ گئے ہوں جانی واکر جیسا کلاکار جو کہ گورودت کی ہر فلم میں زندگی بھر دیتا تھا اس فلم میں ایسا نظر آرہا تھا جیسے وہ ایک غیر ضروری کردار ہو جسے زبردستی اس فلم میں ٹھونسا گیا ہو۔ او۔ پی۔ نیر کی سحر انگیز موسیقی کے باوجود فلم جب 1966 میں ریلیز ہوئی تو ناظرین کا ملا جلا ردعمل تھا۔ فلم فلاپ ثابت ہوئی۔

دراصل شاہد لطیف کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ جب کسی ٹیم کا کپتان ہی نہ رہے تو اُس ٹیم کا کیا ہوگا۔ وہ کیسے جیت پائے گی۔ گورودت تو نہیں تھا مگر ساری ٹیم تو اُسی کی تھی نا۔ اُن کے دل و دماغ سے گورودت کی یادیں محو نہیں ہو پائی تھیں۔ وہ جو بھی کام کر رہے تھے بڑی بے دلی سے کر رہے تھے۔ یہی حال ایکٹروں کا بھی تھا خاص کر گورودت کے اُن ساتھی کلاکاروں کا جن کا کیریر کو گورودت نے سجایا سنوارا تھا۔

اس فلم کی ناکامی کے بعد شاہد لطیف نے ایک اور فلم شروع کی جس کا نام ''جواب آئے گا'' تھا۔ اس فلم کے کلاکار تھے یوگیتا بالی، یوگیش، پنکی، درشنی، چاند عثمانی، روی کانت اور مینا رائے تھے۔ اس فلم کے فلمساز ہریش سری واستوا تھے۔ 16 اپریل 1967 کو شاہد لطیف اس فلم کو ادھوری چھوڑ کر اس جہاں سے رحلت کر گئے اور اپنا سارا بوجھ اپنی شریک حیات عصمت چغتائی کے نازک کاندھوں پر ڈال کر چلے گئے۔ عصمت بھی سخت جان عورت تھی۔ اُس نے نہ صرف اس سانحے کا جواں مردی سے مقابلہ کیا بلکہ ادھوری فلم کو بھی اپنی زیر ہدایت مکمل کیا۔ یہ فلم 1968 میں ریلیز ہوئی پر فلم کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ اس فلم کے ساتھ ہی شاہد لطیف کا دور اختتام کو پہونچا۔

☆

پاکستان

ظریف احسن
(کراچی)

پاک وطن سنہری مٹی
پاک وطن سنہرے لوگ، سنہری دھرتی
پاکستان کی عظمت کا سبز ہلالی پرچم
ظریف احسن کا کہنا ہے
آؤ! ہم سب بلند کریں
اپنے مثبت فعلوں سے
اپنے پیارے سبز ہلالی پرچم کو
پاکستان کے پرچم کو
آؤ! ہم سب فخر کریں
شاداب سرسبز فصلوں پر
صنعت کے کارخانوں پر
اپنے جفاکش لوگوں پر
مزدوروں، کسانوں پر
لہلہاتے کھیتوں پر
جگمگاتے ذہنوں پر
ظریف احسن کے خیالوں پر
شاعروں اور ادیبوں پر
پاکستان سرسید کا
پاکستان ہے حالی کا
جوہر کا پاکستان ہے، لیاقت کا پاکستان ہے
قائداعظم زندہ باد
پاکستان پائندہ باد

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

پیارے گلزار بھائی، آداب۔

پتا نہیں کیوں چہارسو کا قرطاسِ اعزاز اپنے نام دیکھ کر بے اختیار علامہ اقبال کا ایک شعر ذہن میں یوں کوند گیا جیسے گہری دُھند میں بجلی چمک گئی ہو:

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اس خاص اشاعت میں آپ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ذرّے کو آفتاب بنا دینا اسی کو کہتے ہیں۔ آپ کی مدبرانہ صلاحیت کی داد نہ دینا کفر ہوگا۔ زیرِ نظر اشاعت میں شامل بیشتر مضامین طبع شدہ ہیں لیکن آپ کے دست ہُنر مند نے تمام رشحات قلم کو کچھ اس عمدگی سے ترتیب دیا کہ ہر مضمون نیا معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر آپ کا سوالنامہ غضب کا ہے۔ ہر سوال فلیتہ ہے جس کے چھوتے ہی ذہن میں جوابات کی پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔

گلزار بھائی! میں یہاں کے رسالوں میں شائع ہونے والے گوشوں سے سخت بیزار ہوں۔ یہاں گوشوں کے نام پر جو شرمناک سودے بازی ہوتی ہے نیز جس طرح کوزہ پُشت ادیبوں کو دیوزاد بنا کر پیش کیا جاتا ہے قابل مذمت ہے لیکن اس کا کیا کِیا جائے کہ ہمارے بیشتر قلمکاروں کو خود آرائی کا ایسا شوق ہے کہ وہ اپنا گوشہ چھپوانے کو طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور لطف کی بات یہ کہ گوشہ چھپنے کے بعد بالآخر گوشے ہی میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں مگر آپ نے جس خلوص سے مجھے یاد کیا اور جس محبت اور لگن سے میرے لیے خاص اشاعت ترتیب دی یہ میرے لیے ایک خوشگوار تجربے سے کم نہیں۔ ای۔میل کے ذریعے آپ کے پیغامات پڑھ کر اور فون پر آپ سے گفتگو کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت سراپا خلوص ہے اور خلوص کے سوا کچھ نہیں۔

تازہ چہارسو کی ترسیل کے بعد جتنے پیغامات، ای۔میلز اور ٹیلی فون آ رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''چہارسو'' کے قارئین کا حلقہ کس قدر وسعت کا حامل ہے اور چہارسو چہاردانگ عالم میں کتنا مقبول ہے۔ بقول آپ کے کہ ''چہارسو'' کا مقصد بھارت اور پاکستان کے اہلِ قلم کے درمیان محبت کا ایک پُل تعمیر کرنا ہے۔ تری آواز مکّے اور مدینے۔

سلام بن رزاق (ممبئی)

گلزار جاوید صاحب، السلام وعلیکم۔

ستمبر، اکتوبر کا چہارسو پیشِ نظر ہے قرطاسِ اعزاز کی محفل سلام بن رزاق کے لئے بڑی اچھی سجی ہے۔ مرکزی گدی پر آپ 'براہ راست' سلام بن رزاق کے روبرو تشریف فرما ہیں۔ آپ کے 'مصاحبے' کا انداز اتنا منفرد ہے کہ اس کی شاید ہی کہیں اور مثال مل پائے۔ میں نے اس مصاحبے کو بھی دلچسپی سے پڑھا ہے اور لطف لیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ براہِ راست پڑھنے کے بعد میں گوشے سے فرار ہو جاتی ہوں آگے پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی خواہ لکھنے والوں میں وارث علوی ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ سلام بن رزاق کی آپ بیتی جتنی آپ نے شائع کی ہے وہ پڑھ ڈالی اور آپ کے پڑھنے والوں کو بھی اس کی جانب متوجہ کرنا چاہتی ہوں۔ شاید انہیں بھی لطف آ جائے۔ فیروز عالم صاحب اب اپنی ترجمے کی صلاحیت سے ہمیں نوازنا چاہتے ہیں۔ 'سیاہ عقاب کی گمشدگی' پڑھنے کی چیز ہے اوہنری کے افسانوں کا ترجمہ کرنا ایک چیلنج ہے جس کو فیروز عالم صاحب نے قبول کیا۔ اور کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ اللہ کرے زورِ ترجمہ اور زیادہ۔ نیلوفر فردوس نے 'راجندر سنگھ بیدی' کے کردار کے عنوان سے سچ پوچھئے تو صرف ایک ہی کردار کو پیش کیا ہے۔ ان کا یہ سلسلہ جاری رہے تو مناسب ہے۔ اس مرتبہ اپنی روایت کے برخلاف میں نے فکشن پر نظر نہیں ڈالی یا شاید فکشن نے مجھے متوجہ نہیں کیا۔

پروفیسر غازی علم الدین آپ کے اس شمارے کے سب سے اہم لیکھک ہیں۔ میں نے بے حد دلچسپی سے پڑھا اور میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس 'لسانی مباحث' جیسے مضامین کی فی زمانہ بے حد ضرورت ہے۔ شموئل احمد کی تصنیف ''پاکستانی ادب'' پر سنجیدہ بحث کی گنجائش نکلتی ہے۔ رس رابطے میں پروفیسر زہیر کنجاہی نے دبنگ انداز سے کچھ ایسا لکھا ہے کہ جس کو دکھتی رگ پر انگلی رکھنا کہا جا سکتا ہے۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

بصورتِ بہار گم گشتہ گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو ایک بار پھر بہار آفریں ہوا۔ ایسا اوجھل ہوا کہ خواب و خیال بن کر رہ گیا۔ اب آیا تو آنکھوں میں جم کر تارا ہو گیا۔ ایسے محسوس ہوتا ہے پچھلے کچھ شمارے یہاں نہیں آئے۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کوئی کمی رہ گئی۔ آپ حسب معمول چہارسو کا خلِ بابرکت وسیع رکھیں۔ جیسے بنے ادھر بھیج دیا کریں اس کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اصل میں آپ ادبی مختلفات میں دست و قلم ہیں۔ قرطاسِ اعزاز ہی کو لیجیے۔ حسن و خوبی کا یہ قرینہ کوئی آپ سے سیکھے۔ پچھلے چند پرچوں کا قرطاسِ اعزاز مجھ سے چھوٹ گیا۔ یہ اب کہاں سے مہیا ہو۔ سلام بن رزاق آپ کے اچھے ہاتھ لگے۔ بڑے پائے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ ان کی کیفیت اور حال سے میں خاصا متاثر ہوا ہوں۔ انہوں نے انٹرویو میں ایمان لگتی باتیں کہی ہیں۔ فی الواقع اپنے وطن سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ قائد اعظمؒ نے تقسیم کے وقت

ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا تھا اب آپ کا وطن ہندوستان ہے۔ اپنے وطن کے مخلص اور وفادار ہو کے رہنا ہے۔ حُبِ وطن کا درس اسلام نے بھی دیا ہے کہ اپنے وطن میں رہ کر دین و دنیا کے معمولات انجام دو۔

زبان و بیاں کے باب میں پروفیسر غازی علم الدین کی کاوشیں پاکستان ہندوستان میں سراہی جا رہی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھیں اور مضامین بھی قلم بند کیے۔ ان کے مطالعے سے زبان و بیاں کے متعدد اسقام روشنی میں آتے ہیں۔ پروفیسر صاحب از راہ عنایت اپنا لکھا پڑھا مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ ان سے بہت کچھ سیکھتا ہوں ضرورت پڑے تو انہیں متوجہ بھی کرتا ہوں۔ دیپک کنول نے ''دلیپ کمار'' کے خصوص میں ایک مفصل اور حسن آفریں مضمون لکھا ہے۔ آپ جانیں دلیپ کمار ''ہجوم در ہجوم'' پسندیدہ اداکار ہیں۔ ان کی فلم ہو تو سینماؤں کے دروازوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ دیپک کنول نے خاصا وقت دلیپ کمار کے ساتھ گزارا ہے۔ ان کے مضمون میں عقیدت زیادہ ہے، ہونی بھی چاہیے۔ دلیپ کمار نے انڈیا کی شہریت قبول کی وہیں رچے بسے۔ اپنے وطن سے محبت استوار کی۔ انڈیا کے بڑے بڑے فن کاروں سیاست دانوں غرض مشاہیر نے ان کی عزت کی۔ اشوک کمار، راج کپور، دیو آنند، پرتھوی راج، موتی لال، بھارت بھوش۔۔۔ ان کے ہم مرتبہ تھے۔ انہوں نے دلیپ کمار کو سر آنکھوں پر بٹھایا۔ مکالمے بولنے کا جدید فن موتی لال سے مروج ہے۔ دلیپ کمار نے اس میں استعداد پیدا کی۔ دلیپ کمار کے معاشقے اب کہانیاں ہیں۔ دلیپ کمار ساتھی اداکاروں (ایکٹریسوں) کے فن کے گرویدہ ہو جاتے تھے بدیں وجہ وہ ''عاشق'' ٹھہرائے جاتے تھے۔ انہوں نے وجینتی مالا کی بھی بہت تعریف کی۔ ان کے ساتھ دلیپ کمار کا عشق نہیں جوڑا گیا۔ ہر رنگ دیپک کنول نے دلیپ کمار کے ضمن میں ایک تاریخی مضمون لکھا ہے۔ اختلاف کی گنجائش تاہم ضرور ہے۔ ''سنگھرش'' اور ''دل دیا درد لیا'' میرے نزدیک دل کو چھو لینے والی فلمیں تھیں۔ ''دل دیا درد لیا'' میں وحیدہ رحمان سے دلیپ کمار کے ڈائیلاگ سے دل ہل جاتا ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

میرے گلزار، ادب کے دلدار، سلامت رہو۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی تم نے اردو ادب کے ایک انتہائی سچے، باکردار اور باصفا اہلِ قلم کو قرطاس اعزاز سے سرفراز کر کے اپنی محنت اور لگن کا پورا پورا ثبوت فراہم کیا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک تن تنہا آدمی چہار جانب سے گوہر نایاب کیونکر تلاش کر لیتا ہے اور صرف تلاش ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی تراش خراش اور پیشکش اس طرح کی ہوتی ہے کہ دل سے خود بخود تمہارے لیے دعائیں نکلیں لگتی ہیں۔ سلام بن رزاق صاحب کی سرگزشت اور سریندر پرکاش کا خاکہ لکھا نہیں گیا بلکہ دکھایا گیا ہے اور اُن کا افسانہ ''زندگی افسانہ نہیں'' تو اس قدر کمال کی چیز ہے کہ ہر صاحبِ نظر کو اپنے اردگرد دکھائی دیتی ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں نظمی اور نثری تخلیقات کا انتخاب بھی لاجواب ہے سب پر تبصرہ کرنا تو ممکن نہیں البتہ محترمہ پروین شیر، ڈاکٹر فیروز عالم، مہندر پرتاپ چاند اور رینو بہل کی تخلیقات اس قدر معیاری اور دل کو چھو لینے والی ہیں کہ ایک سے زائد بار پڑھ کر بھی بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

گلزار صاحب، اسلام وعلیکم

سلام بن رزاق نمبر انٹرنٹ پر ملا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ان دنوں وقت اتنی مہلت نہیں دے رہا ہے کہ اطمینان سے پڑھ سکوں۔ ویسے بھی مجھے ہارڈ کوپی کا انتظار رہتا ہے کہ اُس کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے وقت نے رحم کھایا مجھ پر اور انٹرنٹ پر پڑھنے لگی ہمیشہ کی طرح سرسری طور پر.....لیکن ''یادیں دھند میں لپٹی ہوئی''....اس عنوان نے مجھے تھام ہی لیا۔ پڑھنا شروع کیا تو رُک نہ سکی۔ بہت پُر اثر تحریر ہے۔ چہارسو نے سلام بن رزاق جیسے اعلیٰ ادیب سے ملاقات کا موقعہ عطا کیا۔ براہ راست کے ذریعہ انہیں اور قریب سے جان سکی اور بے حد متاثر ہوئی ایسے ہمہ جہت فنکار سے۔ ان کے لیے اتنے اچھے مضامین ہیں لیکن ابھی پڑھ نہیں پائی ہوں۔

ایک سچے شعر نے چونکا دیا:

سانپ سے دے نہ آدمی کی مثال
سانپ کچھ بے ضرر بھی ہوتے ہیں

محترم انور سدید صاحب کی تخلیق ''بند بیاض خواب'' دل چھو گئی۔ اس شمارے نے کہیں کہیں اور بھی روک لیا۔ مجھے عدیم الفرصتی میں بھی چند الفاظ لکھنے پہ مجبور کر دیا۔ چہارسو نے مجھے چند ایسے فنکار اور ایسی عظیم شخصیات سے متعارف کیا ہے جن کے متعلق یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہ دنیا ایسے ہی پُر خلوص، سچے اور ہم درد لوگوں کی وجہ سے آج بھی اچھی ہے۔ ایسی ہی شخصیات اس دنیا کے اندھیرے دور کرتی ہیں۔ دکھی دلوں کے دکھ بانٹ کر۔ چہارسو خاندان کے ان چند عظیم لوگوں میں سے ایک ہیں محترم جناب یوگیندر بہل تشنہ صاحب۔ جن سے کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی شفقت ایسی ہے جیسے برسوں کی پہچان ہو۔ ان جیسا نرم دل، بہی خواہ اور پُر خلوص انسان اور فنکار شاذ و نادر ہی نظر آیا۔ میرے لیے اتنی سچی اور شفقت سے پُر نظمیں کہہ کر انہوں نے مجھے جو اعزاز بخشا ہے.....بہت عزت اور احترام کے ساتھ میں ان کی بے حد ممنون ہوں۔ سچے اور کھرے الفاظ کتنے پُر اثر ہوتے ہیں۔ پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کا ہم درد مشورہ کہ ''دل کے سناٹوں کو موءِ قلم سے، اداس وسنسان پڑی کینوس پہ بکھیرو''.....میں ان کے پُر خلوص مشورے پر عمل کرونگی۔ میری ڈھیروں دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

میں نے شموئیل احمد کو زیادہ نہیں پڑھا ہے لیکن رینو بہل کے دل چسپ مضمون ''اے دل آوارہ'' نے انہیں پڑھنے کی خواہش بڑھا دی۔

طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ محترم یوگیندر بہل تشنہ، رینو بہل، نوید سروش اور ابراہیم عدیل نے میری کوشش پسند کی۔ ان کی ممنون ہوں۔ چہارسو کے

کئی پڑھنے والے ای میل سے بھی سراہتے رہتے ہیں جس سے خوشی ہوتی ہے۔

ایک مشورہ دینا چاہونگی کہ براہ کرم کمپوزنگ پر دھیان دیں۔ گرچہ غلطیاں نہیں کے برابر ہیں لیکن نظم میں ہوں تو تکلیف دہ ہوتی ہیں جو میری نظموں (سیاہ روشنی، مینڈیلا اور دریدہ) میں در آئی ہیں۔ ویسے چہارسو ماشا اللہ کمپوزنگ کی کوتاہیوں سے پاک ہوا کرتا ہے لیکن ہم انسان ہی تو ہیں۔ اب اس شمارے کا مکمل مطالعہ ہارڈ کوپی ملنے پر کرونگی۔

پروین شیر (نیویارک)

محترم بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چندروز قبل چہارسو کا تازہ شمارہ ستمبر/اکتوبر ۲۰۱۵ء نظر نواز ہوا جس کے لیے ممنون ہوں۔ سلام بن رزاق یقیناً ''چہارسو'' کے قرطاسِ اعزاز کے اہل ہیں اُن کے بارے میں تفصیل دل کو لگی اگرچہ اُن پر ایک سے ایک نقاد نے اپنے گراں قدر خیالات سے چہارسو کو مزین کیا ہے مگر ''افسانہ ہی زندگی ہے'' کے تحت اسلم پرویز نے جو کچھ لکھا وہ سب کچھ بہت پیارا لگا۔ راجندر سنگھ بیدی کے کرداروں پر لکھنا آسان نہیں لیکن نیلوفر فردوس نے یہ کام بھی قابلِ تعریف حد تک کر دکھایا ہے۔ پھر پروفیسر غازی علم الدین کی کیا بات ہے۔ لسانیات پر اتنا بڑا عالم تو موجودہ عہد میں شاید ہی کوئی ہو۔ مبارک ہو آپ کو اُن کا ساتھ۔ آپ نے میری حمد اور غزل شائع فرمائیں شکر گزار ہوں لیکن وہی کمپوزنگ کی غلطیاں، یہاں بھی در آئی ہیں۔ حمد کے تیسر شعر کے پہلے مصرع میں ''عیسیٰ میں اُس کی ساری مسیحائی منعکس'' لفظ ''مسیحائی'' کے بعد ''ہے'' اضافی لکھا گیا ہے جب کہ غزل کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''شوخ'' کی جگہ ''شوق'' لکھا گیا ہے جس نے مفہوم ہی کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ میں اس خط کے ذریعے نوید سروش، احسان بن مجید اور ڈاکٹر ریاض احمد صاحبان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری نعت کو پسند فرمایا۔

آپ نے اس بار مراسلت کے حصے میں میرے گزشتہ خط کا اقتباس بھی شامل تو کیا لیکن آپ نے (شاید سہواً) وہ چند جملے چھوڑ دیے جس میں میں نے دیپک کنول جی کی ایک فاش بھول کی طرف اشارہ کیا تھا جو کچھ اس طرح کے تھے۔ ''یا شاید اُن کی یادداشت انہیں دھوکا دے گئی۔ صفحہ ۱۱۱ کی آخری سے پہلی عبارت میں انہوں نے ''آنا ہے تو آراہ میں کچھ دیر نہیں ہے۔ بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے'' کو نیا دور کا گیت لکھا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ گیت فلم ''امر'' (محبوب پروڈکشنز) کا ایسا خوبصورت گیت تھا جسے شکیل بدایونی نے لکھا اور نوشاد نے فلم کی ضرورت کے تحت اسے ایک خوبصورت بھجن کے روپ میں پیش کیا تھا فلم کا یہ منظر جہاں سے CLIMAX اُبھرتا ہے اب تک تماشائیوں کو یاد اس لیے بھی ہوگا کہ اُن دنوں نیا نیا تعمیر شدہ برلا مندر اور اُس کی سیڑھیاں اس گیت کا پس منظر تھا پھر ایوارڈ یافتہ فریدون ایرانی اس فلم کی عکاسی کے ذمہ دار تھے۔ اس شمارے میں بھی تو دیپک کنول جی نے اپنے (اور میرے محبوب) اداکار دلیپ کمار پر دس صفحات میں اُن کی زندگی کے نشیب و فراز لکھے ہیں جس میں کسی اعتراض کی گنجائش اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہ ایک زمانے تک دلیپ کمار صاحب کے بہت قریب رہے پھر اُن کے ساتھ بیتے ہوئے شب و روز پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جسے انہوں نے محبت سے مجھے بھی بھجوایا تھا بہرحال یہ تو برسبیل تذکرہ تھا جو شاید کچھ طویل ہو گیا۔

غالب عرفان (کراچی)

پیارے گلزار بھائی، آداب۔

ماہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۵ء کا شمارہ بنام جناب سلام بن رزاق نظر نواز ہوا۔ سلام صاحب نے اپنی خودنوشت کے تحت اپنے بچپن کی یادوں کو جس طرح اجاگر کیا ہے ان سے اُن کی جرأت رندانہ اور بلند حوصلگی کے ثبوت تو ملتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے دردمند دل کا بھرپور اظہار بھی ہے۔

''براہِ راست'' کے علاوہ ان سے متعلق دیگر تمام مضامین سے ان کی ذاتی شخصیت اور ادبی حصولیابیوں کے مختلف شواہد بھی فراہم ہوتے ہیں۔ میں افسانہ نگار تو نہیں اور نہ ہی اس کے تکنیکی نکتوں سے واقف ہوں لیکن ''زندگی افسانہ نہیں'' کو پڑھنے کے بعد ایک قاری کے طور پر میں نے جو محسوس کیا وہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ اُن کے اس افسانے کا اختتام مجھے Convincing نہں لگا کیوں کہ بقول افسانہ نگار جب اسلم نے خود ہی جمیلہ کو یہ کہہ دیا تھا کہ ''تم اپنی امّی اور بھائی بہنوں کے لیے فکرمند ہونا؟ ہونا بھی چاہیے مگر ایک بات یاد رکھو، آج جو ذمہ داری تمہاری ہے، شادی کے بعد وہ ذمہ داری ہم دونوں کی ہوگی۔'' تو پھر جمیلہ کی مصیبت کے وقت اسلم نے اس کا ساتھ چھوڑ کر کہیں اور شادی کیوں کر لی جب کہ اس کی مخالفت کرنے والے مولوی جمال الدین بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور جمیلہ کو اسلم کی بھرپور مدد کی ضرورت تھی۔

دیگر نثری تحاریر میں سبھی افسانے اچھے ہیں لیکن حنیف باوا اور عذرا اصغر کی کہانیاں خاص طور پر لائق ستائش ہیں۔ پروین شیر کے سفرنامہ میں اپارٹ ہائیڈ کے دوران انگریز حکومت کے ڈھائے گئے غیرانسانی مظالم کا ذکر پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی ''چہارسو'' میں واپسی ایک نہایت مبارک قدم ہے۔ اُمید ہے اب یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔ نیلوفر فردوس اور رینو بہل کے تنقیدی مضامین خصوصاً پروفیسر غازی علم الدین کے ''لسانی مباحث'' بے حد معلوماتی اور قابل تحسین ہیں۔ دیپک کنول کا مسلسل کالم کافی طویل ہونے کے باوجود دلیپ کمار کی ذاتی اور فنّی شخصیت پر ایک نہایت جامع مضمون ہے جو اس عظیم فنکار کی ذات اور صفات پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

منظومات میں حضرات محمود الحسن، محمود شام، اختر شاہجہاں پوری، غالب عرفان، پریمی رومانی، قیصر نجفی، نسیم سحر، نعیم الدین نظر، حفیظ انجم فاروقی، عارف شفیق، شہاب صفدر، مامون ایمن، منظر ایوبی اور کرشن پرویز کا کلام خاص طور پر مجھے لائق توجہ لگا۔ رتن سنگھ کی پنجابی نظم اور عزیزہ سریو کی انگریزی نظم دونوں ہی انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ جمیلہ شبنم صاحبہ کی بھیجی ہوئی نظم ''لوڈشیڈنگ میں

سہاگ رات'' بھی بہت مزہ دے گئی۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

نیا پرچہ ملا اچھا کیا کہ آپ نے سلام بن رزاق کو قرطاسِ اعزاز دے دیا۔ ایک افسانہ نگار سے تعارف ہو گیا۔ اُن کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری بھی پڑھی۔ براہِ راست میں سوال جواب دونوں درست لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوالات کسی ایسی شخصیت سے کیے جا رہے ہیں جس نے حال ہی میں اُردو افسانے لکھنے شروع کیے ہوں یا پھر سوال کرنے والا اُن کے افسانوی ادب سے ابھی ابھی واقف ہوا ہو۔

سب سے پہلے ''دلیپ کمار'' کے بارے میں پڑھا۔ کیوں؟ آپ کو علم ہی ہے فلم کا شہنشاہ اسے کیوں نہ پڑھیں؟ اس دفعہ دیپک کنول نے دلیپ کمار کی رام کہانی لکھتے لکھتے اُسے ''دلیپ کمار فلم'' بنا دیا ہے جو سامعین گھنٹوں دیکھتے رہیں مگر دل نہ بھرے۔ مدھو بالا کی کہانی میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ عطاء اللہ خان کا روپ بھر کر دیپک کنول ہر جگہ خود مدھو بالا کی نگرانی کرتے رہے۔ دلیپ کمار اور مدھو بالا شادی کرنے میں کامیاب تو نہ ہوئے مدھو بالا تو دل میں یہی دکھ لئے چھتیس برس کی عمر میں ہی یہ دنیا چھوڑ گئی۔ زندگی کے آخری دنوں میں اگرچہ مدھو بالا نے دلیپ کمار کو چھوڑ دیا تھا اور اس غم کو بھلانے کے لیے مرنے سے قبل کشور کمار سے شادی بھی کر لی مگر یہ محبت کبھی بھی ختم نہ ہوئی۔ دلیپ کمار تو اس محبت کے ہی ہو کر رہ گئے۔ دیپک کنول لکھتے ہیں ''جب بھی مدھو بالا کا نام لیا جاتا تھا تو دلیپ صاحب کے دل کا تار تار جھنجھنانے لگتا تھا۔ اور وہ چپ چاپ اس درد کو پی جاتے تھے۔ مدھو بالا تو چلی گئی مگر دلیپ کمار صاحب کے دل میں ایک کسک، ایک خلش بن کر رہ گئی۔ جب بھی دلیپ کمار کو مدھو بالا کی یاد آتی تھی تو اُس کی یاد اُسے لہولہو رلاتی تھی۔''

غزلیں نظمیں ساری پڑھ ڈالی۔ نظموں سے صرف دو نظمیں پسند آئیں ایک نظم ہجومِ بیکراں (انور سدید) اور دوسری نظم ''اعزاز تھے وہ سب کے'' (شگفتہ نازلی)۔ غزلوں کے جو شعر پسند آئے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

فرصت کسے کہ کوئی نظر بھر کے دیکھ لے
پھرتے ہیں لوگ اپنا جنازہ لیے ہوئے

(اختر شاہجہاں پوری)

سوچ کے غار سے اک شور اُٹھا ہے تو سہی
اب کہاں جا کے ٹھہرتا ہے یہ لشکر دیکھو

(اطہر عزیز)

جسے میں ڈھونڈتا رہتا تھا ہر سُو
وہ جلوہ میرے اندر جاگزیں ہے

(کرامت بخاری)

جب طلب کی راہ میں حد سے گزر جاتے ہیں لوگ
زندگی کے نام پر بے موت مر جاتے ہیں لوگ

(شہاب صفدر)

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

چہارسو کے شکر گزار ہیں کہ اس کے توسط سے محترم سلام بن رزاق کی کثیر الجہات شخصیت سے تعارف پایا۔ قرطاسِ اعزاز کا آغاز سورۂ رحمٰن کی آیت مبارکہ سے۔ براہ راست اور بلند پایہ ناقدین کے مضامین و تاثرات سے اُن کی تخلیقات و کتب کی خصوصیات سے متعلق گرانقدر آرا معلوم ہوئیں۔ طویل تدریسی تسلسل کے ساتھ پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک کے توسیع آمیز مراحل نیز مختلف جہات میں اُن کی تصانیف، تالیفات و تراجم سے معہ انعامات و اعزازات آگہی پائی جن سے اردو و ہندی کے علاوہ دیگر لسانیات اور علوم و فنون پہ اُن کی دسترس مترشح ہے۔ ''یادیں دھند میں لپٹی ہوئی'' حقیقی زندگی کا متاثر کن بیانیہ ہیں ''چراغ بجھ گیا'' کے عنوان سے سریندر پرکاش صاحب کا نہایت اپنائیت و محبت سے عمدہ خاکہ لکھا گیا۔ بحیثیت مجموعی اعزازات کی تاریخ میں زیرِ قلم شمارہ لائق توجہ مطالعہ و قابل قدر اضافہ ہے۔

''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' میں فیملی کے بڑوں کے معمولات و مصروفیات، خواہشات و عادات کا بتدریج اگلی جنریشن سے موازنہ نیز کبھی تناؤ و ٹکراؤ اور کبھی اُلجھاؤ و سلجھاؤ کی صورتوں پر ردِ عمل ظاہر ہوا ہے۔ عبارت پڑھنے میں کہیں دِقت ہوئی تاہم مفہوم اخذ ہوتا گیا، مختلف مرلوں کے زیرِ تعمیر اور تعمیر شدہ مکانات اب سٹیٹس سمبل کا درجہ اختیار کر چکے ہیں اور خوب سے خوب تر کی خاطر اپنی ترجیحات تبدیل کرتے رہتے ہیں انسانی ذہن کا یہی شاخسانہ بلندی و پستی سے جھلکتا ہے۔ سارے فلائی اوورز اور انڈر پاس ایک طرف اور ٹریفک کے ہڑبونگ میں پھنستی دل برداشتہ و کوفت زدہ مخلوق ایک طرف، جو سگنل گرین ہوتے ہی یوں رواں دواں ہو جاتی ہے جیسے ایسا کڑا وقت کبھی اُن پہ آیا ہی نہیں تھا ایک دن سے ایسے مناظر ہی ابھرتے رہے۔

''سیاہ عقاب کی گمشدگی'' فطری منظر نامے کے ساتھ ایڈونچر سے معمور ہے اور قاری اس مہم جوئیانہ سفر میں خود کو راوی کا ہمرکاب پاتا ہے پھر انسان کی فطرت جس ماحول کی پروردہ اور عادی ہوتی ہے اسے اپنانے میں بہت آسانی رہتی ہے اسی وجہ سے عقاب کو رینگتی ہوئی گاڑی کے ڈبے میں پھیلی ہوئی گھاس پر کُودتے ہوئے کچھ دقت نہ ہوئی جس کی نرمی و خوشبو سے ہمیشہ سے مانوس رہا تھا عالمی ادب کی شمولیت کا خوشگوار تاثر ہے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی بند بیاض خواب دہشت گردی کے المیے کو اُبھارتی جبکہ ابتداء کی نسبت انتہا پہ بیاضِ خواب کے بند ہونے کی محرومی کا احساس بھی دلاتی رہی۔

اس مرتبہ ایک صدی کا قصہ بنام دلیپ کمار صاحب سال بسال کے

حالات و واقعاتِ زندگی سے آراستہ و پیراستہ شاہکار تھا اُن کی سب سے بڑھ کر جگمگاتی ہوئی خوبی خود کو Underestimate رکھتے ہوئے انتہائی فنی ریاضت سے لافانی کردار ادا کرنا تھا جنھوں نے انہیں بامِ عروج پہ پہنچایا اور دوسروں کے لیے ہمیشہ باعثِ تقلید بنائے رکھا۔ حسبِ روایت اب کی بار صاحبِ قرطاسِ اعزاز کی عدم شمولیت کی پروفیسر قیصر نجفی صاحب کے بھرپور تبصرے نے بخوبی تلافی کی کلیات کے لیے مبارکباد۔۔۔ سانپ سے دسے نہ آدمی کی مثال۔ سانپ کچھ بے ضرر بھی ہوتے ہیں نفسیاتِ انسانی کا گہرا مشاہدہ ہے پروفیسر زہیر کنجاہی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض ٹھہرتا ہے۔ ''خرابی'' اور ''خوب شد'' بھی محظوظ کرتے ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۵ء اپنے ادبی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سلام بن رزاق کے لیے ''قرطاسِ اعزاز'' پاکستانی ادب کے طالب علموں کے لیے تحفۂ خاص ہے۔ ''براہِ راست'' میں سلام بن رزاق نے تہذیبی اور تنقیدی سوالات کے جوابات تفصیل سے دیے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں سلام بن رزاق نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعلق حقائق بیان کیے ہیں۔ رزاق صاحب جب سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے الاؤنسز کا بل پاس ہوا ہے تب سے یہاں بھی طلبہ و طالبات کا حال اچھا نہیں ہے۔ مقالہ لکھ کر دینے کا کاروبار بھی پھیل رہا ہے زیادہ نوازشیں ''خواتین'' پر ہوتی ہیں۔

سلام بن رزاق صاحب کے کچھ افسانے مختلف رسائل میں پڑھے ہیں۔ ''یادیں، دھند میں لپٹی ہوئی'' دلچسپ اور پُر اثر ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل حالات سے نبرد آزما ہونے کی داستان بھی ہے۔ بچپن کی باتوں اور یادوں کو کمال مہارت سے جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''چراغ بجھ گیا'' خاکے میں سریندر پرکاش جیتے جاگتے نظر آ رہے ہیں۔ ''زندگی افسانہ نہیں'' اپنے عنوان موضوع اور پیشکش کے اعتبار سے زبردست افسانہ ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ ابتدا سے آخر تک افسانے پر مصنف کی گرفت رہتی ہے۔ ''واپسی'' میں بھی یہی خوبی نظر آتی ہے۔ نیئر اقبال علوی کا ''بلندی پستی'' بچپن سے ہی پڑھی گئی کہانی ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کی جدید شکل معلوم ہوئی۔ ان کے دل کش اسلوب کی داد ضرور دینی چاہیے۔ محترمہ عذرا اصغر کا افسانہ ''بے کفن'' پُر تاثیر افسانہ ہے۔ سرمایہ داروں سے لے کر عام آدمی کی بے حسی کے پس منظر میں سچی محبت اور اس کے صلے میں ملنے والے سکھ دکھ کو مہارت سے کہانی کا روپ دیا ہے۔ دیپک کنول نے دلیپ کمار کی طویل منفرد فنی زندگی پر قلم اٹھایا ہے۔ مختصر لکھنے کے چکر میں صرف فلموں کے نام، کامیابی اور دیگر اداکاروں کے نام سے مضمون پورا کیا ہے۔ دلیپ کمار صاحب کی شخصیت پر بہت کم لکھا ہے۔

پروین شیر کا سفر نامہ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' اپنی تمام تر دلچسپیوں سے مزّین قارئین کا ہم سفر ہے۔ جغرافیہ اور تاریخ کو جس سلیقے اور ہنر مندی سے محترمہ سفر نامہ کا حصّہ بنا رہی ہیں وہ کمال ہے۔ یوگیندر بہل تشنہ نے پروین شیر کو زبردست بصورت نظم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ محمود الحسن کی غزل کے بعض اشعار ایسے ہیں جو ہمارے سماجی و سیاسی رویوں پر گہرا طنز ہیں۔ محمود شام، کرامت بخاری، حسن عسکری کاظمی، مہندر پرتاپ چاند، حفیظ انجم، عارف شفیق، شہاب صفدر، وشال کھلر اور ابراہیم عدیل کی غزلیں جدید فکر سے ہم آہنگ ہیں۔ مظفر حنفی کی غزل کی ردیف ''چارسو'' نے مختلف معنوی رنگ بکھیرے ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل کی تخلیقی صلاحیتوں کو ہم پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں ''اے دلِ آوارہ'' پڑھ کر اُن کی تنقیدی صلاحیتوں کے بھی معترف ہو گئے ہیں۔ ''عمر گزشتہ کی کتاب'' کے ذریعہ شموئل احمد کی شخصیت کو زبردست پینٹ کیا۔ ''راجندر سنگھ بیدی کے کردار'' نیلوفر فردوس نے خاصی محنت سے مضمون تحریر کیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے او ہنری کی کہانی کا ترجمہ ''سیاہ عقاب کی گمشدگی'' کے عنوان سے فنی پختگی کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگست میں پاکستان تشریف لائے۔ ۱۶، ۱۷، ۱۸ اگست میر پور خاص میں بہت مصروف رہے۔ ۱۶ر اگست کی شام آفتاب قریشی صاحب نے قریشی ایگری کلچر فارم پر ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں عصرانہ دیا جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۔ ۱۷ر اگست کی صبح شاہ عبد اللطیف گورنمنٹ کالج میر پور خاص (یہاں ڈاکٹر صاحب دو سال زیرِ تعلیم رہے) میں جشنِ یومِ آزادی کی تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ اسی شام ادارہ دستک میر پور خاص نے ''ہوا کے دوش پر'' کی تقریبِ رونمائی کا اہتمام کیا جس میں شاعروں، ادیبوں اور طلبہ نے شرکت کی۔ ۱۸ر اگست صبح محمد میڈیکل کالج میں میڈیسن طلبہ کو لیکچر دیا۔ شام کو میر پور خاص اولڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن میر پور خاص (موسم) کی جانب سے ایک بڑے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ ۱۹ر اگست کی رات کراچی میں احبابِ میر پور خاص کراچی کی جانب سے ''ایک شام ڈاکٹر فیروز عالم کے نام'' کی شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں خصوصیت کے ساتھ اُن کے بچپن کے دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ میر پور خاص کے دوستوں نے بھی شرکت کی۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ اتنی اچھی اور معیاری تحریریں دیکھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ادب کا فطری رنگ اس رسالے کی وہ خوبی ہے جو اس عہد میں تقریباً ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کی سطح پر ہونے والے بیشتر تحقیقی کام اور دس ہزار روپے Ph.D الاؤنس نے ادب کو حساب کتاب کی دکان بنا دیا ہے۔ بہت کم تحریریں ایسی نظر آتی ہیں جن کے ذریعے ادیب سے ملاقات ہوتی ہے۔

فردوس انور قاضی (کوئٹہ)

گلزار صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو مجھے باقاعدگی سے مل رہا ہے جسے میں آپ اور پاکستان کی

جانب سے تحفہ سمجھ کر بصد شوق پڑھتی ہوں۔ عام طور پر شروعات براہِ راست سے کرتی ہوں کیونکہ آپ کے سوالات میں مجھے مدیر نہیں ایک انتہائی مشتاق شخص نظر آتا ہے جس کی جستجو سے خود کو پوشیدہ رکھنے کا گمان کرنے والے بلند قامت اہلِ قلم کے اندر سے اٹھ جاتا ہے مگر جب سلام بن رزاق صاحب سے منسوب شمارہ میرے ہاتھ آیا تو براہِ راست کے بجائے اُن کی خودنوشت سے آغاز کیا۔ پہلا حصہ پڑھتے پڑھتے آنکھیں بھیگتی اور دل موم ہوتا چلا گیا۔ کئی بار الفاظ دھندلائے اور مجھے رک کر آنکھیں خشک کرنا پڑیں حالانکہ آگے بڑھ کر تحریر کا رنگ سیاہ سے گلابی ہوتا گیا۔ کب تخلیق کار کی تخلیق پر اس کی شخصیت حاوی ہوجائے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

اس کے بعد براہِ راست کی باری آئی سوال اور جواب میں ٹکر برابر کی تھی۔ نا سوالوں کی دھار کم تھی اور نہ سلام صاحب کے جواب کسی طور کم تھے۔ میں اُن کے افسانوں کی قاریہ ہوں، اُن کے موضوعات، کردار، افسانوں کی تراش خراش میں لاجواب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر رینو بہل نے شموئل احمد صاحب کے ناول ''اے دلِ آوارہ'' پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ پروین شیر صاحبہ کا سفرنامہ پوری طرح سے قاری کو متاثر کرتا ہے خاص طور سے اُن کی نظمیں اُس وقت کی ذہنی عکاسی کرنے میں پوری طرح کامیاب رہی ہیں۔ ایسے میں قاری کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

میری جانب سے آپ اور چہارسو کی پوری ٹیم کو مبارکباد۔

شائستہ فاخری (الہ آباد، بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا سلام بن رزاق نمبر ہمیشہ کی طرح وقت پر نظر نواز ہوا۔ شمارہ اپنی روایت کے مطابق بھرپور اور لائقِ توجہ ہے۔ اللہ کرے یہ کارواں رواں دواں رہے اور علم، آگہی اور فہم وادراک کا نور پھیلاتا رہے۔ اردو سلامت تا قیامت رہے کہ ہم اِس زبان کو دل وجان سے اپنا ایمان، ایقان اور اپنی جان پہچان اور زبان سمجھتے ہیں۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ خوش آئند، اللہ تعالیٰ حکومتوں کو حوصلہ اور ہمت دے اور وہ یہ کام اور فیصلہ جلد نافذ کردیں۔

کرامت بخاری (لاہور)

مکرمی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ستمبر اکتوبر ۲۰۱۵ء کا چہارسو اردو ادب کے نامور ادیب جناب سلام بن رزاق صاحب سے بجا طور پر منسوب ہے۔ سلام بن رزاق ایک صاحبِ طرز اور منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ جس طرح معروف قلم کاروں نے اُن کی شخصیت و فن پر اعلیٰ پایے کے مضامین تحریر کیے ہیں اُس سے سلام صاحب کے قد وقامت کا درست طور پر اندازہ ہوتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ چہارسو کے زیرِ نظر شمارے کی بابت بہت کچھ تحریر کروں مگر میری اہلیہ کی اچانک رحلت کے باعث مستقل دکھ سے نبرد آزما ہوں اور چہارسو کے قارئین سے مرحومہ کے حق میں دعائے مغفرت کا طالب بھی۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

چہارسو باقاعدگی سے نظر نواز ہوتا ہے۔ یہ نہایت عمدہ ادبی پرچہ ہے جسے آپ استقامت سے شائع کررہے ہیں۔ ستمبر اکتوبر ۲۰۱۵ء کے مشمولات بھی لائقِ توجہ ہیں مگر میں بصد احترام پروفیسر غازی علم الدین کی ''لسانی بحث'' کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

۱۔ اردو میں ''ی، ے'' کے نیچے دو نقطے لگانے کا رواج نہیں ہے اور نہ کوئی ضرورت۔

۲۔ موصوف نے بالکل غیر ضروری طور پر عربی ہمزہ الوصل یا فعل المضعّف کا ذکر کیا ہے اور انگلش الفاظ کی ایک بہت طویل فہرست پیش کردی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انگریزی یا جرمن میں تو آپ کو سائلنٹ ایس مل جائے گا جو STYLE سٹائل اور STEIN شٹائن میں نظر آتا ہے لیکن فرنچ ای لوی اور ہسپانوی زبانوں میں، اردو کی طرح ''الف'' کی ہی آواز نکلے گی۔ ہندی میں سکول لکھا تو جائیگا لیکن عام لوگ اِسکول ہی بولیں گے۔

۳۔ عربی الفاظ سلیم اور سقیم انگلش کے Scheme اور Steam کے ہم وزن اور ہم آواز نہیں ہیں۔ اسی طرح Steel بھی ''سٹیل'' کا ہم وزن اور ہم آواز نہیں۔ پروفیسر غازی صاحب شاعری سے دور نظر آتے ہیں ورنہ یہ دعویٰ نہیں کرتے۔

۴۔ ''سوا'' اور ''علاوہ'' میں فرق ضرور ہے لیکن ''اسلام کے علاوہ دیگر تمام ازم۔۔۔'' اور مرض الموت کے علاوہ ہر مرض۔۔۔'' قابلِ گرفت اس لیے نہیں کہ ''علاوہ'' کے بعد ''دیگر'' اور ''ہر'' کے الفاظ ابہام دور کررہے ہیں۔ ''علاوہ'' اور ''بھی'' مل کر In Addition to کا مفہوم پیش کرتے ہیں۔ ''فلسفے کے علاوہ شعریت بھی۔۔۔'' اس موقع پر بھی ان کا استدلال کھوکھلا ہے۔ آپ نے ''حال آں کہ'' لکھا۔ اسے ''حالانکہ'' لکھیں تو بہتر ہے۔

۵۔ ہمارے یہاں بولنے میں ہاشمی، کاظمی، قاسمی ہی ادا ہوگا۔ اور حاضرین کہا جاتا ہے۔ یہ کسی طور بھی قابلِ گرفت نہیں۔ تیسرے حرف کا زیر بولنے میں نہیں آتا۔

۶۔ اردو طریقۂ اظہار میں ''جماعتِ اسلامی'' اور ''احکامِ شاہی'' ہر ایک کو قبول ہیں۔ اس پر واویلا نہ کیجیے۔

۷۔ کوئی اردو والا ''باہم رضا مندی'' یا ''باہم رنجش'' نہیں کہے گا ''باہمی'' کا ہی لفظ بولا اور لکھا جائے گا اور بالکل صحیح۔ ''بوقت شام'' بھی غلط نہیں۔

محترم پروفیسر صاحب پتہ نہیں کونسی عربی سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ زبانیں کیسے ترقی کرتی ہیں اور الفاظ کس طرح سفر کرتے ہیں آزاد فضا میں۔ انگریزی کس طرح آگے بڑھی اور اردو زبان کے کیا مسائل رہے ہیں۔

میں اپنے ہی مضامین کا حوالہ دوں گا جو میرے اصلی نام A.Qavi Shakoor سے ''ڈان'' کراچی میں شائع ہو چکے ہیں اور زبانوں کے Interaction پر روشنی ڈالتے ہیں:

1. The Adventure of words by A. Qavi Shakoor
2. Dear Urdu, poor Urdu by A. Qavi Shakoor
3. A matter of Script. By A. Qavi Shakoor

پروفیسر صاحب! اردو عربی کی غلام یا فارسی کی کنیز نہیں ہے اور نہ یہ یہودیوں کی Yiddish (ایک خاص قبیلہ کا ذریعہ اظہار) جیسی ہے۔ ۱۸۴۰ کے قریب جب فارسی کی جگہ اردو نافذ کی گئی تو مسلمانوں نے شور مچایا لیکن ہندوؤں نے ویلکم کیا۔ یہ ایک آزاد و خود مختار زبان ہے۔ الفاظ ہر جگہ سے قبول کرے گی جیسا کہ ہر زبان کرتی ہے اور اردو بولنے والوں کے مزاج کے مطابق استعمال کرے گی۔ کوئی بقراط بیچ میں نہ آئے۔ مدیر چہارسو گلزار جاوید اردو کے غیر مسلم لکھنے والوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کر کے اردو کے حسن وقار میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لاہور کے انارکلی بازار کی ہندو دوکانوں پر اردو اخبارات ہی پڑھے جاتے تھے پنجاب میں ہندی بہت پیچھے تھی۔ چہارسو میں اُس زمانے کی جھلک نظر آتی ہے کہ جب گلزار جاوید دوسرے مذہب کے لیکھکوں اور شاعروں کی نگارشات پیش کرتے ہیں۔ اردو سے محبت تو اُن کو تھی۔ (یعنی گلزار زتشی وغیرہ) ہم تو اردو کی ٹھیکیداری کرتے ہیں۔ مجھے ڈیڑھ سو سال پہلے کے عربی ''عالم'' یاد آتے ہیں جنہوں نے ''فتویٰ'' دیدیا تھا کہ عربی مقدّس زبان ہے یہ ٹائپ رائٹر یا پرنٹنگ مشینوں پر استعمال نہیں ہوگی۔ صرف ہاتھ سے لکھی جائے گی۔ شکریہ ادا کریں لبنان کے ''موارنہ'' Maronites کا عراق کے کالدیوں Chaldeons کا اور مصر کے قبطیوں Copts کا جنہوں نے عربی کو جدید لباس پہنایا ڈکشنریاں اور انسائیکلوپیڈیا کے اشاعت گھر قائم کیے۔ ''اہرام'' اور ''انھار'' جیسے شاندار اخبار نکالے اور عربی کو اس قابل بنایا کہ وہ اقوام متحدہ کی چھٹی زبان تسلیم کی جائے۔ اردو میں یہ کام (ایک حد تک) ہندو کر رہے تھے (مُنشی نول کشور وغیرہ)۔ اب اردو بے آسرا اور بے سہارا زبان ہے۔ کتاب پہلے چھپتی تھی تو بار اوّل ایک ہزار اب بار اوّل وآخر ۲۵۰ جو بکتی نہیں۔ دل جلا محمود شام بھارت یاترا سے واپسی پر بتاتا ہے کہ وہاں عام ہندی اُپنیاس (ناول) ۲۰ ہزار چھپتا اور بکتا ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین صاحب جب علم ''روشن خیالی'' کا دشمن ہو جائے تو پھر اُردو کے لیے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ ایک شعر پیشِ خدمت ہے۔

اُردو ترا وجود تو خطرے میں پڑ گیا
گردن پہ ہیں سوار یہ پیرانِ تسمہ پا

تشنہ بریلوی (کراچی)

بھائی گلزار جاوید، آداب۔

'چہارسو' کا ستمبر۔ اکتوبر سنہ ۲۰۱۵ء کا شمارہ سلام بن رزاق کی خوشنما تصویر اور ڈیزائن کے ساتھ آراستہ و پیراستہ منظرِ عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ ازحد شکریہ!

اس میں آپنے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب میں ایک باوقار مقام قائم کر لینے والے ہمعصر ادیب جناب سلام بن رزاق کا قرطاسِ اعزاز کر کے ایک موزوں کام انجام دیا ہے۔ آپ نے انکے ساتھ کیے ہوئے مکالمے میں جتنے مناسب و معقول سوالات کیے ہیں، انکے اتنے ہی مناسب و برمحل جوابات موصوف نے دیے ہیں اور اپنے قابلِ رشک ادبی رتبے کی ہی تصدیق کی ہے، جو قابلِ تحسین ہے۔

اس شمارے میں حنیف باوا کے افسانے 'واپسی' میں اس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ حیات میں حالات کس طرح انسان کی درونی نیک خوئی باہر آ کر اس کی بے راہروی سے اسے بچا کر نیک اعمالی کی راہ پر گامزن کر دیا کرتی ہے۔ افسانے میں فرزانہ کا بے مثال کردار اسی حقیقت کی خط کشی کر گیا ہے۔

عذرا اصغر کا افسانہ زیرِ عنوان 'بے کفن' ایک معذور خاوند سلیم کی ازحد ناتوانی کے باوصف اسکی شریکِ حیات بختاں کے تئیں اسکی بے پناہ محبت کو تو نشان زد کرتا ہی ہے، مزید اس میں مائی رہتے کے توسط سے اس دورِ حاضر میں دولت کی افزوں ہوتی جا رہی مادی اہمیت کو بھی موضوعِ حدف بناتیا گیا ہے۔ افسانے کا دلدوز اختتام بے حد متاثر کن واقع ہوا ہے۔

صغیر رحمانی صاحب کے موزوں عنوان والے افسانے 'بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں' میں پرانی و نئی نسلوں کے فرق کو تو نشان زد کیا ہی گیا ہے، علاوہ ازیں اس میں اپنی عادات کے غلام ہو چکے عمر رسیدہ لوگوں کے تئیں جوان نسلوں کی غیر ضروری بے اعتنائی و بے رخی پر انکی وفات کے بعد ان ہی پر حاوی ہو جانے والی نہفتہ درونی ہمدردی کا انکشاف دیکھتے ہی بنتا ہے۔ افسانے کے عروج پر اولادوں اور بہوؤں کے لیے اپنے ابا و خسر جناب اے۔ پی۔ شرما کی عدم موجودگی میں ان کی خیالی موجودگی کا احساس دل شکن بن پڑا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ افسانہ ازحد متاثر کرتا ہے۔

نیّر اقبال علوی کے افسانے 'بلندی و پستی' کے تحت سماج کے طبقاتی فرق و امتیاز کو بخوبی موضوع بنایا گیا ہے، اس میں جب افسانے کا راوی (نیریٹر) ہیرو امیر طبقے کی اوپری منزل پر رہنے والی نایاب اور اپنے نام کے ہی معقول بے وفائی کرتی ہے، تب اپنی پرانی محبوبہ رانی (رانو) کی جانب اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے بازگشت کرنا مجھے بیکل سعیدی کے اس شعر کو یاد کرا دیتا ہے، جو غریب اور نچلی منزل پر رہنے والی رانی (رانو) اسے سنا سکتی تھی:۔ ''ان کو بھولے ہوئے اپنے ہی ستم یاد آئے / جب انہیں غیر نے تڑپایا تو ہم یاد آئے۔'' افسانے میں منزلوں کے فرق کو سماج کے طبقاتی امتیاز کے متوازن رکھنا افسانے کو

بھی فنی کمال سے آراستہ کر دیتا ہے۔

محترمہ فریدہ نے بھی اپنے عمدہ افسانے زیرِ عنوان 'ایک دن' میں دولت کی اہمیت کے انسانی زندگی میں بتدریج افزوں ہوتے چلے جانے کے المیے کی خط کشی کی ہے۔ ہجڑوں کا عوام الناس کو کس طرح سے زیادہ سے زیادہ دولت ہتھیانے کے ہتھکنڈوں کا استعمال کرنا ہو یا گداؤں کی مانند کام نہ کرنے کی ذہنیتہو اس پر بھی زبردست یلغار کی گئی ہے۔ یہ لوگ تو خاطر خواہ رقم نہ ملنے پر گھر کے آگے برہنہ ہو جانے کی دھمکیاں تک دیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے نامناسب استحصال کے موجب سرکاروں کو جلد از جلد اقدام اٹھانے چاہئیں۔ ساتھ ہی اسی افسانے میں لوگوں کی بتدریج افزوں ہوتی جارہی آبادی کے مسئلے کو بھی موضوع بنا کر قارئین کو سوچنے پر مجبور کیا گیا ہے اور اس خاکسار کی رائے میں بلند پایہ ادیب اسی طرح غور وخوض کرنے والی تخلیقات سے ادب و عوام الناس کو نوازا کرتے ہیں۔

اس شمارے میں بلند پایہ و مایہ ناز شاعر مظفر حنفی کی غزل اور اسکا امید پرستی کے جذبے سے مملو یہ شعر مرغوب رہا ہے:۔ ''بن کی سیاہ رات میں سرد ہوا کی سائیں سائیں رراہ میں جگنوؤں کی ڈور جیسے شرار چارسو۔'' جریدہ کے نام کو ردیف وقافیہ کا حصہ بنانا بھی پسند آیا ہے۔ اسی شمارے میں انبالہ کے موقر ادیب جناب مہندر پرتاپ چاندؔ کی مکمل غزل دل کے تاروں کو چھوگئی ہے۔ بالخصوص یہ شعر لائقِ مدح واقع ہوا ہے۔ ''وہی نم ناک سی آنکھیں، وہی کھلتے ہوئے لب رُ وہی انداز بلاتے ہیں اشاروں سے مجھے۔''

کرشن بھاؤک (پٹیالہ، بھارت)

بردارم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

محبت، شفقت وخلوص کے رنگوں میں رنگا ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۵ء کا ''چہارسو'' اپنے دامن میں سکونِ ذہن وقلب کے ان گنت سامان سمیٹے موصول ہوا۔ آپ کی طبع گوہر شناس نے ایک مرتبہ پھر اردو ادب کے گوہر آبدار جناب سلام بن رزاق کو متذکرہ شمارے کا جھومر بنا کر اُن کے قد کاٹھ کو مزید جلا بخشی۔ اس کے لیے آپ بھی داد وتحسین کے مستحق ہیں۔ سلام بن رزاق بلاشبہ عہد حاضر کے معتبر افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو فکشن کے رنگ روپ کو اپنی قلمی وتخلیقی صلاحیتوں سے فزوں تر کیا ہے۔ دیگر اہل قلم حضرات کے ان کے بارے لکھے گئے مضامین اور تحریریں پڑھ کر ان کی زندگی کے بہت سے گوشے واضح ہوئے۔ براہِ راست حسبِ معمول چشم کشا اور پُر مغز گفتگو ہے۔ ان کا اپنی افسانہ ''زندگی افسانہ نہیں'' کیا عجب کہانی ہے۔

محترم حنیف باوا اور محترمہ عذرا اصغر بھی بڑی اہمیت کے حامل لکھاری ہیں ان کی تحریریں میرے لیے مشعلِ راہ اور سوچ و بچار کے ہزاروں زاویے لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ دونوں کے بالترتیب افسانے ''واپسی'' اور ''بے کفن'' اگرچہ پُرانے عنوانات ہیں مگر دونوں نے اپنے اپنے خوبصورت اندازِ اسلوب میں ملفوف کر کے انہیں عمدہ خدوخال عطا کر دیا ہے۔ جناب صغیر رحمانی کا ''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' دلچسپ افسانہ تھا۔

قیصر نجفی، یوگیندر بہل تشنہ، انور سدید، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، اطہر عزیز، مہندر پرتاپ چاند اور مظفر حنفی کی غزلیں اور نظمیں بہت تازہ وسرسبز لگیں۔

نیر اقبال علوی (لاہور)

گلزار بھائی، آداب۔

جناب سلام بن رزاق اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ نے اُن کے لیے کمال کا قرطاسِ اعزاز سجایا۔ آپ کا تجربہ اور ہنرمندی کے باعث ادیب کی شخصیت کا ہر پہلو کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ ''براہِ راست'' ایک خوبصورت سلسلہ ہے، ادیب کی شخصیت کو کھنگالنے کا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی سوالات بہت دلچسپ رہے البتہ اِس بار جوابات میں اشعار شامل نہیں حالانکہ سلام صاحب نے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ بہرحال اس انٹرویو میں سلام صاحب نے کتنی سادگی سے اپنے بچپن اور تعلیم کے متعلق جانکاری دے کر اچھا موقع فراہم کیا۔ اُن کی خودنوشتِ حیات کا باب دل کو چھو جانے والا ہے۔ اپنی والدہ اور بچپن کے حوالے سے جو باتیں اُنہوں نے درج کی ہیں پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ ''زندگی افسانہ نہیں'' بہت خوبصورت افسانہ ہے اور سبھی نامور اہلِ قلم کے مضامین سلام صاحب کی شخصیت پر خوب روشنی ڈال رہے ہیں۔

حنیف باوا صاحب کا افسانہ ''واپسی'' کمال افسانہ ہے۔ عذرا اصغر صاحبہ کی کہانی میں مجبوریوں کا بیان خوب ہے۔ ''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' بہت سادہ مگر معنیٰ خیز ہے۔ ''بلندی اور پستی'' بھی آج کے دور کی کہانی ہے۔

پروین شیر صاحبہ جنوبی افریقہ کی خوب سیر کرا رہی ہیں۔ جانکاری کے ساتھ اس بار تو منڈیلا صاحب کی شخصیت مضمون پر چھائی رہی اور مضمون کے اندر درج نظمیں بھی لاجواب ہیں۔ یہ مضمون نثر اور نظم کا بہترین سنگم ہے۔

دیپک کنول جی ذاتی طور پر دلیپ صاحب کو جانتے ہیں اور اُن کے ساتھ بارہ سال کا عرصہ گزارنے کے باعث دلیپ صاحب کی زندگی کے متعلق وہ سب کچھ جانتے ہیں جو عام آدمی نہیں جانتا۔

شاعری کا حصہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہے۔ اب تو کچھ شعراء کو پڑھنے کی اتنی عادت ہوگئی ہے اگر وہ شریکِ محفل نہ ہوں تو فکر ہونے لگتی ہے البتہ ڈاکٹر بہل تشنہ صاحب جس تسلسل اور روانی سے نظمیں کہہ رہے ہیں اُسے دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے اور دل سے بے بہا دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ اس بار پروین صاحبہ کے حوالے سے کہی گئی نظموں کے ذریعے اُن کو اس مشکل گھڑی سے نکالنے کی دعا دیتی ہے بلکہ حوصلہ بھی۔ آپ جس طرح دونوں ممالک بلکہ دنیا بھر کے اہل قلم کو جوڑے ہوئے ہیں اِسے ایک طرح سے اسٹار پریوار کی طرز پر ''چہارسو پریوار'' کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

.....ماں کملی ہوئی .....

پنجابی، اردو تے انگریزی وچ اونہاں دیاں چالی کتاباں چھپ چکیاں نیں۔ پاکستانی حکومت اونہاں نوں ''ہلال امتیاز'' تے ''ستارہ امتیاز'' نال نواز چکی اے۔ ہندوستانی پنجاب حکومت اُنہاں نوں سب توں وڈا اعزاز ''شرومنی ساہتک ایوارڈ'' دے چکی اے۔ ۲۰۰۲ء وچ دلّی اندر فخر زمان نوں اک بڑے فنکشن وچ بیسویں صدی دے بہترین پنجابی ناولسٹ دا میلینیم ایوارڈ دتا گیا۔ ہندوستانی اور پاکستانی ادبی تنظیماں نے ایوارڈ دا فیصلہ کیتا۔ فخر زمان دیا پنجابی کتاباں دے دنیا دیا وڈیاں زباناں وچ ترجمے ہو چکے نیں۔ ہندوستان وچ اونہاں دے ناول تے شاعری اُپر کئی پی ایچ ڈی تے ایم فِل تھیسز لکھے جا چکے نیں۔ اونہاں دیاں کتاباں کئی بیرونی ملکاں دیاں یونیورسٹیاں وچ پڑھائیاں جا رہیاں نیں تے ہنڑ اُنہا دا نواں پنجابی ناول ''ماں کملی ہوئی'' وی بہتا پسند کیتا جا رہیا نے۔

.....عطیہ سکندر علی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: کلاسیک، ۴۲۔ دی مال، لاہور۔

..... اجنبی گلیوں میں شام .....

اعتبار ساجد کی جنگ اپنی ذات سے نہیں اپنے زمانے سے ہے جو طرح طرح کی نفسانفسی کا شکار ہے۔ ممکن ہے ان کی شاعری کا یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں کا نہیں نوحوں اور مرثیوں کا مجموعہ معلوم ہو اور یہ نوحے اور یہ مرثیے دونوں مل کر دورِ حاضر کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر رہے ہیں جسے پڑھتے وقت آپ بھول جائیں کہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز نے کون سے ادبی انعامات جاری کیے، وہ انعامات کس طرح کے شاعروں کو ملے، ان انعامات کے دینے والوں کے پاس شاعری کی سچی پہچان تھی بھی یا نہیں۔ اب یقیناً ہم ایک ایسے دور میں آ گئے ہیں جس میں شعر کہنے والے اور لوگ ہیں مشہور ہونے والے اور انعام پانے والے اور لوگ۔ یہ تینوں خوبیاں ایک شخص میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اس المناک صورتِ حال پر تھوڑا سا رو لینا بھی بے جا نہ ہوگا!

.....پروفیسر نظیر صدیقی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔

..... آوازیں .....

میں شاہد رضوان سے کبھی نہیں ملا۔ اس کے افسانے مختلف موقر جرائد میں میرے زیرِ مطالعہ آتے رہے۔ اس کے افسانے مجھے کچھ الگ الگ سے لگے، خاص طور پر جزئیات نگاری اور موضوع کے انتخاب کے حوالے سے۔ پھر اس کا مجموعہ ''پہلا آدمی'' ملا جس کے چودہ افسانے ایک ساتھ پڑھنے کو ملے۔ مجھے لگا کہ شاہد رضوان کا پہلا کمٹمنٹ افسانہ اور فنِ افسانہ ہے۔ اب ''آوازیں'' میں شامل سولہ افسانے میرے زیرِ مطالعہ آئے تو مجھے لگا کہ میں شاہد رضوان سے ملا تو نہیں لیکن اسے جانتا ہوں اس کے افسانوں کے حوالے سے، اور اس طرح اس سے ملنا مجھے بہت اچھا لگا۔

.....اے خیام

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۶۰ روپے، دستیابی: سانجھ پبلی کیشنز، بک سٹریٹ، 46/2، مزنگ روڈ، لاہور۔

مامون ایمن کی کتب

صبا اکبر آبادی

ایک ہمہ جہت شاعر

صبا صاحب کی تمام اصناف سخن پر فنی مضامین

اگست ۲۰۰۶ء کراچی

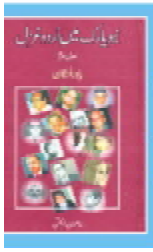

نیو یارک میں اردو غزل : حصہ سوم

تیرہ مرحوم شعراء کا تذکرہ

جنوری ۲۰۱۴ء لاہور

عرض

سفر حج پر کہی گئی رباعیات

اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

نومبر ۲۰۱۱ء گجرات

مدحتِ خیر البشرؐ

بحر مضارع میں ۶۳ نعتیں

جنوری ۲۰۱۴ء لاہور

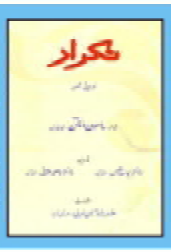

تکرار

بحر مضارع میں ۱۲۳ غزلیں

اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

دسمبر ۲۰۱۳ء لاہور

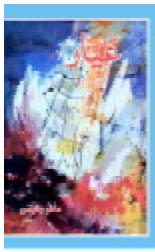

عیار

بحر ہزج مسدس سالم میں ۱۷۵ غزلیں

اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی

پہلی کتاب

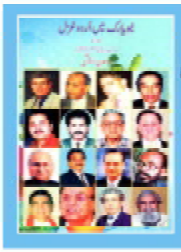

نیو یارک میں اردو غزل : حصہ اول

تیس صاحب دیوان شعراء کے اسالیب پر

فنی مضامین / تذکرہ

دسمبر ۲۰۱۳ء لاہور

دائرہ

ایک سو گیارہ غیر مقفّٰی نظمیں

جنوری ۲۰۱۴ء لاہور

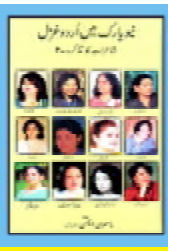

نیو یارک میں اردو غزل : حصہ دوم

بارہ شاعرات کے اسالیب پر فنی مضامین / تذکرہ

جنوری ۲۰۱۴ء لاہور

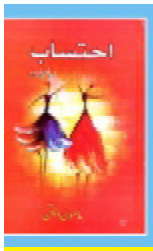

احتساب

ایک سو ایک رباعیات

جنوری ۲۰۱۴ء لاہور

20 Biscayne Dr. Huntington NY 11743 USA.....Tel : 631-549-8647

email: aimanji@hotmail.com